فکشن ہاؤس کا کتابی سلسلہ (17)

سہ ماہی

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

18- مزنگ روڈ، لاہور

مجلّہ ''تاریخ'' کی سال میں چار اشاعتیں ہوں گی

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1، اپارٹمنٹ ایف - برج کالونی، لاہور کینٹ

فون: 6665997

ای میل: .lena@brain.net.pk

خط و کتابت (برائے سرکیولیشن)

☜ فکشن ہاؤس

☜ 18-مزنگ روڈ، لاہور

فون ☜ 7249218-7237430

قیمت فی شمارہ ☜ 100 روپے

سالانہ ☜ 400 روپے

قیمت مجلد شمارہ ☜ 150 روپے

بیرون ممالک ☜ 2000 روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)

رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان

اہتمام ☜ ظہور احمد خاں

کمپوزنگ ☜ فکشن کمپوزنگ سنٹر، لاہور

پرنٹرز ☜ اے۔این۔اے پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت ☜ اپریل 2003ء

فہرست

مضامین

روبہ ترقی ریاست کا ماضی اور مستقبل	امیہ کمار باگچی/ ترجمہ: طاہر کامران	7
سندھ کی تاریخ پر جغرافیہ کے اثرات	پرویز وندل	70
امن مکالمہ اور دعوۃ:		
مولانا وحیدالدین خان کی تحریروں کا تجزیہ	یوگندر سکند/ ترجمہ: رحمان فیض	76
پاکستان میں ماڈرن مسجد کی تشکیل و تشخص	غافر شہزاد	111
مسجد میں مینار کی علامتی حیثیت	غافر شہزاد	122
سامراجی جنگیں اور امن تحریکیں	ڈاکٹر مبارک علی	129
فن حرب	سن زو/ ترجمہ: ظفر علی خاں	141

تحقیق کے نئے زاویے

بنگلہ دیشی نیشنل ازم	ڈاکٹر مبارک علی	201
ہندوستانی اسلام	ڈاکٹر مبارک علی	205
تبلیغی جماعت	ڈاکٹر مبارک علی	210
یورپ کی ترقی کیوں اور کیسے ہوئی؟	ڈاکٹر مبارک علی	217

نقطہ نظر

تاریخ کے بنیادی ماخذ

تاریخ شیر شاہی

مصنف: عباس خاں سروانی

ترجمہ: مظہر علی خاں ولا

مضامین

روبہ ترقی ریاست کا ماضی اور مستقبل

امیہ کمار باگچی/ طاہر کامران

1-روبہ ترقی ریاست کا تصور اور اس میں رونما ہونے والی تاریخی تبدیلیاں

خاندان' گاؤں' شہر' ریاست' رسوم و رواج' قوانین' قوم۔ غرض اس طرح کے کئی ادارے ایسے ہیں جو وجود میں تو بہت پہلے آ گئے تھے البتہ ان کا نام بہت بعد میں رکھا گیا۔ یہی کچھ روبہ ترقی ریاست یعنی (Developmental State) کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس ادارے یعنی روبہ ترقی ریاست کا جنم کب اور کیونکر ہوا اور کیا اس زمرے میں شمار کیے جانے والے تمام ریاستی اداروں کو روبہ ترقی ریاست کا نام دینا صحیح ہے اور کیا ایسی تحریریں موجود ہیں جن میں اس طرح کی ریاستوں سے صرف نظر کیا گیا ہو یہ سب ایسے سوالات ہیں جن پر اس مقالے میں بحث کی گئی ہے۔ اس مقالے میں یہ نقطہ نظر اپنایا گیا ہے کہ اقتصادیات کے ماہرین' سیاسیات کے علم سے بہرہ مند دانشوروں اور مورخوں کی طرف سے روبہ ترقی ریاست کے نظری و جغرافیائی خدوخال کے تعین سے کہیں پہلے یہ ادارہ ظہور میں آ چکا تھا نیز اس تحریر میں یہ بھی واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ وہ تمام ریاستیں جنہیں بلا سوچے سمجھے روبہ ترقی یعنی Developmental کا نام دے دیا جاتا ہے در حقیقت ان میں سے کئی ایک اس کلب کا رکن بننے کی قطعاً اہل نہیں۔

سب سے پہلے تو آیئے روبہ ترقی ریاست پر غور کریں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے چہار اطراف تیزی سے پھیلاؤ سے جنم لینے والی صورتحال کے تناظر میں روبہ ترقی ریاست کا کیا مطلب ہے۔ روبہ ترقی ریاست سے مراد وہ ریاست ہے جس میں اقتصادی ترقی کو سرکاری پالیسی میں اولین ترجیح قرار دیا گیا ہو۔ اور اقتصادی ترقی کی اس منزل کو پا لینے کے لیے تمام موثر حربوں کو اپنایا

جائے۔ ان حربوں (طریقہ ہائے کار) میں نئے رسمی اداروں کو وجود بخشنا، شہریوں میں باہمی اور سرکاری افسران کے ساتھ رسمی وغیر رسمی تعاون کے اسباب کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تجارت اور نفع آور پیداوار کو ممکن بنانا شامل ہیں۔ کبھی ریاست منڈی پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے یا پھر منڈی کی طرف سے پیدا کردہ نئے امکانات کو اپنے حق میں استعمال کرنے لگتی ہے۔ یہ سب مخصوص تاریخی و سیاسی احوال پر منحصر ہوتا ہے۔ کامیاب رو بہ ترقی ریاست کی ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ موقع آنے پر منڈی اور ریاست مدغم بھی ہو جاتے ہیں۔

اس طرح رو بہ ترقی ریاستوں کی اقتصادی سرگرمیوں میں کردار اور حصہ داری وقت اور حالات کے تقاضے کے پیش نظر بدلتی رہی ہے۔ کامیاب رو بہ ترقی (Developmental) ریاست نہ تو مکمل طور پر ریاستی کنٹرول اور نہ ہی مطلقاً آزاد منڈی پر انحصار کرنا پسند کرتی ہے۔ درج ذیل میں ہم رو بہ ترقی ریاست کی طرف سے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر اپنائے گئے طریقہ ہائے کار کا تجزیاتی مطالعہ کریں گے کہ یہ طریقہ ہائے کار جو کہ ہر ریاست کے دوسری ریاست سے مختلف ہو سکتے ہیں مزید برآں بدلتے وقت اور حالات کی وجہ سے بھی اقتصادی ترقی کے حصول کے لیے مختلف حکمت عملی اپنائی جا سکتی ہے۔

2۔ نیدرلینڈز سولہویں اور سترہویں صدی کی رو بہ ترقی (Developmental) ریاست:

ہماری دانست میں سولہویں صدی کے بعد پہلی رو بہ ترقی ریاست ہسپانوی نیدرلینڈ کے شمالی حصے میں ظہور پذیر ہوئی۔ بعدازاں نیدرلینڈز ہی کے جنوبی حصے کو ہسپانیہ نے دوبارہ سے فتح کر لیا اسی طرح عصر حاضر کا نیدرلینڈز وجود میں آیا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ نیدرلینڈز کی آزاد ریاست کا آغاز 1568ء میں ہوا جب ایگمونٹ (Egmont) اور ہوورن (Hoorn) کے پروٹسٹنٹ ڈیوکس (Dukes) کو ہسپانوی اصحاب اقتدار نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ 1572ء میں کیلونسٹ 'Sea Beggars' یعنی سمندری گداگروں نے دریائے رائن (Rhine) کے دہانے پر واقع ڈین برائل (Den Briel) کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ 1579ء میں سات شمالی صوبہ جات نے صوبہ جات متحدہ (United Provinces) کے نام سے اتحاد قائم کر لیا اور

سٹیٹس جنرل کو بھی ایک منتخب ادارے کے طور پر وجود دے دیا جو کہ فیڈریشن کے لیے قانون سازی اور انتظامی دونوں طرح کے فرائض سرانجام دینے لگا۔ 1581ء میں ولیم اول (جو کہ اورنج Orange شاہی گھرانے سے تھا) نے ان سات صوبوں کی طرف سے ہسپانیہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ان صوبہ جات نے ایک وفاق کے طور پر ایک نئے عہد میں قدم رکھا۔

(Boxer 1973:332-3; Israel 1995;chapters 9-11)

آئندہ پچاس برسوں میں نیدرلینڈز جس کی آبادی 1600ء تک 1.5 ملین تک جا پہنچی تھی یورپ اور دنیا کی سب سے بڑی بحری قوت بن کر ابھرا جس کی ایمپائر انڈونیشیا (مختصر دورانیے کے لیے فارموسا یعنی آج کا تائیوان بھی اس کے تسلط میں رہا) سے ویسٹ انڈیز کے جزائر تک پھیل چکی تھی۔ ان کامیابیوں کے پیچھے بہت سے عناصر کارفرما تھے یعنی نیدرلینڈز کا جغرافیہ سماجی ڈھانچہ قوم پرستی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی سیاسی وفوجی حکمت عملی کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لینے کی صلاحیت۔(Israel 1995:chapters 11-24)

فیوڈلزم ہالینڈ اور نیدرلینڈز کے دیگر میری ٹائمز صوبہ جات میں وجود نہ رکھتا تھا خاص طور پر تیرہویں صدی کے بعد سے اس طرز معاشرت کا مذکورہ خطے میں نام ونشان ہی نہ تھا اس مخصوص صورتحال کو ممکن بنانے میں کسی حد تک نیدرلینڈز کے جغرافیے نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ (Israel 1995:chapter 2-6) زمین کو محفوظ رکھنے کے لیے پشتے (Dikes) تعمیر کرنے بہت ضروری تھے علاوہ ازیں پانی میں گھری زمین کو واگزار کرانے کے لیے پانی کی نکاسی کا بندوبست کرنا بھی لازمی تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس امر کو یقینی بنانا کہ کہیں سیلاب کا پانی صدیوں کی انسانی کاوش کو غارت نہ کر دے لہٰذا سمندری پانی کے لیے تعمیر کیے گئے پشتوں کی لحہ بہ لحہ نگرانی اور بروقت مرمت کے لیے ایک باقاعدہ نظام کار کو وضع کرنا بھی نیدرلینڈز کے باسیوں کے لیے وقت کی اہم ضرورت تھی۔ چنانچہ اس سیلابی معاشرے (Flood Society) نے ایسی رسمی ضروریات اور تاریخی جواز کو پنپنے نہ دیا جو کہ پسماندہ یورپ کے دیہی علاقوں کا خاصہ بن چکے تھے اور وہاں پر فیوڈلزم کی نمو کا باعث بن گئے اگر بلند مرتبے کے لوگوں کو عوام کی طرف سے عزت و توقیر اس وجہ سے دی جاتی ہے کہ جو باؤ دہ موخرالذکر کی حفاظت کا اہتمام کرتے ہیں تو نیدرلینڈز میں یہ کام جاگیرداروں کی بجائے پشتوں کی دیکھ بھال پر مامور اہلکار کرتے تھے جنہیں منتخب کیا جاتا تھا

انہیں Heemraadschappen کہا جاتا تھا۔ ٹیکسوں کی وصولی کے حوالے سے مقامی قومیتیں خودمختار تھیں یہ ٹیکس ان کی آب رسانی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لاگو کیے جاتے تھے۔ وہاں پر سیاسی اقتدار اہرام مصر کی طرح نیچے سے اوپر کی جانب منتقل ہوتا جاتا تھا بجائے اوپر سے نیچے کی جانب منتقل ہونے سے (Schama 1987:40) تجارت اور کامرس سے غیر معمولی شغف جسے ان گنت دریاؤں ندیوں اور نالوں نے نہ صرف ممکن بلکہ آسان تر بنا دیا تھا اس کے ساتھ ساتھ نامہربان فطرت کو اپنی دسترس میں لانے کے لیے نئی اختراعات عمل میں لانے کی جدوجہد کا آغاز جس کے نتیجے میں زیریں یورپ نے بقیہ مغربی یورپ کے مقابلے میں زراعت اور جانوروں کی افزائش نسل کے حوالے سے حیران کن ترقی کی اور یہاں دوسرے علاقوں سے کہیں زیادہ پیداوار ہونے لگی اس زرعی پیداوار سے یورپ میں اقتصادی خوشحالی اور استحکام کے دور کا آغاز ہوا مزید برآں زیریں یورپ میں ہونے والی اس زرعی ترقی ہی نے وہاں شہری معاشرے کے لیے بنیاد فراہم کی جس میں سترہویں صدی کے وسط تک بیشتر لوگ تجارت' صنعت اور دیگر غیر زراعتی اقتصادی سرگرمیوں سے وابستہ ہوئے۔ (De Vries 1976:69-75; Devries and Vander Woude 1997;chapter 11)

ہیبسبرگ (Habsburg) حکومت کے خلاف نیدرلینڈز کی بغاوت کو اس وقت تحریک ملی جب فلپ دوم نے ایسے ملک پر رومن کیتھولک ازم کو نافذ کرنے کی کوشش کی جہاں کی قطعی اکثریت نے اسے رد کر دیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے پشتوں (Dikes) کے نگرانوں کا تقرر بھی مرکز سے کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کے مقرر کردہ یہ نگران اپنے کام کا تجربہ بھی نہ رکھتے تھے۔ بغاوت کی ایک اور وجہ دیہات اور قصبات پر پشتوں کی حفاظت اور آب رسانی کی سہولت کو برقرار رکھنے کے لیے عائد کردہ ٹیکسوں کو بھی مرکزی حکومت کے تابع کر دینا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اہم شہروں کے چندسری حکومتی عناصر (Burgher Oligarch) نے اپنے ہسپانوی آقاؤں کے خلاف کھلے عام کشمکش کے بعد ان پر غلبہ پالیا۔ بسا اوقات مرکز سے قریب واقع صوبوں پر سیاسی کنٹرول رکھنے والے زمینداروں کے خلاف جدوجہد میں بھی ان شہری شہزادوں کو کامیابی حاصل ہو[illegible] چنانچہ ان کامیاب بغاوتوں کے باعث تاجروں اور صناعوں کے تحت قائم ہو جانے والی ریاسہ[illegible] اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔ برغر (Burgher) طرز حکومت ڈچ لوگوں کے۔ [illegible] فتح کا بہت

ذریعہ بنی جوانھوں نے فیوڈل لارڈز کے تحت رہنے والے اپنے دشمنوں کے خلاف حاصل کی تھی۔
(Boxq 1973:chapter'1'Schama 1987:chapters;1-4Israel 1995; chapters 17-22)

دوسری چیز جس نے نیدرلینڈز کو ایک غیر معمولی روبہ ترقی ریاست بنادیا وہ ڈچ لوگوں میں شدید حب الوطنی کا جذبہ تھا جو کہ اس وقت اور زیادہ مضبوط ہو گیا جب انہیں یورپ کی سب سے طاقتور ریاست کے خلاف جدوجہد کے لیے صف آرا ہونا پڑا۔ ڈچ قوم نے اپنی حالیہ تاریخ کا بڑا حصہ مسترد کر دیا ہے سوائے اس مخصوص حصے کے جو اس کے انقلابی سورماؤں کی بہادری اور شہادت کے بیان سے عبارت ہے۔ ڈچ قوم کے افراد اپنی تاریخ کی شروعات رومن ایمپائر کے ایام سے کرتے ہیں اور بعد میں تاریخ یہود کا ذکر بطور خاص اس لیے کرتے ہیں تاکہ اپنے لیے حب الوطنی پر مبنی ادب (Lore) کو تخلیق کر سکیں۔ وہ اپنے آپ کو بٹاوین ریپبلک (Batavian Republic) کا وارث تصور کرتے ہیں جس نے پوری جرات کے ساتھ رومن راج کی مزاحمت کی علاوہ ازیں اپنی دانست میں وہ خدا کے چنیدہ و برگزیدہ بندے (Chosen People) ہیں جنہیں خدا پانی اور آگ کے ذریعے آزمائے گا۔
(Boxer 1973:chapter 1;Mulier 1987; chapter 1;Schama 1987; chapters 1 and 2)

جہاں تک ان کے جذبہ قوم پرستی کا تعلق ہے تو وہ حقیقت پسندی پر مبنی تھا گو کہ وہ ہسپانوی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتے اور جب بھی موقع ملتا پوپائی کافروں کو بھی نیست و نابود کرنے پر کمر بستہ رہتے اس کے باوجود جب یہاں کے چندسری حکمران جنگ وجدل کی بجائے امن میں فائدہ دیکھتے تو پہلے سے ان کے قبضے میں آئے ہوئے وسائل پر ہی اکتفا کر لیتے اور ان پر اپنے کنٹرول کو مستحکم کرنے پر توجہ دینے لگے تھے بجائے اس کے کہ شان وشوکت کا پیچھا کرنے لگیں اور جو کچھ ہاتھ لگا ہو وہ بھی گنوا بیٹھیں۔ ڈچ لوگ اپنے حکمرانوں سے بے مثال جدوجہد کی تقوی رکھتے تھے اور اگر قومی مفاد کا تقاضا ہوتا تو انہیں (رہنماؤں) قربانی کی بھینٹ بھی چڑھا دیتے تھے۔ اسی لیے جوہان وان اولڈن بارن ولٹ (Johan Van Oldenbarn Veldt) نے جو کہ ڈچ ری پبلک کا چیف منسٹر تھا ذاتی طور پر زمین کی واگذاری (Reclamation) کا ایک بہت بڑا

منصوبہ بنایا اور اس پر کام کا بھی آغاز کروایا اور اس کے ساتھ ساتھ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ترقی و ترویج میں بھی بہت اہم کردار ادا کیا جس کی بدولت انڈونیشیا کے ساتھ تجارت پر ولندیزیوں کا کنٹرول قائم ہو سکا اور پرتگیزیوں کی گرم مصالحہ کی تجارت پر قائم اجارہ داری بھی ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی کوششوں سے اختتام کو پہنچی۔(Boxer 1973;25-26; Schama 1987: 38-9)

ہسپانیہ کے ساتھ 1609ء سے 1621ء تک کے بارہ سالہ زمانہ امن کے دوران بھی جوہان وان اولڈن بارن ولٹ(Johan Van Oldebarn Veldt) ہی نے ڈچ ری پبلک کی تقدیر اور مستقبل کی سمت کو متعین کیا۔1619ء میں جب جنگ کی حامی جماعت نے موریس آف نساؤ کی قیادت میں غیر معمولی اثر ورسوخ حاصل کر لیا تو جوہان وان کو من گھڑت الزمات لگا کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بالعموم ملکی حکمرانوں میں دو عہدیدار سب سے زیادہ اہم ہوتے تھے ان میں سے ایک سٹاڈ ہولڈر(Stadholder) جو کہ ہمیشہ اورنج گھرانے کا فرد ہوتا تھا۔دوسرا ایسا ہی اہم عہدیدار ہالینڈ کا گرینڈ پنشنری تھا۔باوجود اس کے کہ سٹاڈ ہولڈر(Stadholder) کی اہمیت مسلمہ تھی نیدرلینڈز 1650ء سے 1672ء تک کسی بھی سٹاڈ ہولڈر سے محروم رہا۔اس ضمن میں یہ بتانا ضروری ہے کہ سٹاڈ ہولڈر ولندیزی افواج کا کمانڈر انچیف اس کے علاوہ وہاں کا آئینی بادشاہ بھی ہوتا تھا۔مذکورہ بالا بائیس برسوں کے دوران جوان ڈی وٹ(Johan De Witt) جو کہ ایک پرجوش ری پبلکن تھا نیدرلینڈز کا کرتا دھرتا بنا رہا(Mulier 1987)۔1672ء میں نیدرلینڈز نے اپنے دو طاقتورترین حریفوں یعنی انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔اسی دوران ایمسٹرڈیم کے عوامی ریلے (Mob) نے ڈی وٹ برادران (De Witt Brothers) کو تہ تیغ کر دیا اور ولیم ثالث(William III) جو کہ سٹاڈ ہولڈر کے مرتبے پر فائز ہو چکا تھا اسی نے ولندیزی دفاع کا چارج بھی سنبھال لیا۔

نہ صرف عملیت پرست ولندیزی قومی ضرورت و مفاد کو ہمیشہ اپنی ترجیحات میں سرفہرست رکھتے بلکہ وقت کی ضرورت کے پیش نظر وہ قوم و ملک کے وسیع تر مفاد کے لیے اپنے حکمرانوں کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ جہاں تک حکمرانوں کا تعلق تھا وہ بھی قومی خدمات کی بجا آوری میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھتے تھے۔جب کبھی دفاع وطن کے لیے افراد کی ضرورت ہوتی یا پھر زراعت اور تجارت کے ڈھانچے کو برقرار رکھنے کے لیے خدمات درپیش ہوتیں یا غریب غربا کی

اعانت کا سوال اٹھتا (جن کی کفالت سے چرچ مبرا ہو چکا تھا) تو ولندیزی عوام پوری تندہی کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھاتے۔ یہ اچنبھے کی بات ہے کہ ڈچ وہاں کے برغروں Burghers سے اس سے کہیں زیادہ ٹیکس وصول کرنے میں کامیاب ہوئے جس قدر کہ ہسپانوی حکمران کیا کرتے تھے۔

ولندیزی روبہ ترقی ریاست کی تیسری اہم خصوصیت مذہبی رواداری تھی جب پروٹسٹنٹ ازم بلکہ یوں کہیے کہ اس کی ایک اور قسم یعنی کیلون ازم کو نیدرلینڈز کی ریاستوں میں مملکتی مذہب کے طور پر لاگو کر دیا گیا تو وہاں کے ریجنٹوں (Regents) نے کیلون ازم کے پرجوش داعیوں کو مذہبی مخالفین کے خلاف شدت سے بھرپور قوانین بنانے اور انہیں بعدازاں نافذ کرنے سے باز رکھا۔ (Boxer 1973:chapter 5; Schama 1987;chapters 1-2) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوبی نیدرلینڈز سے مصیبت کے مارے پروٹسٹنٹ اور فرانس سے ہیوگ ناٹس (Huguenots) بھی پناہ لینے کے لیے شمالی نیدرلینڈز آ کر بسنے لگے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہودی اور مذہب کے سرے سے منحرف (Heretics) بھی ہسپانوی جوروستم کے خوف سے اسی سرزمین کا رخ کرنے لگے۔ مہاجروں کی اتنی بڑی تعداد کے نیدرلینڈز ری پبلک میں آ کر سکونت پذیر ہو جانے سے ری پبلک کو ہنرمندوں اور کاریگروں کی بڑے پیمانے پر خدمات میسر آئیں اور وہاں کی پیداواری صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ گو کہ جنوبی نیدرلینڈز اور خاص طور پر اینٹوارپ (Antwerp) تجارت اور کامرس میں بہت ترقی یافتہ تھا لیکن جب وہاں پر بغاوت ہوئی اور ہسپانوی فوج نے وہاں پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو یہ سب ترقی قصہ پارینہ ہو کر رہ گئی اینٹوارپ (Antwerp) کو 1576ء میں باغی فوجیوں نے جی بھر کے لوٹا۔ فلپ دوم ایک مرتبہ پھر سے دیوالیہ ہو گیا۔ رہی سہی کسر پروٹسٹنٹ برغرز (Burghers) کے وہاں سے انخلاء نے پوری کر دی اور اس طرح فلپ کے زوال کی تکمیل ہو گئی جنوبی نیدرلینڈز کے اس حشر کا فائدہ شمالی نیدرلینڈز کو پہنچا جس کی بڑی وجہ یہی تھی! مہاجروں کی وہاں آمد۔

ڈچ ری پبلک کی ترقی میں چوتھا عنصر جس نے بڑا کردار ادا کیا ایسے اداروں اور سکونت گاہوں کے قیام کے لیے دانستہ کوشش تھی جو صاف ستھرے ماحول اور رہن سہن کو یقینی بنانے میں ممدومعاون ثابت ہوئے۔ ولندیزی شہروں میں صفائی اور وہاں کے کریڈٹ اور ٹیکسیشن سے

متعلقہ اداروں میں موجود نظم وضبط ہمعصر معاشروں کے لیے باعث رشک حقیقت بن گئی تھی۔ 1640 اور 1655 ء کے درمیانی عرصے میں ڈچ ری پبلک نے جو قرضے لیے ان پر سود کی شرح 6.25 فیصد سے کم ہو کر 4 فیصد ہو گئی۔ 1672 ء میں جب فرانسیسیوں نے ولندیزی سرزمین کو روند ڈالا تو بھی ری پبلک نے امدادی فوج کی تشکیل (بھرتی) کے لیے بغیر کسی مشکل کے قرضہ حاصل کر لیا (Lark 1947:44-5) بنک آف ایمسٹرڈیم جو کہ 1609 ء میں قائم ہوا بعد از اں مغربی یورپ میں دوسرے ریاستی یا ریاستی سرپرستی میں قائم ہونے والے بینکوں کے لیے نمونہ ثابت ہوا اور سستی شرح سود کے لیے پبلک اور پرائیویٹ کریڈٹ کے نظام کا سربراہ بھی! سود کی اس قدر کم شرح سرمایہ میں اضافہ کا باعث بنی۔

اپنے ڈیزائنوں اور مختلف پراجیکٹس میں تو لندیزیوں نے اطالوی شہری ریاستوں یا ہسپانیہ اور پرتگال کی نقل کی البتہ غیر ملکی ڈیزائنوں کو اپنے ہاں متعارف کرواتے ہوئے انہوں نے نئی اختراعات کے ذریعے انہیں (غیر ملکی نمونہ جات اور ڈیزائنوں) اپنی ضروریات کے پیش نظر تبدیل کیا۔ اسی طرز پر ولندیزیوں نے اپنے بحری جہازوں میں بھی تبدیلی کی اور انہیں اس قابل بنایا کہ وہ شمالی سمندروں کے اردگرد واقع جزیروں تک پہنچنے کے قابل ہوئے گو کہ یہ بحری راستہ بہت مشکل تھا اور یہاں عام بحری جہازوں کا پہنچنا محال تھا۔ اب ان جہازوں کے ذریعے اسلحہ کی ترسیل بھی ممکن ہو گئی اور یہ جہاز کھلے سمندروں میں بحری جنگ کے لیے بہت موثر ثابت ہوئے۔ حتیٰ کہ زمین پر مسلح جنگ کے حوالے سے بھی مارس آف نساؤ (Maurice of Nassau) اور اس کے بھائی ولیم لوئی نے بہت سی نئی اختراعات کیں جیسے کہ زمانہ امن میں بھی مسلسل ڈرل اور بندوق چلانے کی مشقیں وغیرہ (McNeill 1983:128-36;Parher 1978:18-19) مارس پہلا شخص تھا جس نے ٹیلی اسکوپ جیسے جدید آلات کو جنگ میں استعمال کرنا شروع کیا (Clark 1947:112-3)

ان تمام اختراعات سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ نیدرلینڈز ری پبلک کا اس زمانے کا طبقہ امراء لکھا پڑھا بلکہ تعلیم سے معقول حد تک بہرہ ور تھا۔ ولندیزی طبقہ امراء نے تعلیم اور مفید فنون کے فروغ کی حوصلہ افزائی کی اس ضمن میں نیدرلینڈز میں اکیڈیمیاں اور انسٹیٹیوٹ کھولے گئے نئی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جیسے ہسپانوی قبضے کے خاتمے کے بعد لیڈن (Leyden) میں

1575ء میں یونیورسٹی قائم کی گئی۔ ہارڈروجک (Harderwigk) 1600ء میں گرونجن (Groningen) 1614ء میں جبکہ اتریخت (Utrecht) 1634ء میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ یہ یونیورسٹیاں 17ویں صدی کے یورپ میں سب سے زیادہ روادار اور لبرل تعلیم گاہیں تھیں۔ (Clark 1947:291-2; Israel 1995;chapter24) اس کے ساتھ ساتھ ولندیزیوں نے دوسری اقوام میں رائج علوم وفنون سے اکتساب کرنے میں قطعاً تامل نہ کیا۔

بلاشبہ ڈچ ری پبلک کوئی نقائص سے بلند اور مکمل ترین کامن ویلتھ ہرگز نہ تھی۔ بلکہ وہ تو عدم مساوات پر مبنی ایک معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتی تھی جہاں غریب اور امیر کی آمدنی اور سیاسی قوت اور اثر ورسوخ کا بہت واضح فرق تھا۔ یہاں صرف امیر تاجروں اور زمینداروں کی سیاسی و انتظامی عہدوں پر اجارہ داری تھی جبکہ غربا کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں رکھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سخت سے سخت حکومت کے تحت بھی غریب طبقوں کا مناسب خیال رکھا جاتا تھا Rasp houses کہ جہاں برازیل وڈ سے رنگائی کے لیے رنگ بنایا جاتا تھا اور ہالینڈ میں سپننگ ہاؤسز سیاحوں کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ جنہیں بعد میں مغربی یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی اپنایا گیا۔ (Lis and Soly 1982;118-19; Schama 1987:chapter 1) ترقی کے زینے طے کرتی ڈچ ریاست نے ہمیشہ اپنے حقیقی شہریوں اور قانونی طور پر آ کر بسے ہوئے مہاجروں کو سو فیصد روزگار فراہم کیا جو کہ ایک کارنامے سے کم نہیں۔

بعد میں ہم نیدرلینڈز کی روبہ ترقی ریاست پر آنے والے زوال کی وجوہات کا جائزہ لیں گے اور ساتھ ہی اس زوال سے برآمد ہونے والے نتائج کا بھی۔ ہم اس ریاست کی ترقی اور تنزلی کے علاوہ نیدرلینڈز کی مدمقابل دیگر ریاستوں کے پروان چڑھنے کا بھی تجزیہ کریں گے کہ وہ کونسے عناصر تھے جنہیں اپنا کر ان ریاستوں نے ترقی کی منازل طے کیں جبکہ نیدرلینڈز کی ترقی کا سورج غروب ہوتا گیا۔

3-انگلینڈ (یا برطانیہ) روبہ ترقی ریاست کے طور پر 1560 تا 1851ء

انگلینڈ میں صنعت کاری کے عروج وترقی اور پہلی صنعتی قوم کے طور پر اس کے ظہور سے متعلق اکثر تحریروں میں صرف نجی ملکیت اور آزادانہ تجارت پر زور دیا جاتا رہا۔ لیکن اس ضمن میں

یہ بیان کرنا بھی ازحد ضروری ہے کہ نجی ملکیت کے قیام کو ممکن بنانے کے لیے ایسی ریاست کی تشکیل بہت لازم تھی جو اقتصادی نشو ونما اور ترقی کے امکانات کو روشن کر سکے اور آزادانہ تجارت انگلستان میں بطور پالیسی تبھی رواج پا سکی جب وہ اقتصادی' سیاسی اور فوجی لحاظ سے دنیا کی مضبوط ترین قوم کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ روبہ ترقی ریاست کی حیثیت سے عہد بلوغت کو پہنچ جانے پر ہی انگلستانی طبقہ امراء کے لیے آزادانہ تجارت کو نقطہ عروج تک پہنچانا ممکن ہو سکا۔ اول الذکر کی کامیابی ہی کے سبب موخر الذکر ممکن ہو سکتا ہے وگرنہ آزادانہ تجارت کا موثر ہونا بہت ہی مشکل امر ہو جاتا ہے۔

انگلستان جو کہ بعد میں یونائیٹڈ کنگ ڈم کے طور پر معروف ہوا اس کی بحیثیت روبہ ترقی ریاست (Developmental State) پہچان قدرے تاخیر سے ہوئی جس کی متعدد وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ انگلستان کا پختگی کے مرحلے تک پہنچنے کا عمل بہت ہی سست رو تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ خود آزادانہ تجارت کو اپنا لینے سے بہت پہلے انگلستان نے دوسری اقوام کو اس کی تبلیغ کا آغاز کر دیا حتیٰ کہ بعض اوقات تو گن بوٹس اور فوجیوں کے ذریعے سے بھی آزادانہ تجارت دوسرے ممالک پر مسلط کیا گیا جیسے کہ پہلی افیون کی جنگ (چین میں) یا سپین اور پرتگال کے خلاف لاطینی امریکہ میں برپا ہونے والی آزادی کی جدوجہد میں انگلستان کا دخل اندازی کرنا۔ تیسری وجہ یہ کہ اٹھارویں صدی کے آغاز کا انگلستان ایک ایسی ریاست تھا جہاں قومی پالیسی بنانے کا عمل پارلیمنٹ میں ہی مرتکز تھا لیکن یہاں کا انتظامی ڈھانچہ قطعی طور پر مرکز گریز تھا اور اسے کاؤنٹیوں' صوبائی شہروں قصبوں میں آباد پراپرٹی اونرز چلاتے تھے۔ پھر بھی انگلستان کی ایک روبہ ترقی ریاست کی حیثیت سے پہچان میں یہ ناکامی رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی (Corrigan and Sayer 1985; Brewer 1989)

برطانیہ میں اس ترقی کے آثار اگر اس سے بھی پہلے نہیں تو کم سے کم سولھویں صدی میں تو ضرور ہی نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دراصل چودھویں صدی میں کسانوں کی بغاوتوں نے سرف ڈم (مزارعیت کی بدترین قسم جو کہ یورپ میں قرون وسطی کے دوران رائج تھی) کا بہت حد تک خاتمہ کر دیا بلکہ کسانوں کو جاگیرداروں کی غلامی سے بھی نجات دلائی جو کہ ٹیوڈر بادشاہوں (Tudor King) کے زمانے سے ان کا مقدر بنی ہوئی تھی۔ انگلستان میں ریفارمیشن (اصلاح

مذہب کی تحریک) کا ظہور تو ریاستی سرپرستی ہی میں عمل میں آیا۔ جس کی وجہ سے یہاں دوررس اثرات مرتب ہوئے جن میں سے ایک تو رومن کیتھولک چرچ کی غیر معمولی اہمیت میں واضح کمی تھی۔ رومن کیتھولک چرچ کہ جس کے ساتھ زرعی اراضی کے وسیع قطعات اور دوسری جائیداد منسلک تھی اسے دولت و اثر ورسوخ عطا کرنے والے بیشتر وسائل سے محروم ہونا پڑا اور اس مقتدر حیثیت سے بھی جو کہ اسے بادشاہ سے علیحدہ اور آزادانہ رتبے پر فائز کرتی تھی چرچ کو دست بردار ہونا پڑا۔ اس طرح انگلستان میں زمینداروں کے ایک اور طبقے نے جنم لیا جو کہ چرچ سے واپس لی ہوئی اراضی کے بل بوتے پر صاحب ثروت بن گئے تھے۔ انگلستان میں فیوڈل ازم کی رہی سہی باقیات کا بھی مکمل قلع قمع اس خانہ جنگی کے دوران ہو گیا تھا جو بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان کشمکش سے ظہور میں آئی تھی اور بعدازاں اولیور کروم ویل کی سربراہی میں مختصر مدت کے لیے قائم ہونے والی ری پبلک نے تو خصوصی طور پر فیوڈل ازم کو نیست و نابود کر دیا۔
(Hill 1961:chapter 3 and 9,Corrigan and Sayer 1985;chapter3 & 4)
انگلستان مغربی یورپ کا پہلا بڑا ملک تھا (سوائے نیدرلینڈز کے) کہ جس نے فیوڈل ازم اور اس کے دیگر متعلقات کا مکمل خاتمہ کر دیا تھا۔ وہاں پر زمین کو قابل انتقال، قابل فروخت اور موروثی شے بنا دیا گیا تھا البتہ چند مستثنیات باقی رہیں کیونکہ کچھ بڑی جائیدادوں کو تحفظ فراہم کیا گیا تھا۔ مغربی یورپ کے دوسرے ممالک میں اس طرح کے اقدامات کے موثر ہونے میں مزید ڈیڑھ سو سال کا عرصہ لگا (یعنی 1780ء کی دہائی سے نپولین کی جنگوں کے خاتمے تک کے عرصے میں باقی ماندہ مغربی یورپ میں فیوڈل ازم ختم ہونا شروع ہوا) اور فیوڈل ازم سے زرعی اراضی اور کسانوں کو آزادی حاصل ہوئی جبکہ وسطی اور مشرقی یورپ کے بڑے حصے میں فیوڈل نظام 1848ء کے انقلاب کے بعد ختم ہوا اور روس، ہنگری اور رومانیہ میں اس نظام قبیح اور سرف ڈم کا 1860ء کی دہائی میں خاتمہ ہوا۔(Blum 1978;chapter 16-19)

فیوڈل قبضے کے اختتام اور منڈی سے غیر منسلک دیگر بندشوں (Non market bondage) سے محنت کشوں کی باقاعدہ آزادی، عہد وسطی میں تجارت پر عائد پابندیوں میں نرمی کا پیدا ہو جانا اور سیاسی قوت کا ایسے افراد کے پاس آ جانا جن کے مرتبے اور پوزیشن کی وجہ اجداد یا اعلیٰ گھرانے میں پیدائش کی بجائے ملکیت جائیداد تھی یہ سب ایسے عناصر تھے جن کے باعث انگلستان کو سرمایہ

داری نظام کے ابتدائی ایام کے دوران دوسری یورپی مدمقابل اقوام پر برتری حال ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ یورپ میں سیاسی، اقتصادی اور فوجی غلبے کی ڈور میں انگلستان نے پہلے تو نیدرلینڈز کو اور بعد میں فرانس کو پچھاڑ دیا۔ 19 ویں صدی کے وسط تک انگلستان نے دنیا کے ہر کونے میں غلبہ حاصل کرلیا۔ اسی دوران نوآبادیوں پر غاصبانہ قبضے اور بحراوقیانوس کے ذریعے غلاموں کی تجارت کے باعث انگلستان اس قدر سرمایہ اکٹھا کر لینے کے قابل ہوگیا تھا کہ اسے غالب پوزیشن تک پہنچ پانے میں آسانی میسر ہوئی۔ دوسرے خطوں پر فوجی اور اقتصادی قبضے کی صلاحیت کے پس منظر میں بنیادی طور پر وہ گھریلو تبدیلیاں کارفرما تھیں جن کی وجہ سے انگلستان ایک مضبوط ڈویلمپنٹل ریاست بن گیا تھا۔

روبہ ترقی ریاست کا دوسرا پہلو برطانوی ریاست اور معاشرے کی دوسروں سے سیکھنے کی صلاحیت تھی اور یہ اہلیت بھی کہ انگلستان کے باسی دوسروں سے سیکھی ہوئی اختراعات کو اپنے ماحول اور سماجی ضروریات کے مطابق ڈھال لیتے تھے۔ انگریزوں نے جن یورپی ممالک سے سب سے زیادہ سیکھا وہ اطالیہ کی شہری ریاستیں تھیں۔ ریاستی امور کے ایسے نظریات جو مذہبی اور فیوڈل اقدار کے علاوہ تھے وہ سب میکاولی اور دوسرے اطالوی مصنفین اور مفکرین ہی سے مستعار لیے گئے۔ سترہویں صدی میں تھامس ہابس، جان لاک اور دوسرے کئی نظریہ سازوں نے انگلستان میں جنم لیا اور انہوں نے آئینی بادشاہتوں اور ری پبلک ریاستوں کے فریم ورک میں حاکمیت (Sovrighty) اور شہری حقوق سے متعلق اصولوں کو تشکیل دیا۔

ٹیکنالوجی کے میدان میں انگریزون نے اطالویوں، ہیوگ نالٹس (Huguenots) پناہ گزینوں جو کہ فرانس سے آکر انگلستان میں بس گئے تھے، ولندیزیوں (خصوصاً زراعت، آبپاشی، نکاسی آب اور زمین کی وہگذاری کے شعبہ جات میں) اور بعدازاں چینیوں اور ہندوستانیوں سے بہت کچھ سیکھا ایلزبتھ اول کے دور حکومت میں انگریزوں نے وینس والوں کی نقالی کرتے ہوئے غیرممالک میں بننے والی اشیاء اور مصنوعات کو اپنے ملک میں بنانے کا اہتمام کیا جس سے گھریلو اختراعات و مصنوعات کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ غیرملکی مصنوعات کی مینوفیکچرنگ کیے لیے اجازت نامے دوسرے ممالک سے آئے ہوئے ایسے آبادکاروں کو دیئے گئے جو کمیاب علم و ہنر سے آراستہ تھے اور اس کے ساتھ ہی بہت بڑی تعداد میں انگریزوں کو بھی یہ اجازت نامے مرحمت ہوئے

(Corrigan and Sayer 1985:66 Macleod 1988:chapter 1)غیر ملکی اختراعات کہ جن کی انگلستان میں مینوفیکچرنگ پر انگریزوں کا اختیار تسلیم کرلیا گیا تھا اس اندیشے کے تحت کہ من مانی کرنے والے حکمران ان اختراعات کا غلط استعمال کریں یا پھر غیر معیاری غیر ملکی اشیاء انگلستان کے مختلف حصوں میں متعارف کروانے لگیں پارلیمنٹ نے یہ قانون بنادیا جس کے تحت صرف اصلی اور معیاری غیر ملکی اشیاء کی پیدائش و مینوفیکچرنگ کو یقینی بنایا گیا اور باقاعدہ ان اشیاء کی چھان بین کی جانے لگی اور جن اشیا میں عوامی دلچسپی نمایاں ہو وہی انگلستان میں بنائی جائیں۔ غیر ملکی اشیا کے انگلستان میں بڑے پیمانے پر بنائے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹھارویں صدی تک انگلستان پوری دنیا میں ٹیکنالوجی کے ذریعے ہونے والی اختراعات وایجادات کی دوڑ میں باقی سب ممالک کو پیچھے چھوڑ گیا۔

برطانیہ کی اقتصادی ترقی میں ریاست کے کردار کو بہت سے تجزیہ نگاروں نے زیادہ اہمیت نہیں دی چنانچہ عام تاثر یہی ابھر کر سامنے آتا ہے جیسے نارمل حالات میں یہ تمام تر ترقی مرکز گریز حکمت عملی Measures of decentralization زمینداروں کی جائیداد پر ٹیکس لگا کر اور برطانیہ کے دفاع اور مقبوضات کے حصول میں اس کی بحریہ نہ کہ ایک بڑی قومی فوج نے بھرپور کردار ادا کیا۔(Corrigan and Sayer 1985:chapter 5)

یہ تمام تجزیے اپنی جگہ لیکن برطانوی ریاست غیر معمولی طور پر مضبوط تھی اور انگلستان میں پروان چڑھتے ہوئے نجی شعبے کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے میں ریاستی مشینری نے اہم کردار ادا کیا طلب و رسد کی ہر دو جہتوں میں ریاست نے اپنا اثر بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ رسد (Supply) کے حوالے سے ریاست نے نجی شعبے کی ترقی کے لیے اثاثہ جات کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی اور نقل و حرکت کی راہ میں تمام تر رکاوٹیں ہٹادیں اور لیبر مارکیٹ کو قواعد کی زد میں لانے اور لیبر میں نظم پیدا کرنے کے لیے سلسلے وار قوانین بنائے جس کی پہلی مثال 1563ء کا Statue of Artificers تھا نیز ایسے قوانین کو متعارف کروایا جو مالک اور نوکر کے تعلق کی حدود کا بخوبی تعین کرتے تھے۔ علاوہ ازیں محنت کشوں کے اتحاد کا امتناع کالے قوانین (1723 کے بلیک ایکٹ سمیت) کی منسوخی اور چھوٹی موٹی چوری چکاری کا سنگین جرم قرار دیا جانا اس کے علاوہ پبلک اور پرائیویٹ ایکٹس (Acts) کے ذریعے لاکھوں ایکڑ اراضی کی احاطہ بندی (Enclosure) کا نفاذ عمل میں

لایا گیا۔(Thompson 1977:Corrigan and Sayer 1985;95-99)

اور جہاں تک طلب کی مد میں ریاست کے کردار کا تعلق تھا تو اس نے 'قومی منڈی' (National Market) کو مکئی' کھانڈ' ٹیکسٹائل' بحری سامان اور عمارتی لکڑی پر حفاظتی ٹیرف(Tariff) عائد کر کے تحفظ فراہم کیا اور دوسرے ممالک یعنی فرانس' سپین' ہندوستان اور اس کی طرح کی دوسری نوآبادیوں سے مختلف اشیا کی درآمد کی حوصلہ شکنی کی۔ 1651ء اور 1662ء کے نیویگیشن ایکٹوں(Navigation Acts) کے ذریعے غیر ملکی اشیا کی برطانیہ میں ترسیل کو ممنوع قرار دے دیا گیا اور مخصوص طرز کی بیرون ملک میں تیار کی جانے والی اشیا کے استعمال پر تو بطور خاص برطانوی سرزمین پر پابندی لگا دی گئی۔

طلب(Demand) کے حوالے سے مزید بات کی جائے تو اس ضمن میں بحریہ نے بہت ہی اہم کردار ادا کرتے ہوئے ان صنعتوں کو بہت سہارا دیا جو جہاز سازی اور بحری اسلحہ سازی سے متعلق سامان تیار کرتی تھیں اور یہ حقیقت تو ڈھکی چھپی نہیں کہ برطانوی ریاست آرمی کی بجائے بحریہ پر کہیں زیادہ خرچ کیا کرتی تھی۔(Clark 1947:110; Brewer 1989;chapter 2-4)

اور جوں جوں برطانوی معیشت اور اس کی افواج ترقی کرتی گئیں اسی تناسب سے فوج پر برطانیہ کے اخراجات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ 1710ء اور 1780ء کی درمیانی مدت میں برطانیہ کی قومی آمدنی میں 59.8 ملین پاؤنڈ سے 97.7 ملین پاؤنڈ تک اضافہ ہوا اور فوج پر اخراجات بھی 5.4 ملین پاؤنڈ سے بڑھ کر 12.2 ملین پاؤنڈ تک جا پہنچے (Brewer 1989:41) اس طرح معیشت اور فوجی اخراجات دونوں میں اضافہ ہوا بلکہ ان دونوں میں سے فوجی اخراجات خصوصاً 1790ء کی دہائی اور 1815ء کے درمیانی عرصے میں زیادہ اور نسبتاً تیزی سے بڑھے۔ کیونکہ اس دوران انگلستان فرانسیسیوں سے برسرپیکار رہا۔ مزید براں بحری جہازوں اور بڑے تجارتی بیڑوں کی انتظامی نگہداشت نیز بڑی بڑی فیکٹریوں میں محنت کشوں کو نظم وضبط سے آراستہ کرنے کی مہارت رفتہ رفتہ برطانیہ میں مالکان (Owners) کو تفویض ہو گی۔ اٹھارویں صدی کا مخصوص مرد جنگ(A typicalman of war) پر اس وقت کی کاٹن سپننگ مل سے کہیں زیادہ خرچ کیا جاتا تھا۔ یاد رہے کہ 18 ویں صدی کی کاٹن سپننگ مل اپنے وقت کی سب سے بڑی اور جدید ترین فیکٹری ہوتی تھی۔

اس سطح کے سرکاری اخراجات کے لیے بہت ضروری تھا کہ پبلک کریڈٹ اور ٹیکسیشن کا قابل بھروسہ نظام تشکیل دیا جائے۔ اس ضمن میں بھی انگریزوں نے ان غیر ملکیوں سے جو کہ نسبتاً ترقی یافتہ تھے اور برطانیہ کے مدمقابل بھی ان سے بہت کچھ سیکھا اور ان سیکھی ہوئی اختراعات کو اپنی سماجی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا۔ انگریزوں نے شعوری طور پر بینک آف ایمسٹر ڈیم کی مثال پر عمل کرتے ہوئے 1694ء میں بینک آف انگلینڈ قائم کر دیا۔ یہ بینک پرائیویٹ سیکٹر میں کھولا گیا تھا لیکن اس میں جمع کیا گیا بیشتر سرمایہ سرکار کو قرضے فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور اس کے عوض سرکار نے اس بینک کو اپنے نوٹ چھاپنے کی اجازت دے دی جو کہ سرکار کی طرف واجب الادا رقوم کی ادائیگی کے لیے استعمال کیے جا سکتے تھے۔ بینک آف انگلینڈ' ایسٹ انڈیا کمپنی اور ساؤتھ سی کمپنی (South Sea Company) نے برطانوی ریاست کو پبلک کریڈٹ کے لیے ایسی پختہ بنیاد فراہم کر دی کہ وہ کم سے کم شرح پر ایام جنگ میں اور زمانہ امن میں بھی قرضے حاصل کر سکتی تھی۔(Dichson 1967:Brewer 1989)

جنگوں کے لڑنے کے لیے خطیر رقوم چاہیں اور ان کے حصول کے لیے بھاری ٹیکس لاگو کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں پر برطانوی طبقہ امراء نے ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اپنے آپ پر ٹیکس نافذ کیے۔ اگرچہ انہوں نے بلاشبہ بہت سے ایسے ٹیکس بھی لاگو کیے جن کا بالواسطہ طور پر اثر غریبوں پر پڑا۔ لیکن ڈچ ولیم کی قیادت میں جو جنگیں 1690ء کی دہائی میں شروع کی گئیں ان پر آنے والے اخراجات اٹھانے کے لیے مالیے کا آغاز کیا گیا جو کہ مالکان زرعی اراضی سے کسی لحاظ و امتیاز یا استثنیٰ کے بغیر وصول کیا جانا طے پایا۔ مالکان اراضی نے عام طور پر تو اس ٹیکس کا بار اپنے مزارعوں پر ڈال دیا یا پھر صارفین پر کیونکہ اشیائے خوردنی کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں اور درآمدات پر پابندی عائد تھی لہٰذا صارفین کو طوعاً و کرہاً اشیائے خورد و نوش بہت مہنگے داموں خریدنا پڑتی تھیں۔(Corrigan and Sayer 1885:chapter 5)

اس کے باوجود طبقہ بالا اپنے ذمے واجب الادا ٹیکس ادا کر دیا کرتے تھے اور ٹیکسوں کی ادائیگی میں غفلت نہ برتتے۔ 1760ء کی دہائی میں برطانوی ریاست قوم کی پیدا کردہ دولت کا 20واں حصہ ٹیکسوں کی صورت میں ہتھیا لیتی یہ اعداد و شمار فرانس سے تقریباً دوگنا ٹیکسوں کی وصولی کا عندیہ دیتے ہیں۔(Thane 1990:3) یہ تقابل اس لیے بھی اہم ہے کیونکہ تب فرانس ہی

برطانیہ کا سب سے بڑا حریف تھا۔ نہ صرف یہ کہ فرانسیسی ریاست اس تناسب سے ٹیکسوں کی وصولی میں کامیاب نہ ہو پائی جتنا کہ برطانوی ریاست وصول کر لیتی تھی بلکہ فرانسیسی عوام عائد کیے جانے والے ان ٹیکسوں پر غم و غصے کا بھی اظہار کرتے تھے جو کہ انگلستان میں عائد کردہ ٹیکسوں سے کہیں کم تھے۔ اور یہ ٹیکسوں ہی کا نظام تھا جو کہ انقلاب فرانس کا باعث بنا۔ 1799ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے انکم ٹیکس لاگو کر دیا جو کہ ایک مخصوص سطح سے زیادہ آمدنی والے افراد سے بلاامتیاز وصول کیا جاتا تھا لیکن 1816ء میں اس ٹیکس کو بلا تامل ختم کر دیا گیا کیونکہ فرانس کی 1815ء میں شکست کے بعد اس ٹیکس سے وصول ہونے والی رقم کی ریاست کو ضرورت نہ رہی تھی۔

ٹیکسوں کا نہایت ہی موثر نظام اور طبقہ امراء کے ساتھ ساتھ غریبوں میں نظم و ضبط بھی روبہ ترقی ریاست کی لازمی شرط تصور کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں نیدرلینڈز کی مثال دی جاسکتی ہے کیونکہ پری وگ (Periwig) دور میں نیدرلینڈز پر اقتصادی زوال محض اس وجہ سے آیا کیونکہ ڈچ طبقہ امراء سخت کوشی سے عبارت نظم و ضبط کی پابند زندگی کی بجائے تن آسان زندگی کے عادی ہو گئے تھے۔

آخر میں ہم برطانیہ کے بطور روبہ ترقی ریاست (Developmental State) کی حیثیت سے ایک اور اہم پہلو پر توجہ کرتے ہیں جو کہ عام طور پر اس کی سماجی تاریخ کا موضوع خیال کیا جاتا ہے۔ اس پہلو نے ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے برطانیہ کی مارکیٹ اکانومی کے لیے ایک مثبت بندش (Positive Hindrance) کے طور پر کام کیا۔ یہ غریبوں کو ریلیف (Relief) کی فراہمی سے متعلق تھا غریبوں کو ریلیف اور امداد فراہم کرنے کا یہ نیٹ ورک بہت ہی وسیع اور مرکز گریز تھا اور اس کی ابتداء ایلزبتھ اول کے دور حکومت سے ہوئی تھی۔ ایلزبتھ کے عہد کے یہ قوانین غربا (Poor Laws) ازمنہ رفتہ کے قوانین اور رواجات کا مجموعہ تھے جنہیں باقاعدہ قانون کی شکل پہلے تو 98-1597ء میں دی گئی اور 1601ء میں دوبارہ سے چند ترامیم کے ساتھ نافذ کر دیا گیا۔ 1601ء میں دوبارہ سے نافذ العمل ہونے والے غربا کے لیے امدادی قوانین کو ''اولڈ پوور لاء'' کا نام دیا گیا اور اس لاء کے تحت چند اصول متعین کر لیے گئے۔ پیرش (Parish) کو ابتدائی انتظامی اکائی قرار دے دیا گیا اور مقامی ججوں کے ذریعے اوورسیئرز (Overseers) کو مقرر کیا گیا جو کہ ہر گھر سے غریبوں کے لیے نافذ کیے گئے امدادی قوانین کی رو سے ٹیکس وصول کیا

کرتے تھے۔ اوورسیئرز کی جانب سے اگر غفلت برتی جاتی تو انہیں جرمانہ کیا جاتا تھا۔ اس طرح اکٹھی ہونے والی رقم مختلف طرح کے ضرورتمندوں کی امداد کے لیے استعمال کی جاتی۔ ان کے لیے خیرات اور خیراتی اداروں کا اہتمام کیا جاتا جن میں بوڑھوں اور بیماروں کو رکھا جاتا۔ نادار بچوں کو ہنر سکھائے جاتے اور صحتمند افراد کو روزگار پر لگایا جاتا تھا (ہٹے کٹے گداگروں کو قید کی سزا دی جاتی تھی) (Hummelfarb 1984:25) غریبوں کے لیے یہ امدادی قوانین بعد میں آنے والی صدیوں میں کبھی سختی اور کبھی ذرا نرمی کے ساتھ نافذ رہے امدادی قوانین کے تحت ان ٹیکسوں کی وصولی نہایت سنجیدگی سے کی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی کی دوسری دہائی کے دوران برطانیہ کی 6 ملین آبادی سے 2 ملین پاؤنڈ وصول کیے گئے (Ibid.26) ان قوانین کا مقصد لیبر کو نظم وضبط میں لانا لیبر مارکیٹ کو قواعد وضوابط کے تحت کرنا اور غریبوں کو غربت سے نجات دلانا تھا۔

اٹھارویں صدی کے اختتامی ایام میں یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ مقامی انتظامیہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ان دنوں جب اشیائے خوردنوش و اشیائے صرف کی کمی ہو جائے تو غرباء کو تمام ضروریات کی فراہمی کو یقینی بنائیں۔ 1790ء کی دہائی میں جب فرانسیسی جنگیں جاری تھیں تو اشیائے ضروریہ کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ ان حالات میں غریب لوگ بری طرح متاثر ہوئے۔ 6 مئی 1795ء میں نیوبری کے قریب سپین ہام لینڈ (Speenham land) کے مقام پر پیلیکن میں برک شائر کے ججوں کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس ابتلا اور کمیابی کے دور میں اجرتوں کے ساتھ ساتھ روٹی کی قیمت میں چھوٹ دی جائے تا کہ عام لوگ اور خاص طور پر غربا کم ازکم روٹی کھا سکیں۔ (Polanyi 1957:78) ان تمام تدابیر کے باوجود حقیقی اجرتیں کم ہوگئیں اور خاص کر 1820ء اور 1830ء کی دہائیوں میں انگلستان کی بیشتر کاؤنٹیوں کے زرعی شعبہ سے متعلق محنت کشوں کی اجرتوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔ اس کے باوجود برطانوی ریاست نے سماجی اور سیاسی عدم اطمینان کو قابو میں رکھا۔ یہ سب اس وجہ سے ممکن ہوسکا کیونکہ بنیادی ضرورت کی اشیاء کی قیمتیں زیادہ نہ بڑھنے دی گئیں اور غریب طبقوں پر خصوصی توجہ دی گئی۔

4- جرمنی کی روبہ ترقی ریاست 1850-1914

1871ء سے 1914ء تک کے عرصے کے دوران متحدہ جرمنی کا ظہور یقیناً ورطۂ حیرت میں ڈال

دینے والی تاریخی حقیقت ہے۔ اپنے قیام کے چند ہی سالوں میں وہ یورپ کی مرکزی صنعتی قوت بن کر ابھرا۔ اس فقید المثال ترقی کے نتیجے میں وہ امریکہ کے بعد دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی طاقت بن گیا۔ 1871ء کے بعد سے جرمنی کی مادی ترقی کے بارے میں اس حقیقت کو گوشہ فراموشی کی نذر کر دیا جاتا ہے کہ روبہ ترقی ریاست کی حیثیت سے جرمنی کا کیریئر بہت پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جرمنی کی ڈیلپمنٹل (Developmental) ریاست کے طور پر ابتدا 1850ء کی دہائی میں ہو گئی تھی تاہم اس تمام تر بحث میں یہ بات بہت اہم ہے کہ 1848ء کے ناکام انقلابات کے فوراً بعد جرمنی میں فیوڈل ازم کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ جو کہ مادی ترقی کی طرف پہلا قدم تھا۔ (Tilly 1991:176-77)

جرمنی کی ترقی کے حوالے سے کئی طرح کی توجیہات پیش کی جا سکتی ہیں جیسے ہاف مین (Hoffman) کی تھیوری جس میں اس نے صنعتی ترقی کے مراحل گنوائے ہیں دوسری تھیوری کا خالق Gerschenkron ہے جس کے پیش کردہ مفروضے میں معتدل پسماندگی (Moderate Backwardness) کے فوائد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جسے صنعتی ترقی کی بہت اچھی ابتدا کیلیے Gerschenkron خوش آئند تصور کرتا ہے۔ ہاف مین کی تھیوری کے مطابق (جو کہ برطانیہ کے تجربے سے ماخوذ ہے) صنعت کاری کے عمل میں اشیائے سرمایہ یعنی کیپٹل گڈز کی بڑے پیمانے پر پیداوار آخری مرحلے میں جا کر ہوتی ہے جبکہ ابتدائی مراحل میں فیکٹریاں اشیائے صرف کی پیداوار تک ہی محدود رہتی ہیں۔ لیکن یہ نظریہ جرمنی میں ہونے والی ترقی کے عمل پر فٹ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہاں فیکٹری پروڈکشن کا جونہی آغاز ہوا تو لوہے، سٹیل اور معدنی وسائل سے بنی اشیاء نے اشیائے صرف کی پیداوار پر برتری حاصل کر لی گریچن کرون (Gerschenhron) کے مفروضے اور جرمنی کی صنعتی ترقی کے Pattern کی اگر بات کی جائے تو جہاں وہ جرمنی میں صنعت کاری کی ابتدا جو کہ اشیائے سرمایہ کی پیداوار سے ہوئی تائید کرتا ہے وہاں وہ اس ضمن میں ریاست کی طرف سے معیشت کو سمت دینے اور اس کی رہنمائی کرنے کو بھی بہت اہمیت دیتا ہے یعنی صنعتوں کو سرمایہ فراہم کرنے کے لیے بینکوں کا کردار اس کے نزدیک بہت اہم ہے۔ جو کہ پسماندہ اکانومی کی ترقی کی سب سے اہم علامت ہے۔

(Hoffman 1955:Gerschenhron 1965)

مغربی یورپ کے تناظر میں جرمنی کی اس اضافی پسماندگی(Relative backwardness) کے ابتدائی آثار سترہویں صدی کے نصف اول میں برپا ہونے والی تیس سالہ جنگ میں ڈھونڈھے جا سکتے ہیں۔ اس جنگ کی وجہ سے آبادی میں بہت کمی واقع ہوئی۔ وہاں کا انتظامی و اقتصادی ڈھانچہ بری طرح سے تباہ ہو گیا اور اس کے بعد جرمنی جو کہ بہت ساری ریاستوں میں بٹا ہوا تھا ان ریاستوں میں فیوڈل۔ فوجی اتحاد کی آمرانہ حکومت قائم ہوگئی (یاد رہے کہ جرمنی کی بڑی ریاستیں پروشیا اور باویریا(Bavaria) تھیں)۔ جرمنی کے مشرقی حصے میں غلے کی تجارت کی کمرشلائزیشن کے باعث وہاں جاگیرداروں کی قوت میں مزید اضافہ ہوا اور ان جاگیرداروں سے وابستہ کسان حقیقتاً ان کے غلام ہو کر رہ گئے (Borchardt 1973:85-98)۔ جرمنی میں فیوڈل ازم کا خاتمہ اس چیلنج کے نتیجے میں ہوا جو انقلابی فرانس کی طرف سے یورپ کے فیوڈل معاشرے کو درپیش ہوا۔ انقلابی دور میں فرانس تمام بڑے بڑے جرمن شہزادوں کو شکست دینے کی اہلیت رکھتا تھا اور نپولین کی 1815ء میں آخری شکست تک ان فیوڈل شہزادوں کی یہی حالت رہی۔ فیوڈل ازم کا خاتمہ جو کہ 1810ء اور 1850ء کے درمیانی عرصے میں عمل میں آیا دیہی پرولتاریہ کی تخلیق کا باعث بنا کیونکہ فیوڈل عناصر سے آزادی کی کسانوں کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ ان کسانوں کو مالکان اراضی کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے شرط یہ تھی کہ وہ انہیں دے دی گئی اراضی کی قیمت ادا کریں جو کہ 20 سالہ عرصہ میں واجب الادا ہونا قرار پائی۔ چنانچہ اس قیمت کو ادا کر سکنے کی سکت نہ رکھنے والے لاکھوں کسان بے زمین ہو گئے (Blum 1978, Borchardt 1973)

فیوڈل شہزادوں کی براہ راست حکومت کے خاتمے اور جرمنی ہی میں پروشیا کے ایک مضبوط ترین ریاست کی حیثیت سے ظہور نے جرمن اتحاد کی راہ ہموار کی۔ سولہویں صدی کے بعد فیوڈل عناصر کو حاصل ہونے والے استحکام کے دنوں میں جرمن نیشنلزم کسی منظم طور پر کوئی سیاسی شکل نہ اختیار کر سکا گو کہ اس کا اظہار ادب اور کلچر میں بخوبی ہوتا تھا۔ جرمنی میں قوم پرستی کے جذبے نے فرانسیسی نیشنلزم کی مثالی قوت سے تحریک حاصل کی خاص طور پر 1780ء کے بعد فرانس میں نیشنلزم نے جو عروج حاصل کیا اس سے جرمن بہت متاثر ہوئے(Greenfeld 1992:chapter 4) تمام اہم وسطی اور جنوبی جرمن ریاستیں (سوائے آسٹریا کے جو کہ ہیسبرگ ایمپائر کا حصہ تھا)

1834ء میں پروشیا کے ساتھ کسٹمز یونین (Custom's Union) کا حصہ بن گئیں۔ بعدازاں 1835ء اور 1837ء کی درمیانی مدت میں باقی ریاستیں بھی کسٹمز یونین میں آ کر شامل ہوگئیں۔(Borchardt 1973:105)

جرمن ریاستوں کے اتحاد، اندرونی ٹیرفس (Tariffs) کسٹمز اور سرف ڈم کے خاتمہ اور 1830 کے بعد پروشیا کی طرف سے ریلوے میں بھاری انوسٹمنٹ کے نتیجے میں گھریلو (Domestic) مارکیٹ میں زبردست وسعت آئی۔ اس کے باوجود بورژوا طبقہ ریاستی ڈھانچے پر کنٹرول حاصل نہ کر سکا جو کہ پرانے دور حکومت کی یادگار بیورکریسی اور امراء کی گرفت میں تھا۔ پھر بھی ریاست نے سرمایہ دارانہ ترقی کے مقاصد کے حصول میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی نہ صرف جرمنوں کی فوجی قوت میں اضافے کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اور تمام جرمنوں کا معیار زندگی بلند کرنے کا مقصد پورا کرنے کے لیے ریاست پر متمکن افراد نے ترقی کی راہ میں حائل ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جو کہ صدیوں پرانی تھیں۔ البتہ یہاں ریاست بہت آمرانہ طرز کی تھی۔ اسی آمرانہ طرز حکومت نے بسمارک کے زیر قیادت قوم پرستانہ خول پہن لیا اور پروشیا کو ایک کامیاب استعماری ریاست بنانے کے پیچھے ایک جذبے کے طور پر کام کیا اور بسمارک کی استعماری پالیسی کی کامیابی کا یہی راز تھا۔ 1880ء کی دہائی کے بعد سوشل ڈیموکریٹوں نے پروشیائی ریاست کی آمرانہ اور غیر مساویانہ پالیسیوں کو للکارا مگر ریاست کا بنیادی کردار اور اس کے خدوخال اس وقت تک تبدیل نہ ہوئے جب تک جرمن ایمپائر پہلی جنگ عظیم کے بعد شکست کھا کر ختم نہ ہوگئی۔ لیکن ہمارا یہ مقصد نہیں کہ اس بحث میں الجھ جائیں کہ جرمن ریاست ایسے بیوروکریٹوں اور امراء کے ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ گئی تھی جنھوں نے بورژوا اقدار اپنالی تھیں یا پھر جرمن اپنی اقدار اور رویے میں موثر طور پر فیوڈل تھے (Blachbour and Eley 1984) اس میں زیادہ شک نہیں کہ بسمارک کی سرپرستی میں قدامت پرست قوتوں میں یکجہتی کا قائم ہو جانے اور ٹیرف پروٹیکشن کے مسئلہ پر زمینداروں اور صنعت کاروں میں معاہدہ طے پا جانے کے بعد پروشیا میں جنکرز (Junkers) کی طاقت نے ایک اور زندگی پالی اور زرعی کیپٹل ازم اسی سرحدات میں ہی محدود رہا (Byres 1991:23-27)

ایک کامیاب روبہ ترقی ریاست غیر ملکی علوم وفنون کے سیکھنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور

دوسرے ملک سے سیکھے ہوئے ان علوم، فنون اور ٹیکنالوجی وغیرہ کو اپنے حالات کے مطابق ڈھال لینے کی قدرت بھی پیدا کر لیتی ہے اس طرح ان ریاستوں میں ایسی ایجادات واختراعات وقوع پذیر ہوئی ہیں جو پیداوار میں خاطرخواہ اضافے کا باعث بنتی ہیں اس حوالے سے ہم وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جرمنوں کے چھوٹے بڑے راجباڑے اور ریاستیں روبہ ترقی ریاست کی وہ مخصوص شرائط کو پورا کرنے کا کام متحدہ جرمنی کے وجود میں آنے سے بہت پہلے کر چکی تھیں۔ اکثر جرمن ریاستوں نے اٹھارویں صدی تک ایسی یونیورسٹیاں قائم کر لی تھیں جہاں دینیات فلسفہ، قانون، ریاضی اور حتی کہ سائنس تک پڑھائی جاتی تھیں۔ اکثر جرمن ریاستیں سرکار کے تعاون سے یا پھر گلڈوں کے زیر انتظام قائم ہونے والے ٹیکنیکل سکولوں میں ہنرمندوں اور ٹیکنالوجسٹوں (Technologists) کی باقاعدہ اور رسمی تربیت کی حوصلہ افزائی کرتیں (Blachbourn 1984:176-7) اٹھارویں صدی ہی سے متعدد ریاستوں نے برطانوی نمونے سے استفادہ حاصل کرتے ہوئے فیکٹریوں کو قائم کرنے کی جانب توجہ دینا شروع کی۔ اگرچہ یہ تمام منصوبہ جات اقتصادی طور پر تو منافع بخش ثابت نہ ہو سکے لیکن انہوں نے کاروباری حضرات، ٹیکنو کریٹوں اور ٹیکنالوجسٹوں کے لیے نہایت ہی مناسب تجربہ گاہوں کا کام ضرور کیا جہاں انہوں نے ان طریقہ ہائے کار کو بخوبی آزمایا جو آگے چل کر یورپ میں رواج پا جانے والی مسابقت کی فضا میں جرمنوں کے بہت کام آئے۔ (Landes 1965:364-6) جرمن ریاستیں ہی یورپ میں لازمی تعلیم کے ضمن میں آگے آگے تھیں۔ 19 ویں صدی کے وسط میں جرمنی جس کی آبادی برطانیہ سے کہیں زیادہ تھی شرح خواندگی کے میدان میں برطانیہ کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ اگر برطانیہ اور جرمنی میں ہونے والی اقتصادی ترقی کا موازنہ کیا جائے تو 19 ویں صدی کی آخری تہائی میں برطانوی معیشت اس قدر موثر طور پر ترقی نہ کر پا رہی تھی جتنی کہ جرمن معیشت۔

آخر میں ہم روبہ ترقی ریاست کے دوسرے پہلوؤں کی طرف آتے ہیں خاص طور پر متحدہ جرمنی کے قیام کے بعد پالیسی سازی میں ریاستی سرپرستی اور تحفظ یعنی (Protectionism) وغیرہ جو کہ گرسچن کرون (Gerschenkron) کی طرف سے پیش کیے گئے نظریے کا اہم حصہ ہیں علاوہ ازیں جرمنی کی صنعتی ترقی کی شعبہ جاتی تشکیل اور اس کا نظام بینکاری وغیرہ۔

جرمنی میں دونوں یعنی ریاست اور بڑے آجرین مزدوروں کی جانب سرپرستانہ رویہ رکھتے تھے

(Lee 1978; Craig 1981; 150-2) کروپ (Krup) اور جینا کے زیئس (Zeiss of Jena) جیسے بڑے صنعتی و کاروباری اداروں نے مزدوروں کو رہائشی سہولتوں کے علاوہ دیگر آسائشیں بھی مہیا کردی تھیں جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ ان مزدوروں کو اپنے اداروں کے ساتھ منسلک رکھنا چاہتے تھے اور کڑی نگرانی کے ذریعے صنعتی رازوں کی حفاظت کو بھی یقینی بنانا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ متشدد ٹریڈ یونینوں کی طرف سے ممکنہ خطرے کا سدباب بھی اسی طرح ہی ہوسکتا تھا کیونکہ ان دنوں جرمنی میں ویلہم لائیبخت (Wilhelm Liebknecht) اور اگست بیبل (August Bebel) کے زیر قیادت سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے پروان چڑھنے کے بعد مزدور یونینیں سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے لیے بڑا خطرہ بن گئی تھیں۔ 1880ء کی دہائی میں جرمنی نے مزدوروں کی بیماری سے متعلق انشورنس کا قانون (1883) بنا کر ایکسیڈنٹ انشورنس لاء (1884) اور اولڈ ایج وڈس ایبلٹی انشورنس لا (1889) بنا کر مزدوروں اور محنت کشوں کو ہر ممکن تحفظ فراہم کرنے میں دیگر یورپی ممالک کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ان قوانین کے علاوہ وحشیانہ طرز پر بنائی جانے والی اینٹی سوشلسٹ پالیسیاں جنہیں قانونی جواز فراہم کردیا گیا تھا خاص طور پر 1879ء کے بعد سے بسمارک نے اسی پالیسی کو پوری سنجیدگی سے اپنایا انہیں خیرآباد کہہ دیا گیا۔ مزدوروں میں وفاداری پیدا کرنا۔ ایسی مزدور یونینوں کا قلع قمع کرنا جو مروجہ نظام سے متصادم نظریات کی حامل تھیں اور سوشلسٹوں کی بیخ کنی۔ یہ تمام وہ محرکات تھے جنہیں بسمارک نے اپنے اصول بنالیا اور ان تمام قدامت پسند اور آمرانہ رویہ رکھنے والے عناصر کا بھی یہی شعار تھا جنہوں نے 1866ء اور 1914ء کے درمیانی زمانے میں جرمنی کی تقدیر کے رخ کا تعین کیا۔ معاشی پہلو کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہم بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ بڑی فرمیں یا کارٹلز (Cartels) سٹیل اور لوہے کا دھندا کرتی ہیں یا پھر الیکٹریکل اور کیمیکلز کا کام! جبکہ دوسری صنعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے چھوٹی فرموں یا پھر ہنرمندوں کا مفاد براہِ راست وابستہ ہوتا ہے۔ یہاں مزدور یونینوں کے پنپنے کے لیے بہتر مواقع ہوتے ہیں۔ اسی دور (1866ء تا 1914ء) میں جرمن سائنس دانوں اور ٹیکنالوجسٹوں نے بھی بڑی اہم ایجادات کیں جن کا غیر معمولی فائدہ ہوا (جیسے ہابر (Haber) پراسس جو کہ ایمونیا کی پیدائش میں معاون ثابت ہوا) یہ سائنس دان دوسرے ممالک میں ہوئی ایجادات کو آگے بڑھانے میں بھی کافی کامیاب ہوئے (جیسے سیمن

(Siemen) اور اے ای جی (Aeg) نے الیکٹریکل انڈسٹری کو نئی ایجادات کے ذریعے آگے بڑھایا) بہرحال بڑی فرموں کو متاثر کرنے والی ایجادات کے ساتھ ساتھ جرمنی نے معیاد کارآموزی (Apprenticeship) اور کرافٹ ایسوسی ایشنوں اور گلڈوں سے تصدیق (Certification) کے پرانے طریقہ کار کو جاری رکھا اور یورپ میں بہترین تعلیم اور تربیت سے آراستہ افرادی قوت کی تعمیر کی۔ یہ نظام برطانیہ میں مروجہ نظام کار سے بنیادی طور پر مختلف تھا۔ اس میں زور دیا گیا تھا کہ ہر کامیاب رو بہ ترقی ریاست معاشی اور سماجی اداروں اور تنظیموں میں اپنی ایجادات کو متعارف کرواتی ہے اور محض دوسروں کی نقالی پر ہی قانع نہیں ہو سکتی۔

بینکنگ کے شعبہ میں جرمنی نے عالمی (Universal) بینکنگ کے نظام کو قائم کیا۔ ان بینکوں کو ان کمپنیوں کے انتظامی بورڈوں میں نمائندگی دی جاتی تھی جن میں وہ رقوم فراہم کرتے تھے اس طرح یہ بینک خصوصاً بحرانی ایام میں ان کمپنیوں کی نگرانی کا فریضہ بھی سرانجام دیتے۔ یہ نظام 1830ء اور 1840ء کی دہائیوں کے دوران جب ریلوے نیٹ ورک پورے زور و شور سے قائم ہو رہا تھا وجود میں لایا گیا لیکن یہ نظام پختگی کی حد کو تب پہنچا جب ریلوے کے قائم ہو جانے کے بعد جرمنی میں اقتصادی بحران آ گیا اور فرانکو پروشین جنگ میں جرمنی کی فتح کے بعد عود آنے والے افراطِ زر نے اسے پوری طرح سے گھیر لیا۔ (Tilly1986, 1991;Sylla 1991) بینکوں کی اس مداخلت پر مبنی پالیسی نے کچھ حد تک تو ترقی یافتہ سٹاک مارکیٹ کی کمی کی تلافی کی اور کچھ حد تک اس کے متبادل کا کردار بھی ادا کیا اس وقت تک حتیٰ کہ صنعتی کاری کا عمل کافی آگے تک بڑھ گیا۔

آخری نقطہ یہ ہے کہ جرمن رو بہ ترقی ریاست بہت سرپرستانہ اور مداخلت پسند تھی خاص طور پر 1870ء کی دہائی کے آخری دور سے اس کی یہی پالیسی رہی (Craig 1981:78-100;Tilly 1991) متحدہ جرمنی سے قبل کی ریاستیں آزاد تجارت کے صولوں پر کاربند تھیں اور اس قدر مداخلت پسند ہرگز نہ تھیں لیکن 1873ء میں زرعی کساد بازاری نے مشرقی جرمنی کے غلہ پیدا کرنے والے کاشتکاروں بری طرح سے متاثر کیا علاوہ ازیں سٹیل اور اوہے کے متعلق آجرین اور تاجروں میں بھی ان حالات میں غیر ملکی مقابلے کا سامنا کرنے کی سکت نہ رہی تھی۔ چنانچہ بسمارک نے سٹیل اور غلے کی درآمد پر بھاری ڈیوٹی عائد کر کے اپنے

صنعتکاروں کوتحفظ فراہم کیا۔ غلے پر ڈیوٹی 1888ء اور 1902ء میں پھر سے بڑھائی گئی جب غلے کے پروڈیوسروں کو درآمدات سے خطرہ محسوس ہوا۔ جرمنی کی اقتصادی ترقی محض اس طرح کے تحفظ ہی کی مرہون منت ہی نہ تھی بلکہ اس میں کیپٹل گڈز (Capital Goods) بنانے والے صنعتوں کا بھی بڑا دخل تھا۔ ان صنعتوں کے وجود کو نجی سرمایے کے بہت بڑے حجم نے اور سرکاری سرمایے نے بھی جو کہ سماجی شعبہ اور دفاعی صنعتوں پر خرچ ہوا بہت سہارا دیا۔(Tilly 1978)۔1870ء میں جرمن سرمایے کی تشکیل اور اس میں اضافے کا تناسب اس کی خالص قومی پیداوار (NNP) کا 1/8 تھا جو 1890ء میں بڑھ کر 1/16 ہو گیا۔ برطانیہ میں یہ تناسب 1870ء میں 1/16 اور 1890ء میں 1/11 تھا۔(Mitchell 1978: Table II)

جرمن رو بہ ترقی ریاست (Developmental State) کی راہ میں فوجی اخراجات اور آمرانہ ریاستی ڈھانچہ بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے اور اس کا ہی اثر تھا کہ حقیقی اجرتیں (Real Wager) اس قدر نہ بڑھ سکیں جس قدر جرمنی کی پیداوار کے تناسب میں اضافہ ہوا۔ رو بہ ترقی ریاست کا جاپان کا تجزیہ اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ جاپان ترقی یافتہ ریاست تبھی بن سکا جب جنگ عظیم دوئم میں اس کی شکست کے بعد اس پر مسلط کیا گیا فوجی آمریت پر مبنی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔

5- جاپان کی رو بہ ترقی ریاست

دوسری رو بہ ترقی ریاستوں کی طرح جاپانی رو بہ ترقی ریاست نے بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ارتقاء کی منزلیں طے کیں اور وہ 1950ء کی دہائی میں پختگی کی حدود میں داخل ہوئی۔ عام طور پر جدید جاپان کی ابتداء میجی عہد بحالی کے دنوں سے ہی سمجھی جاتی ہے اور یہ بہت حد تک صحیح بھی ہے البتہ رو بہ ترقی ریاست کے لیے ضروری شرائط 1868ء سے قبل ہی پوری کر لی گئیں تھیں جن میں غیر ملکی تسلط سے آزادی قابل ذکر ہے اگرچہ یہ آزادی غیر مساویانہ بنیادوں پر تقریباً یکطرفہ معاہدوں کے نتیجے میں عمل میں آئی تھی جب کموڈور پیری نے جاپانی بندرگاہوں پر کامیاب بمباری کی تھی۔ لیکن اس شروط آزادی کے باوجود جاپان کو پالیسی سازی میں بہت حد تک چھوٹ حاصل ہوگئی۔ اس کے علاوہ

جاپانی طبقہ امراء کی غیر معمولی قوم پرستی اور دوسری اقوام سے سیکھنے کی اہلیت نے جاپان کو ایک روبہ ترقی ریاست کے طور پر بین الاقوامی برادری میں اپنے لیے مقام بنا لینے میں مدد کی۔ خاص کر جاپانیوں نے چینیوں سے جنگی فنون ریاستی اور معاشرتی تنظیم کے مفید اصول سیکھنے میں ذرا بھی تکلف نہ کیا (Kahn 1973:chapter 2; Morishima 1982; introduction) میجی عہد بحالی کے بعد پچھلے ادوار کی یادگار جاگیردارانہ القابات اور مراتب یعنی دربار سے منسلک امراء، جنگجو، کسان، تاجر اور معاشرتی طور پر کنارہ کش کر دیئے گئے افراد Outcast کو ختم کر دیا گیا اور معاشرے کو دو نئے طبقات میں تقسیم کیا گیا۔ مختصر سی تعداد میں امراء اور ان کے علاوہ باقی سب 1876ء تک سرکار نے جنگجو طبقے (سمورائی) کے تمام سابقہ ارکان کو پنشن پر بھیجنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس سے قبل وہ اپنے مخصوص علاقہ جات جنہیں ٹوکوگوا (Tokugowa) کہا جاتا تھا سے وظائف وصول کرتے تھے جو 200 ملین ین سے بھی تجاوز کر جاتے۔ (Chkawa and Rosovsk 1978:142-3) میجی قانون نے دیہی مزدوروں کو بھی کئی طرح کی زیر باری (Debt Bondage) سے نجات دلائی۔ قرضہ لینے کے بدلے میں ان دیہی مزدوروں کو یا تو عمر بھر کی غلامی نصیب ہوتی یا کم از کم اس وقت تک تو لازمی طور پر جب تک ان سے بیگار لے کر قرضے کی رقم بمع سود وصول نہ کر لی جاتی۔ (Taira 1978:170) قانون نے دیہی مزدوروں کی زندگی کو کچھ آسان تو بنا دیا لیکن کسانوں کو زمین کا مالک نہ بنایا جیسا کہ روسوسکی اور ہیوگو کا دعوی ہے (1978:143) بلکہ فیوڈل طبقے کی تحویل میں زرعی اراضی کو نجی ملکیت قرار دے کر فیوڈل زمانے ہی کے کسانوں کو وہاں پر مزارع بنا دیا گیا جو کہ اس اراضی ہی کے ذریعہ اپنی روزی روٹی کماتے تھے۔ 1853ء میں وہاں تقریباً 80 فیصد لوگ کسان تھے۔ 1940ء تک کسانوں کی تعداد کا تناسب گھٹ کر 40 فیصد رہ گیا تھا البتہ زراعت پر ہی انحصار کرنے والے خاندانوں کی کل تعداد 1876ء میں 5,518,000 سے گھٹ کر 1932 میں 5,642,000 تک جا پہنچی۔ (Ladejinsky1947:70) زرعی اراضی کا فقدان رکھنے والی جاپان کی معیشت میں زرعی اراضی کی تقسیم غیر مساویانہ تھی (جیسے 1939ء میں زراعت سے منسلک فی کس گھرانے کی

زمین 2.7 ایکڑ تھی) 1940ء کی دہائی میں 28 فیصد کسانوں کی اپنی زمین تھی جبکہ 40 فیصد کسانوں کو اپنی ملکیت اراضی کے علاوہ ٹھیکے پہ زمین حاصل کرنا پڑتی تھی تاکہ ان کی آمدنی میں کچھ اضافہ ہو سکے۔ (Ibid.68) زمین کی کمی اور روزگار کے متبادل ذرائع کی عدم دستیابی کی وجہ سے مزارع اور کھیت مزدور زمین اور زمیندار ہی کے ساتھ جڑے رہے۔ حالانکہ انہیں کافی زیادہ لگان ادا کرنا پڑتا تھا۔ 1930ء کی دہائی میں جاپانی حکومت نے محکمہ زراعت کی طرف سے 9,134 دیہات کا سروے کیا گیا جس سے پتہ چلا کہ 70 فیصد کاشتکار جو کہ سال میں ایک فصل کاشت کرتے ہیں انہیں اپنی کل پیداوار کا 50 فیصد لگان کی صورت میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ وہ کاشتکار جو کہ سال میں دو فصلیں کاشت کرتے ہیں انہیں کل پیداوار کا 60 فیصد ادا کرنا پڑتا تھا۔ (Ibid. 41) کسانوں کی حقیقی آمدنی (Net Income) تو اس سے بھی کم تھی جتنی کہ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ انہیں فصل کاشت کرنے پر بھی پیسہ خرچ کرنا ہوتا تھا اور زمین پر عائد ٹیکس کے علاوہ بھی کئی طرح کے ٹیکس ادا کرنے ہوتے تھے۔

چنانچہ دوسری جنگ عظیم سے قبل کی جاپانی رو بہ ترقی ریاست کئی ساری رکاوٹوں اور مشکلات کا شکار رہی جو کہ زیادہ تر استحصالی زمیندار طبقے کی پیدا کردہ تھیں۔ ان مشکلات کا تناسب تو بسمارک کے زمانے کی جرمن رو بہ ترقی ریاست کو درپیش مشکلات سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ یہی ایک بڑی وجہ تھی کہ 1953ء سے پہلے صنعت کاری کی بے انتہا کوشش (جس میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کو جاپان میں سرمایہ کاری کی اجازت نہ تھی کہ کہیں وہ معیشت کے کسی سیکٹر پر کنٹرول حاصل نہ کر لیں) کے باوجود جاپانی معیشت وہ شاندار ترقی کی منازل طے نہ کر سکی جو کہ اس نے اس سن کے بعد میں کی 1953ء تک جاپان نے اپنی جنگ سے تباہ حال معیشت کو کافی حد تک بحال کر لیا تھا۔ Table2.4)(Ohkawa and Rosovsky 1978:Table 28; Ohkawa et.al. 1993: 1897ء سے 1919ء تک جاپانی قومی آمدنی میں 2.8 فیصد اور 1919ء سے 1938ء تک کے عرصے میں 3.5 فیصد کا اضافہ ہوا۔ قومی آمدنی کے ان اعداد و شمار میں دو عظیم جنگوں کے دوران جاپان کی معیشت کو عارضی طور پر ملنے والی ترقی کا بھی دخل تھا یعنی 1912ء سے 1917ء کے

درمیانی عرصے میں اس کی جی این پی میں 4.56 فیصد جبکہ 1931ء سے 1937ء کے سالوں میں 5.71 کا اضافہ ہوا (Ohkawa and Rosovsky 1978:Table 28) اس کے بالکل برعکس 1969ء۔ 1953ء اور 1979۔ 1969ء کے عرصے میں جاپان کی قومی آمدنی میں بالترتیب 10.0 فیصد اور 8.5 فیصد کا اضافہ ہوا۔(Ohkawa et. al. 1993:Table 2.4)

دیہی علاقوں سے زمینداری کے خاتمے میں ناکامی اور محنت کش لوگوں کی دستگیری واعانت کے لیے موثر اقدامات میں کامیاب حاصل نہ کر سکنے کے باوجود میجی انقلاب کے بعد جاپانی حکمران طبقے کی کاوش اور اپنائی جانے والی حکمت عملی کی وجہ سے جاپان صنعت کاری کی دوڑ میں شامل دیگر غیر یورپی اقوام سے کہیں آگے نکل گیا کیونکہ ان اقوام کے حکمران طبقات کا زاویہ نگاہ اور طریقہ کار مختلف تھا۔ مثال کے طور پر سمورائی (Samurai) طبقے کے کئی ایک ارکان نے اپنے ہی طبقے کی تحلیل کے لیے اہم کردار ادا کیا اور ساتھ ہی معاشرے کے پرانے درجہ بندی سے عبارت سماجی ڈھانچے کو بھی مسمار کرنے کی ابتداء بھی کر دی۔ سمورائی طبقے نے یہ احساس کر لیا تھا کہ ملک کی توانائی کے بہہ نکلنے کے سامنے رکاوٹ یہی سماجی ڈھانچہ تھا جو کہ مغربی طاقتوں کی جارحیت کے خلاف جاپان کے موثر دفاع کا اہتمام کرنے کا اہل ہرگز نہ تھا جسے اٹاگاکی تائی سوکے (Itagaki Taisuke) نے جو کہ ایک متوسط سمورائی خاندان کا سربراہ تھا 1871ء میں دلیل دیتے ہوئے کہا۔ انسانی ہنر وفن ایک قدرتی عطیہ ہے جو طبقات میں انسانی تقسیم یعنی سمورائی' کسانوں' ہنر مندوں اور تاجروں وغیرہ کا پابند نہیں۔(Beasley 1973:384)

اس کی تو خواہش تھی کہ سول اور فوجی خدمات کو محض سمورائی طبقوں تک ہی محدود رکھنے کی بجائے ان کا دائرہ کار دیگر افراد تک بڑھا دیا جائے تا کہ ہر ایک کو ترقی کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موقع مل سکے۔(Ibid) اٹاگاکی (Itagaki) پیرس کمیون کے وقت پروشین جارحیت کے سامنے عام فرانسیسیوں کی دلیرانہ مزاحمت کی مثال دیتے ہوئے ایسے اداروں کی تشکیل کے حق میں دلیل دیتا ہے جو عوام کو عزت واحترام فراہم کرتے ہیں۔

دنیا کا سامنا کرنے اور قومی سطح پر خوشحالی حاصل کرنے میں کامیابی

کو ممکن بنانے کے لیے تمام لوگوں کو حب الوطنی کے جذبات پیدا کرنے چاہئیں اور ایسے اداروں کو قائم کرنا چاہیے جو افراد کے ساتھ مساویانہ سلوک کریں۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ آخر لوگوں کی دولت اور طاقت اصل میں حکومت ہی کی دولت اور طاقت ہے اور لوگوں کی غربت اور کمزوری حکومت کی غربت اور کمزوری۔

(Memorial by Itagaki Taisuke, 1870-71, as translated and quoted by Besley 1973:398-5)

میجی احیاء (Meiji Restoration) کے رہنماؤں نے تہذیب اور روشن خیالی کے حصول کے لیے نیز ریاست کو مضبوط بنانے اور غیر ملکی حملہ آوروں کی کامیاب مزاحمت کے لیے تعلیم کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ 1872ء میں ایک قانون نافذ کیا گیا جس کے تحت پرائمری سے یونیورسٹی تک کی تعلیم کی ایک جامع سکیم تیار کر کے اسے لاگو کر دیا گیا۔ اس قانون کی رو سے پرائمری تعلیم لازمی کر دی گئی۔ اس قانون کو نافذ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ (Taira 1978:196-9) لیکن اس ضمن میں تمام رکاوٹوں کو آہستہ آہستہ دور کر دیا گیا اور تعلیم کو عام کرنے اور بہتر بنانے کے لیے رقم بھی مہیا کر دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1873ء میں جاپان کے 28 فیصد سکول جانے کی عمر کے بچے سکول جاتے تھے لیکن صدی کے آخر تک 98 فیصد اسی عمر کے بچے سکول جانے لگے تھے اور جاپان دنیا کے ان ممالک کی صف میں آن کھڑا ہوا جہاں خواندگی کی شرح سب سے زیادہ تھی (Morishima 1982:102) حکومتی منصوبہ بندی اور بزنس حکمت عملی میں باہمی تال میل کا میجی احیاء کے ابتدائی ایام ہی سے آغاز ہو گیا تھا۔

غیر ملکی کنٹرول سے آزاد رہنے کے لیے جاپانی معیشت کے نمائندہ اداروں یعنی تجارتی مفادات پر مشتمل فرموں اور بینکوں کے درمیان قریبی رابطہ ہو گیا تھا۔ ہنرمند محنت کشوں اور منتظموں کو عمر بھر کے لئے ملازمت کی فراہمی منتظموں کی سنیارٹی کی بنیاد پر ترقی، منافعے کو بانٹنے کا نظام کہ جس نے مالکوں اور ملازموں کو ایک بندھن میں باندھ دیا۔ کئی بڑی چھوٹی اور درمیانے

درجے کی فرموں میں کاروباری یگانگت نے قوم پرستی کو بہت ہی مضبوط بنیاد فراہم کر دی جس کی وجہ سے جاپانی حکمران طبقے یعنی سابقہ سمورائی افراد اور بہت سے تاجر خاندانوں اور متمول کاشتکاروں میں اتحاد پیدا ہوا جو غیر ملکیوں کے لیے سدِ راہ ثابت ہوا۔ لیکن یہ تمام مخصوص ادارے مخصوص حالات کی پیداوار تھے جو کہ جاپانی تاریخ کے زمانہ بعد از میجی انقلاب کے دوران وقوع پذیر ہو گئے تھے۔(Watarabe 1987; Wan 1988)

معیشت کی ترقی اور اپنی فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کے لیے جاپانی حکومت نے مسلسل اور انتھک محنت کو تیز تر کر دیا لہٰذا ریلوے پر سرمایہ کاری کر کے اسے ترقی دی گئی ٹیلی گراف کی لائنیں بچھائی گئیں۔ بندرگاہیں اور جہازوں کے لیے گودیاں تعمیر کی گئیں اور بحریہ کے لیے سہولتوں کو مہیا کیا گیا۔ علاوہ ازیں بنیادی نوعیت کی فیکٹریاں تعمیر کی گئیں۔ اس ضمن میں بنائی جانے والی جہازوں کی گودیاں اور فیکٹریاں جو کہ ریاستی سرمایہ کاری کا نتیجہ تھیں لیکن ازاں بعد انہیں نجی شعبہ میں دے دیا گیا ان اداروں نے جاپانی ورکروں، ٹیکنالوجسٹوں، منتظموں کے لیے تربیت گاہ کا کردار ادا کیا اور غیر ملکی تیکنیک اور انتظامی طریقہ ہائے کار کو مقامی ضروریات اور حالات کے مطابق ڈھالنے کی جانب پیش رفت کا اہم ترین سبب بنے۔

کیپیٹل گڈز انڈسٹریز اور اسلحہ سازی کے لیے فیکٹریوں کی تعمیر اور ترقی میں سرکار کی مسلسل دلچسپی نیز جنگ میں بارہا ملوث ہونے کے باعث (جس کا آغاز 95-1894ء میں چین اور جاپان کی لڑائی سے ہوا تھا) حکومت اور بزنس سے متعلق نجی اداروں اور افراد میں قریبی تعاون دیکھنے میں آیا۔ یہ تعاون جاپان کی تاریخ کے سب سے جنگجویانہ عہد یعنی 1931ء تا 1945ء میں اور زیادہ واضح شکل اختیار کر گیا۔ تجارتی مراکز اور بینکوں کے درمیان قریبی روابط جاپان میں صنعت کاری کے زمانہ آغاز ہی سے قائم ہو چکے تھے۔ تجارتی فرموں نے بینک قائم کرنے شروع کیے تاکہ انہیں تجارتی مقاصد کے لیے سرمایہ فراہم ہو سکے اور لمبے دورانیے میں منافع دینے والے منصوبہ جات کے لیے سرمایہ مہیا کرنے کا یہ موثر طریقہ تھا (Yamamura 1972:1978)

اسی طرح منافع کی مساویانہ تقسیم پر مبنی نظام اور مختلف سطحوں پر انتظامی عہدیداروں اور باہنر

ورکروں کی تنخواہوں میں بہت کم فرق نے جو کہ صنعتی عمل کے ابتدائی مراحل میں تربیت یافتہ افرادی قوت کی کمی کا نتیجہ تھا اور ایسے معاشرے صحیح سمت دی کہ جہاں فرض اور ریاست کی جانب ذمہ داری کے احساسات کافی اثر رکھتے تھے اور وہاں پر بڑی تنخواہیں دینا منفی اثرات مرتب کرسکتا تھا۔ (Taira 1978 Morishima 1982; Chapters 3-4) جہاں تک عمر بھر کے لیے ملازمتوں کی فراہمی کے نظام کا تعلق ہے کیونکہ جاپان مین بڑی انٹر پرائزز کے ملازموں کی ایک تہائی اس نظام سے مستفیض ہوتے ہیں یہ نظام لیبر کی شدید کمی (Obsentuism) غیر حاضریت اور پہلی جنگ کے دوران اور 1920ء کے دہائی کے دنوں میں پروان چڑھا تھا۔ یہ ادارے جہاں دانستہ طور پر ایسی انتظامی حکمت عملی وضع کی گئی تا کہ کمپنی یا پلانٹ کی سطح پر ٹریڈ یونین بنا کر ورکروں کی وفاداری کو جیتا جا سکے غیر معمولی طور پر مضبوط ہوئے۔ اس طرح کی ٹریڈ یونینیں جاپان میں بعداز جنگ عظیم دوئم امریکی قابض انتظامیہ کی طرف سے ورکروں کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کے نتیجے میں مزید مضبوط ہوئیں۔ (Taira 1978; Bagchi 1987)

ان سالوں کے دوران جب جاپان یکطرفہ معاہدوں کی زد میں تھا اس کے باوجود اس نے غیر ملکی سرمایے اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کو ملکی سرحدوں سے باہر ہی رکھا۔ وحشیوں سے ہنر سیکھنے کا شدید عزم رکھتے ہوئے جاپانی حکومت نے اسی لمحے غیر ملکی ماہرین کو فارغ کر دیا جب ان سے مخصوص ہنر اور مہارت حاصل کر لی گئی مزید یہ کہ کسی بھی سیکٹر میں غیر ملکی سرمایہ کاروں یا فرموں کو قدم جمانے کی اجازت نہ دی گئی۔ جاپان کی جانب سے برآمدات بڑھانے کی تحریک کے پس منظر میں یہ ارادہ کارفرما تھا کہ غیر ملکی سرمایے پر تکیہ کرنے سے گریز کیا جائے اور ساتھ ہی غیر ملکی سیاسی کنٹرول سے بھی جو غیر ملکی سرمایے کے نتیجے میں اس پر قائم ہوجاتا ہے۔ اس سے جاپان کے نیشنلزم کی قوت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امریکی افواج کے قابض ہونے کے باوجود جاپان نے ان پالیسیوں کو جاری رکھا۔

معاشرے اور معیشت کے ان شاندار پہلوؤں کے باوجود جاپانی معجزہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہی رونما ہوسکا۔ اس معجزے کے حقیقت بننے کے پیچھے دراصل وہ نہایت ہی جامع زرعی

اصلاحات تھیں جو کہ امریکیوں کی نگرانی میں کی گئیں۔ اگر چہ 1922ء کے بعد جاپان میں کئی مرتبہ یہ کوشش کی گئی کہ مزارعین کی حالتِ زار کو سدھارا جائے اور زرعی اراضی کو نئے سرے سے تقسیم کیا جائے لیکن ایک حد سے زیادہ زرعی اراضی کے حقوق ملکیت رکھنے والے زمینداروں کی اراضی کو بحقِ سرکار ضبط کر لینے یا اس کی فروخت کو ممکن بنانے کے لیے کسی بھی ضابطے کی عدم موجودگی کے باعث ایسی تمام کوششیں ناکامی سے دوچار ہوئیں۔(Ladejinsky 1947;87)۔ دسمبر 1945ء میں شکست خوردہ جاپانی حکومت نے ڈائٹ (Diet) کے سامنے زرعی اصلاحات کا قانون پیش کیا جس کے تحت زمیندار 5 ہیکٹر تک اراضی اپنے پاس رکھ سکتے تھے مزید برآں اسی قانون کے تحت 40 فیصد اراضی کہ جس پر مزارعین کام کرتے تھے واگذار کرا دی گئی اور سابقہ مزارعوں کو اس کے حقوق ملکیت دے دیئے گئے (Dore 1959; Tadashi 1967) قابض انتظامیہ نے اگلے سال ان سے بھی کہیں زیادہ انقلابی اصلاحات پر مبنی قانون متعارف کروایا جسے 'دوسرا زرعی اصلاحات کا قانون' کہا گیا۔ اس قانون نے جن اصولوں کو لاگو کیا ان میں 1- غیر حاضر زمینداروں کی تمام اراضی سرکار خریدے گی۔ 2- حاضر زمینداروں کی ایسی اراضی جس پر مزارعے کام کرتے ہوں اگر ایک چو (Cho) یعنی 2.5 ایکڑ سے زیادہ ہو یا ہوکیڈو (Hokkaido) میں چار چو (Cho) سے زیادہ ہو تو اسے حکومت خریدے گی 3- اس تمام اراضی کو ایسے بانڈز کے عوض خریدا جائے گا جن پر 3.6 فیصد سود ادا کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن یہ بانڈز 30 برس بعد ہی بھنوائے جاسکتے تھے ہاں بانڈ بھنواتے وقت کچھ نقد رقم ضرور ادا کی جائے گی۔ (Tsuru 1993:21) درحقیقت یہ زرعی اصلاحات بحق سرکار اراضی کو ضبط کر لینے ہی کے مترادف تھیں۔ اس اقدام نے دیہات میں زمینداروں کی طاقت کو کچل کر رکھ دیا اور زائد دیہی لیبر (Surplus rural labour) کو غیر زرعی ملازمت سے چھٹکارا دلا دیا چنانچہ 1950ء میں مثالی ترقی کی شرح تبھی ممکن ہوسکی۔

قابض انتظامیہ نے جاپان میں اور بھی کئی طرح کی اصلاحات رائج کیں یعنی سول سروس' لیبر اور انڈسٹریل ریلیشن (جن کا ہم نے پہلے تذکرہ کیا ہے) آئینی ضوابط اور مغربی طرز

جمہوریت کے رسمی قیام کے لیے ضروری ادارے وغیرہ (Tsuru 1993:185). قابض انتظامیہ نے پہلے پہل تو زائی باٹسو (Zaibatsu) کو توڑ دینا چاہا کیونکہ وہ ایسے اداروں کو جارحیت اور جنگجوانہ رجحانات کا منبع تصور کرتے تھے۔ بہرحال اہم بات تو یہی ہے کہ ہرلحاظ سے جاپانی طبقہ امراء ان اصلاحات کو جو کہ دراصل مغربی ماہرین کا شاخسانہ تھیں اپنے معروضی حالات کی روشنی میں ڈھالنے میں کامیاب رہے۔ یہ امر اس وقت اور بھی سہل ہو گیا جب امریکی کوریا کی جنگ میں ملوث ہو گئے اور ایشیاء میں کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے جاپان کو اپنا مرکز بنالیا اس مقصد کے حصول کے لیے امریکیوں نے یہ ضروری خیال کیا کہ جاپان کی معیشت کو کمزور ہونے سے بچانے کی ہرممکن کوشش کی جائے بلکہ اسے جہاں تک ممکن ہو مضبوط بنایا جائے۔

جاپانیوں کی اپنی شکست کو ایک نادر موقع کی صورت میں تبدیل کرنے کی اہلیت قابض انتظامیہ کی طرف سے (Zaibatsu) زائی بٹسو کے ختم کردینے کے بعد پیدا ہوئی جب زائی بٹسو گروپوں کے ڈائریکٹروں اور کنٹرولروں کو ہٹا دیا گیا اور درمیانی درجے کی کمپنیوں کے منتظمین کو کسی پیشگی تیاری کے بغیر ہی ترقی کی بلندیوں پر فائز کر دیا گیا۔ ان نوجوان مینجرز نے اپنے دوستوں کی کمپنیوں کو اپنی کمپنیوں کے شیئرز دے کر ان کی حمایت حاصل کر لی اور اپنی پوزیشنوں کو مستحکم بنالیا۔ لیکن یہ نئے شیئر ہولڈرز غریب تھے کیونکہ وہ درمیانہ درجے کی انتظامی پوزیشن سے یکدم ترقی کے اونچے زینے تک جا پہنچے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس طاقت کو اپنے مفاد میں بہترین انداز میں استعمال کیا جو کہ انہیں حاصل ہونے والی نئی پوزیشن نے عطا کی تھی اور ایک نئے نظام کی بنیاد رکھی۔ ان پرولتاری مینجرز کے باہمی تعاون سے ہی یہ نظام تشکیل پا سکا۔
(Marishima, 1995:151-2)

اسی طرح مختلف فرموں کے ڈائریکٹروں کہ جن میں تجارتی بھی تھیں اور صنعتی بھی ایک دوسرے سے قریبی تعلق قائم کیا نیز بینکوں سے بھی ان کے ایسے روابط تھے جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی نگرانی بھی کیا کرتے تھے۔ اس طرح کیریتسو (Keiretsu) فرموں میں ایک نئی طرح کے تعلق نے جنم لیا۔ جس سے تجارتی و صنعتی فرمیں اپنے حریف اداروں کی طرف سے قبضہ کرنے

کے کسی بھی خطرے سے محفوظ ہوگئیں بلکہ انہیں سرمایہ کی کمی یا مالی مشکلات سے بھی نجات مل گئی۔
مختلف فرموں کے باہمی روابط اور تعلقات' فرموں کی انتظامیہ اور محنت کشوں میں منافع کو آپس میں بانٹ لینے کا جو نظام وجود میں آ گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ فرموں کی طرف سے ملازمین کو نوکری سے فارغ کرنے سے احتراز ایسے عوامل تھے کہ جن کے سبب انتظامیہ اور مزدوروں میں تعاون کی فضا قائم ہوئی اور اس طرح کی اقتصادی فضاء دیگر ترقی یافتہ ممالک کے لیے قابل رشک تھی۔(Aoki 1987, Koike 1987; Ito 1993: Chapter 7) اس طرح کی زرعی لیبر اور منڈی سے متعلق اصلاحات نے مساویانہ بنیادوں پر انتظامیہ اور لیبر میں آمدنی کی تقسیم کو ممکن بنا دیا اور گھریلو منڈی کو بھی وسعت دی (Minami 1998) انتظامیہ اور مزدوروں میں آمدنی کی نسبتاً مساویانہ تقسیم اور فرموں کے مارکیٹ شیئرز میں اضافے کی کوشش نے جاپان کی گھریلو منڈی کو ترقی دی جس سے جاپانی فرمیں برآمدی منڈی میں دیگر معیشتوں کی بہت ہی مضبوط حریف بن کر ابھریں۔ یورپی اور امریکی منڈیوں میں غیر ملکی مصنوعات کی قبولیت نے جاپانی صنعتی وتجارتی ترقی کو مزید تحریک دی۔ علاوہ ازیں دفاعی اخراجات کے بوجھ کے ہٹ جانے سے جاپانی وسائل کو سویلین استعمال کی اشیاء کی پیدائش پر خرچ کیا جانے لگا اور تمام تر ایجادات و اختراعات بھی اس قسم کی اشیاء کی تخلیق و ترقی کے لیے استعمال ہوئیں۔

جاپان کی پختگی کو پہنچی ہوئی روبہ ترقی ریاست بعد از جنگ (عظیم دوئم) کی پیش رفت تھی اور وہ معجزہ بھی جو جاپان نے ترقی کی بے مثال داستان رقم کر کے ممکن بنا دیا۔ اس ریاست کو اپنی جدید تاریخ کے دوران صرف 1980ء کی دہائی کے آخری ایام میں بحران کا سامنا کرنا پڑا اس بحران کے باوجود روبہ ترقی ریاست نے جاپان کو دنیا بھر کی دوسری سب سے بڑی صنعتی قوت بنا دیا صرف یہی نہیں بلکہ جاپانی عوام کو ایسا معیار زندگی دیا جو کہ مغربی یورپ کے ممالک یا پھر امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے کسی طور کم نہیں تھا۔

6- جنوبی کوریا: روبہ ترقی ریاست کی آخری سرحد

اب ہم جنوبی کوریا پر توجہ کرتے ہیں جسے کہ حالیہ تحریروں میں چار ایسی جنوب مشرقی ایشیاء کی

ریاستوں میں سے ایک کہا گیا ہے جو ایشین ٹائیگرز کہلائی جاتی ہیں۔ جنوبی کوریا ان رو بہ ترقی ریاستوں سے کہ جن کا ہم اوپر تذکرہ کر آئے ہیں دو طرح سے مختلف ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک استعماری طاقت کی سابقہ نو آبادی ہے اور دوسرا یہ کہ اس کی بے مثال ترقی بعداز جنگ (عظیم دوئم) ہی کی پیش رفت ہے۔ اس سے پہلے نیدرلینڈز سپین کی نو آبادی رہا لیکن اصل حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اس دوران ہوئی رومن ایمپائر کا حصہ تھا اور اس کی حکومتی و انتظامی ذمہ داری اس کی اپنی ہی تھی۔ لیکن کوریا تو ہر طور پر جاپان کے ماتحت تھا اور رو بہ ترقی ریاست کے طور پر اس کے پروان چڑھنے کے لیے خصوصی جغرافیائی و سیاسی حالات درکار تھے۔

بعض دفعہ یہ دلیل دی جاتی ہے خاص طور پر بعض جاپانی اور امریکی سکالروں کی طرف سے یہ اصرار کیا جاتا ہے کہ کوریا میں بعداز جنگ ہونے والی ترقی کی بنیاد دراصل جاپانی نو آبادیاتی عہد میں رکھی گئی اور کورین ترقی کو جاپانی نو آبادیاتی عہد کے بعد سے ایک جاری عمل کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

(cf. Fei, Ohkawa, and Ranis 1985; Kikuchi and hayami 1985)

بہرحال یہ حقیقت بھی ہے کہ جاپانی نو آبادیاتی عہد کے دوران کورین ترقی دیگر غیر سفید نو آبادیوں کی نسبت تو خاص معقول رفتار سے ہوتی رہی لیکن یہ ترقی اس قدر محیر العقول ہرگز نہ تھی اور اس ترقی کے باوجود کوریا کے عوام کی اکثریت افلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے

(Ladejinsky 1940 Woo 1991 Chapter 2)

الیس ایمسڈن (1987, 1989 Chapter 1) نے اپنی معرکہ آرا کتاب میں یہ رقم کیا ہے کہ جنوبی کوریا اور دوسرے دیر سے صنعتکاری کی صف میں شامل ہونے والے ممالک میں ایک مخصوص قدر مشترک ہے یہاں بھی صنعتکاری کا عمل دوسرے ممالک سے سیکھ کر ہی تکمیل کو پہنچایا گیا نہ کہ اس کی بنیاد مقامی اختراعات تھیں جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں کامیاب رو بہ ترقی ریاست کی ایک نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے سیکھنے کی اہلیت ہوتی ہے۔ سترہویں صدی کے دوران یورپ میں ہالینڈ کے اعلیٰ تر بحری قوت کے طور پر ظہور پذیر ہونے میں مقامی سطح پر ہونے والی اختراعات یا ایجادات کا کوئی خاص دخل نہ تھا البتہ بحری جہازوں کے بنانے میں وہاں مقامی ہنرمندی کا

استعمال کیا گیا تھا۔ ایمسڈن کے معیار کو سامنے رکھتے ہوئے اگر جاپان کا بطور دیر سے صنعتکاری کے عمل کی شروعات کرنے والے ملک کی حیثیت جائزہ لیا جائے تو وہاں پر خود کار لوموں (Looms) کی ایجاد جنگ عظیم دوئم سے پہلے ہی ہو چکی تھی اور 1960ء کے بعد سے مختلف اشیاء کی پیدائش کے عمل میں مائیکرو الیکٹرونکس ٹکنالوجی سمیت کئی ایک جدتیں بروئے کار لائیں گئی ہیں۔ مزید برآں انتظامی طریقہ ہائے کار میں وہ تمام جدتیں جو جاپان میں داخلی طور پر وقوع پذیر ہوئیں ایمسڈن نے ان سے صرف نظر کیا ہے۔

جاپان نے 1910ء میں کوریا پر رسمی طور پر قبضہ کر لیا تھا۔ تب اسے چاولوں کی رسد کے مرکز کے طور پر ترقی دی گئی۔ جاپانی حکومت نے اپنی فوج اور پولیس کو کسانوں کی کسی بھی تحریک کو ابھرنے سے روکنے کے لیے متعین کیا اور انہی اداروں کے ذریعے سے زرعی اراضی کی رجسٹریشن اور Cadastral سروے کا آغاز کیا۔ اسی اثنا میں وہ کورین جو اپنی ملکیت اراضی ثابت نہ کر سکے انہیں بیدخل کر دیا گیا اور وہ زمین جاپانی کمپنیوں اور افراد یا پھر جاپانی سرکار کی تحویل میں چلی گئی۔ اس کے علاوہ جاپانیوں نے کوریا کے وسائل کو اپنی ترقی و فلاح کی خاطر استعمال کرنے کے لیے اورینٹل ڈیولپمنٹ کمپنی کے نام سے ایک ادارہ قائم کر دیا اور اس کے ساتھ ہی کارپوریشن لاء جیسا ایک قانون بھی وضع کر لیا جس کے تحت نوآبادیاتی حکومت کو کوریا میں نئے یا پرانے کاروباروں کو کنٹرول کرنے یا پھر انہیں ختم کر دینے کا اختیار حاصل ہو گیا (Woo 1991:22) 1919ء تک جو بھی صنعتیں نوآبادیاتی کوریا میں پھلی پھولیں وہ زیادہ تر گھریلو نوعیت کی تھیں جنہیں کمپنی رجسٹریشن کی ضرورت نہ تھی ایسی بڑے پیمانے کی کمپنیاں جن میں 50 یا 50 سے زیادہ محنت کش کام کرتے تھے ان کی تعداد 89 تھی (جن میں سے اکثریت جاپانیوں کی ملکیت تھیں) حتیٰ کہ 1922ء تک کوریا میں اسی انداز سے کام چلتا رہا (Ibid. 23)۔ 1929ء میں مینوفیکچرنگ (Manufacturing) کے شعبہ میں 63.5 فیصد اشیائے خوردنی تیار ہوتی تھیں اس کے بعد ٹیکسٹائل کا نمبر آتا تھا جن کا تناسب 10.9 فیصد تھا۔ (Ibid. 24)

جب جاپان نے منچوریا اور باقیماندہ چین کو فتح کرنے کی کوشش کی تو جاپانی حکومت اور

فنانشیل واندسٹریل کمپنیوں نے کوریا کو جنگ کی سپلائی بیس (Supply Base) میں منتقل کرنا چاہا۔ دی بینک آف چوزن (The Bank of Chosen) جو کہ کوریا مرکزی بینک کا درجہ رکھتا تھا۔ دی اورینٹل ڈیویلپمنٹ کمپنی دی ڈائی اچی بینک (The Dai Ichi Bank) اور دی انڈسٹریل بینک آف جاپان نے ڈیویلپمنٹ کارپوریشنوں اور زائی بیٹسو (Zaibatsu) کو طویل دورانیے کے قرضے فراہم کیے تاکہ کوریا میں ہائیڈروالیکٹرک پاور اسٹیشن، سٹیل ملیں، ہیوی مشینری ورکس اور کیمیکل فیکٹریاں قائم کی جاسکیں۔ اس پالیسی نے بھاری صنعتوں کو چند ایک زائی بیٹسو کے ہاتھوں میں مرتکز کر دیا۔ 1945ء تک واحد زائی بیٹسو جو کہ ناگوچی جن کے کنٹرول میں تھی کوریا میں براہ راست جاپانی سرمایہ کاری کے 35 فیصد پر متصرف تھی۔ (Ibid. 35)۔ 1945ء تک کوریا میں تمام صنعتی انٹرپرائزز کے اداشدہ سرمایے کا 81.7 فیصد جاپانی ملکیت میں تھا جس کا بہت بڑا تناسب زائی بیٹسو کے ہاتھوں میں تھا۔ کیمیکل انڈسٹری کا 97 فیصد دھات اور مشینری کا 93 فیصد اور سیمنٹ کا 97 فیصد جاپانی ملکیت میں تھا حتیٰ کہ ہلکی صنعتوں میں یعنی ٹیکسٹائل اور فلور ملوں میں بھی جاپانی ملکیت کا تناسب بالترتیب 80 فیصد اور 81 فیصد تھا (Ibid. 40)

جاپانیوں کے ترقیاتی یا پھر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ استحصالی پروگراموں کے تحت کورین نوآبادی میں زرعی فارموں کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہوا خاص طور پر چاول اگانے میں کوریا میں حیران کن حد تک ترقی دیکھنے میں آئی اور اس کے ساتھ ساتھ ایسے کسانوں میں بھی کمی ہوئی جو ملکیت اراضی سے محروم تھے نیز مزارعیت کی بھی نمایاں طور پر حوصلہ شکنی ہوئی۔ ایک اندازے کے مطابق 1914ء تک کوریا میں کل کاشتکار گھرانے 2.59 ملین تھے جن میں سے 0.57 ملین ملکیت اراضی کے حامل کاشتکار تھے 1.07 ملین جزوی ملکیت اور جزوی مزارعیت رکھتے تھے۔ جبکہ 0.91 ملین کلی طور پر مزارعے تھے۔ 1938ء تک ملکیت اراضی رکھنے والے کاشتکاروں کے ساتھ ساتھ جزوی مزارعیت اور جزوی ملکیت کے حامل گھرانے کم ہو کر بالترتیب 0.54 ملین اور 0.81 ملین تک رہ گئے جبکہ وہ گھرانے جن کا انحصار جزوی مزارعیت پر تھا ان کی تعداد بڑھ کر 1.51 ملین تک جا پہنچی (یہ بیان تضاد زدہ ہے کیونکہ اسی کے پہلے حصے میں جزوی مزارعیت کے حامل گھرانوں کی

تعداد کے کم ہو جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مترجم)(Ladejinsky 1940:50) ایک اندازے کے مطابق 1930ء کے اختتامی دنوں تک کورین نوآبادی کی 11 فیصد قابل ٹیکس زمین جو کہ 1.5 ملین ایکڑ بنتی تھی جاپانیوں کی ملکیت تھی۔(Ibid. p.51) اور جب جاپانیوں کو دوسری جنگ عظیم میں شکست ہوئی اس وقت تک جاپانی افراد اور کمپنیاں 13 سے 15 فیصد قابل کاشت زمین پر متصرف تھے(Choudhury and Islam 1993:62)

جاپانی جائیداد کی ضبطی کے بعد یکدم صنعتی اثاثہ جات کا بہت بڑا حصہ کوریا کی آزادی کے بعد جاپانی نوآبادیاتی راج کی جانشین حکومت کو ورثے میں ملا نہ صرف یہ بلکہ قابل کاشت زرعی اراضی کا بہت بڑا حصہ بھی جو کہ کورین کاشتکاروں اور کسانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ امریکی ارباب انتظام اور کوریائی حکومت نے اس اندیشے کے پیش نظر کہ کسان بغاوت نہ برپا کر دیں اور وہاں چین کی طرح کمیونسٹ انقلاب نہ آ جائے زرعی اصلاحات متعارف کروا دیں۔ مزید برآں کوریا میں قوم پرستانہ اور بائیں بازو کی بہت مضبوط تحریکیں ابھری ہوئی تھیں جو کہ جاپانیوں اور کورین جاگیرداری نظام کا خاتمہ چاہتی تھیں اور ان تحریکوں کے سرکردہ رہنماء کوریائی جاگیرداروں کو نوآبادیاتی طاقت کا ہمنوا اور حاشیہ بردار سمجھتے تھے۔ اس وقت جب جنوبی کوریا والوں کا مختصر مدت کے لیے شمالی کوریا پر بھی بس چلتا تھا اور کورین جنگ ابھی نہیں ہوئی تھی تو جنوبی کوریا والوں ہی کی تحریک پر شمالی کوریا میں بھی جاگیرداری نظام کو ختم کر دیا گیا(Cumings 1987:66) کوریا میں متعارف کی جانے والی زرعی اصلاحات بالکل اسی طرح کی تھیں جیسی کہ جاپان میں نافذ کی گئیں تھیں جن کے تحت حکومت کو غیر حاضر زمینداروں کی ملکیت میں ایسی اراضی جو کاشت نہ کی جا رہی تھی خریدنے کا اختیار دے دیا گیا اور اس زمین کے کچھ حصے کو ٹھیکے پر دے دیا گیا۔ ہر کاشتکار گھرانے کے پاس 3 ہیکٹر زمین ہی رہنے دی گئی اس سے زائد اراضی سرکار کی ملکیت میں لے لی گئی اور بعدازاں مزارعوں یا بے زمین کسانوں میں بانٹ دی گئی البتہ حد ملکیت تین ہیکٹر سے کم رکھی گئی۔ یہ زمین مزارعوں یا کسانوں کو آسان شرائط پر فروخت کی گئی تھی ;Lee 1979) Choudhury and Islam 1993:62-3) زرعی اصلاحات کے اس عمل کے نتیجے میں جو

1947ء سے 1965ء تک کی مدت کے دوران تواتر سے جاری رہا کلی حیثیت میں مالکان اراضی 16.5 فیصد سے بڑھ کر 69.5 فیصد ہو گئے اور کلی حیثیت میں مزارعین کی تعداد 42.1 فیصد سے کم ہو کر صرف 7.0 فیصد تک رہ گئی۔ اسی طرح ایسے کاشتکاروں کی تعداد کہ جن کی ملکیت میں تین ہیکٹروں سے زیادہ اراضی تھی ان کی تعداد 1947ء میں 31,000 تھی جو کہ 1965ء تک محض 3,000 رہ گئی جبکہ ایسے کاشتکار جن کی ملکیت میں 0.5 سے ایک ہیکٹر سے بھی کم اراضی تھی وہ 1,619,000 سے بڑھ کر 1,780,000 ہو گئی اور ایسے ہی 3 ہیکٹر سے کم ملکیت اراضی رکھنے والوں کی تعداد اس مدت میں قدرے کمی آ گئی (Lee 1979:26) یہ اعداد و شمار کوریا میں بہت ہی کم فی کس زرعی اراضی کی غمازی کرتے ہیں۔

کسانوں کے حق میں کی جانے والی ان اصلاحات سے دیہی آمدنیوں اور اثاثہ جات میں کچھ مساوات آ گئی اور 1963ء کے بعد تو ان میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ خاص طور پر 1970ء کی دہائی میں یہ اضافہ عمودی سمت میں بڑھتا چلا گیا(Ibid) اور زمین سے ہونے والی پیداوار کے اصل عاملین (جو کہ کسان اور کھیت مزدور ہوتے ہیں) کو تحفظ دیا گیا اور زرعی زمین کے اس کردار کا خاتمہ ہوا جو کہ کسانوں کو کمتر درجے اور ماتحت حیثیت میں زندگی گزارنے کا موجب تھا۔ جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہوا تو یہ ایک اہم ترین پہلو تھا جو کہ روبہ ترقی ریاست کی بنیادی شرط تھی۔

جنوبی کوریا نے روبہ ترقی ریاست کی ایک اور اہم شرط بھی پوری کر دی اور یہ شرط ایک مضبوط مگر حقیقت پسندی پر مبنی قومیت پرستی کا جذبہ تھا۔ سائنگمین رائی (Syngman Rhee) جو کہ جنوبی کوریا میں 1940ء کی دہائی سے لے کر 1960ء تک آمر حکمران رہا طلباء کی طرف سے برپا کی گئی بغاوت کے نتیجے میں زوال کا شکار ہوا۔ اس دوران فوج نے طلباء کے خلاف کاروائی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ رائی مکمل طور پر امریکی معاشی و فوجی امداد پر انحصار کرتا تھا۔ امریکی امداد کے حصول کے لیے وہ امریکی خوف کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتا رہا جو کہ امریکہ کو وہاں کمیونزم کے ابھر آنے کے خدشے سے لاحق تھا مزید یہ کہ رائی بارہا شمالی کوریا پر حملہ آور ہو کر امریکہ کو ایک طویل جنگ میں دھکیلنے کے عزم کا بھی اظہار کرتا رہتا تھا اس طرح وہ امریکی امداد

حاصل کرتا رہا اور ساتھ ہی امریکہ کی جنوبی کوریا سے متعلق داخلی پالیسیوں کے عملی اظہار کی راہ میں بھی رکاوٹ بنا رہا۔ (Haggard 1990:54-61; Woo 1991: Chapter 3)۔ اس نے امریکیوں کی ریاستی ملکیت میں اثاثہ جات کی نجکاری کی کوشش کو پورا نہ ہونے دیا اور اس کے ساتھ ساتھ غیر ملکی تجارت کو آزاد کرنے کی امریکی کوشش کو بھی ناکامی سے دوچار کر دیا وگرنہ جنوبی کوریا اسی حالت کو لوٹ جاتا جو جنگ عظیم دوئم سے قبل اس کی تھی یعنی وہ محض زرعی اجناس کا فراہم کنندہ تھا اور وہ ایسٹ ایشین بین الاقوامی تقسیم محنت کا ادنیٰ سا رکن تھا جبکہ جاپان کو اس تمام تر علاقائی و معاشی انتظام میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ 1950ء کی دہائی کے دوران رائی کی حکومت نے اپنی زیر نگرانی درآمدی متبادلات (Import Substitution) کی پالیسی بنائی اور بہت ہی معقول شرح ترقی (4.5% سالانہ جی ڈی پی) کے ساتھ جنوبی کوریا آگے کی طرف بڑھنے لگا۔

رائی کے زمانے کی ایک اور خاص بات تعلیم کی ترویج ہے۔ جاپانی نوآبادیاتی دور میں شرح خواندگی بہت ہی کم تھی لیکن 1960ء تک 71 فیصد لوگ خواندہ ہو چکے تھے اور 1980ء تک جنوبی کوریا میں شرح خواندگی 92 فیصد تک جا پہنچی۔ (Chaudhaury and Islam 1993:152) کوریا کی جنگ کے زمانے میں امریکی امداد اور امریکی جنگی کوششوں کے دوران اس کی سپلائی لائن کو برقرار رکھنے میں اس کی معاونت مزید برآں اس پورے خطے میں امریکی فوج کی موجودگی کو سہل بنانے کی کوریائی کوشش کے باعث وسائل کی کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل پر قابو پانے میں اسے مدد ملی اور غیر ملکی تکنیک و ہنرمندی سے بھی کوریائی افرادی قوت کو آراستہ ہونے کا موقع ملا۔ (Mason et al., 1980:165; Bagchi 1987:33-35) لیکن ابھی بھی امریکی سرمایے اور امریکی منڈیوں تک جنوبی کوریا کی رسائی کو ممکن بنانے کے لیے قومی جدوجہد اور حکمت عملیوں میں تال میل کی سخت ضرورت تھی خاص طور پر 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں۔

1960ء کی دہائی میں جنوبی کوریا کی اقتصادی پالیسی کو برآمدات کی طرف مائل پالیسی کا نام دیا جاتا ہے (e.g., Haggard 1990: Chap.3) یہ دراصل ایک مربوط منصوبہ بندی اور

زیادہ قومی قوت کے حصول کے لیے جدوجہد سے عبارت پالیسی تھی جس کی شروعات 1950ء کی دہائی میں ہو چکی تھی۔ قومی منصوبہ بندی کا ایک ادارہ 1958ء میں قائم کر دیا گیا تھا اور چانگ میان کی مختصر مدت کے لیے قائم ہونے والی حکومت نے ایک پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ بھی وضع کر دیا تھا۔ اس منصوبہ سازی کو مزید موثر اس وقت بنایا گیا جب پارک حکومت نے اقتصادی منصوبہ بندی بورڈ بنایا جس نے وزارت خزانہ سے بیورو آف بجٹ کو اپنی نگرانی میں لے لیا جبکہ بیورو آف سٹیٹسٹکس کو بھی امور داخلہ کی وزارت سے علیحدہ کر کے اقتصادی منصوبہ بندی بورڈ کا حصہ بنا دیا۔ اقتصادی منصوبہ بندی بورڈ کے سربراہ کو نائب وزیراعظم کا عہدہ دے دیا گیا (Jones and Sakong 1980:46-8, and Bagchi 1987:36) چونکہ کوریا کو ادائیگیوں کے عدم توازن کا شدید مسئلہ درپیش تھا جسے حل کرنے کے لیے اس نے برآمدات پر خاصا زور دیا تا کہ امریکی حکومت سے خودمختاری حاصل کی جا سکے جو کہ امداد کا واحد ذریعہ تھی۔ برآمدات کو بڑھانے کی غرض سے وضع کی جانے والی پالیسی پر عمل درآمد دراصل 1950ء کی دہائی میں شروع کر دیا گیا تھا جب ٹیکسٹائل کی صنعت کے ساتھ ساتھ دوسری ہلکی صنعتوں کی افزائش کا اہتمام کیا گیا۔ 1950ء ہی کی دہائی کے دوران کوریا میں جنوبی کوریا کی چائی بول (Chaebol) تنظیموں کا ظہور ہوا جو کہ جاپانی زائی بیٹسو سے ملتی جلتی تھیں۔ پارک کی حکومت نے قومی وسائل کو اکٹھا کرنے کی غرض سے نظم وضبط متعارف کروایا اور ٹیکسوں کے نادہندہ بزنس مینوں کو گرفتار کر لیا۔ بعد میں انہیں اس شرط پر آزاد کیا گیا کہ وہ ان شعبہ جات میں سرمایہ کاری کریں گے جن کی نشاندہی حکومت کرے گی۔ اسی اثناء میں حکومت نے تمام کمرشل بینکوں کو قومیا لیا (جو کہ اس سے پہلے امریکی دباؤ میں آ کر جزوی طور پر نجی شعبے کو دے دیئے گئے تھے) اور زرمبادلہ کے تمام ذخائر کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا تا کہ ان کا استعمال حکومت کی مرضی سے ہو۔
(Bagchi 1987:36-8; Dreze and Sen 1989:193-7; Woo 1991: chapter 4-5)

حالانکہ برآمد کنندگان کو زرمبادلہ ترجیحی بنیادوں پر فراہم کیا جاتا تھا لیکن قیمتوں کا نظام

برآمدات کے لیے موافق نہ تھا(Bagchi 1987:38-40) جو عناصر برآمدات کی حوصلہ افزائی کے لیے معاون ثابت ہوئے وہ پیداوار اور افرادی قوت کے تعلیم یافتہ ہونے کے باعث پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ جس میں بہت حد تک عملی تعلیم کے ذریعے سے اور پھر استعمال کے ذریعے سے سیکھنا شامل تھا۔ اکانوی آف سکیل کے استعمال سے بڑی فرموں کو برآمدات میں اضافے کے لیے تیار کرنا بھی حکومت وقت کی معاشی پالیسی میں بہت اہم تھا۔ (Bagchi 1987:40-49) حقیقی اجرتوں میں پیداوار کے بڑھنے کے ساتھ ہونے والے اضافے کو قابو میں رکھ کر اسی طرح منافعوں میں حاصل ہونے والے شیئر (Share) میں اضافے اور اس کی بعدازاں بہت ہی سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ سرمایہ کاری نے پیداواری عمل کو آگے بڑھایا لیکن ساتھ ہی غیر مساویانہ تقسیم آمدنی کو بھی رواج دیا(Ibid., and Amsdon 1989:16-17n) یہاں پر اس فرق کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے جو کہ جاپانی اور کورین روبہ ترقی ریاستوں اور ڈچ و برطانوی روبہ ترقی ریاستوں کے درمیان بہت واضح ہے۔ جاپانی اور کورین ریاستوں نے افلاس اور غربت کا قلع قمع کرنے کے لیے قومی سوشل انشورنس یا دیگر اقدامات نہ کیے البتہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کسانوں کے لیے بہت ہی موافق زرعی اصلاحات نافذ کر کے دیہی غربت کا بہت حد تک خاتمہ کر دیا گیا اور تیز تر ترقی اور لیبر کی بڑھتی ہوئی مانگ نے ان کی حقیقی اجرتوں میں بھی اضافہ کر دیا خصوصاً باہنر افراد کی آمدنی میں تو کافی اضافہ ہوا۔

سرکار اور صنعتی فرموں کے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور صنعتی شعبے کی تشکیل نو کے باعث جس میں جہاز سازی، الیکٹرانکس، آٹو موبائلز، لوہا، فولاد اور پیٹرو کیمیکلز پر خصوصی توجہ دی گئی تھی جنوبی کوریا کو اندرون ملک سرمایہ کاری اور بچت، قومی آمدنی میں ترقی اور اپنی مصنوعات کو برآمد کرنے میں بری مدد ملی اور جنوبی کوریا اس ضمن میں دنیا کے اہم ترین ممالک کی صف میں آن کھڑا ہوا (Bagchi 1987: chapter 3, Amsden 1989: chapters 4-6) اس تمام تر عمل میں حکومت اور کاروباری حلقوں میں تعاون اور حکومت کی جانب سے سٹریٹجک بزنس سے متعلق فیصلوں کی موثر طور پر نگرانی کا بہت ہی اہم کردار رہا۔

جیسے جیسے جنوبی کوریا کے مینوفیکچرنگ سیکٹر میں ترقی ہوتی گئی اور جنوبی کوریا امریکہ کے ساتھ کاروبار کرتے ہوئے بھاری منافع جات سے مستفیض ہوا اسی تناسب سے کوریائی حکومت نے اقتصادی سرگرمیوں میں اپنا عمل دخل گھٹانا شروع کر دیا۔ غیرملکی اشیاء غیرملکی سرمایے کی اندرون ملک آمد پر رسمی پابندیاں نرم کرلی گئیں جس میں کچھ امریکی حکومت اور غیرملکی بین القومی کمپنیوں کی طرف سے ڈالے جانے والے دباؤ کا بھی دخل تھا۔

1990ء کی دہائی میں روبہ ترقی ریاست کی حیثیت سے جنوبی کوریا پختگی کی عمر کو آن پہنچی اور اس کے بعد اس پر زوال آنا شروع ہو گیا جس کی چند وجوہات تھیں۔ ان میں سے ایک تو چائی بول (Chaebol) کا کوریائی حکومت کی طرف سے بیجا چرچا پوری ریاست کیلیے نقصان دہ ثابت ہوا خاص طور پر 83-1982ء تک چائی بول کافی رواج پا چکی تھیں۔ 1980ء کی دہائی میں کئی جنوبی کوریائی ٹرانس نیشنل کارپوریشنوں (Transnational Corporations) نے کئی شاخیں اور ذیلی دفاتر دنیا بھر میں کھولنے شروع کیے۔ ان میں امریکہ، کینیڈا اور دیگر یورپی ترقی یافتہ ممالک شامل تھے۔ بعدازاں ان ترقی یافتہ ممالک نے بھی جواباً جنوبی کوریا میں آزادانہ سرمایہ کاری نیز اپنی فرموں کی تیار کردہ مصنوعات کے داخلے پر زور دینا شروع کیا۔ 1993ء تک تو جنوبی کوریا نے بھی جاپان کی طرح غیرملکی سرمایے کو اپنی حدود سے باہر ہی رکھا لیکن اس سال کے بعد سرمایے کو کوریائی حدود میں آنے کی اجازت دے دی گئی اور براہ راست سرمایہ کاری کا عمل شروع ہو گیا۔ اس طرح غیرملکی سرمایہ نے جنوبی کوریا کا رخ کیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہی دنوں جاپانی ین اور چینی یوآن کی قدر میں بہت ہی زیادہ کمی کر دی گئی جس کے نتیجے میں کورین کرنسی کی قدر زیادہ ہو گئی اور کوریا کو ادائیگیوں کے توازن میں کافی خسارہ سہنا پڑا۔ چنانچہ جنوبی کوریا کی فرموں نے بڑی مقدار میں قرضے حاصل کیے اور غیرممالک میں سود کی کم شرح سے فائدہ اٹھایا۔ جنوبی کوریا کو اقتصادی میدان میں شدید بحران کا سامنا اس وقت کرنا پڑا جب 1997ء میں وہ قرضوں کے جال میں بری طرح پھنس گیا اور اسے اس سال کے ربع آخر میں آئی ایم ایف سے مدد کی درخواست کرنا پڑی وگرنہ اس کے دیوالیہ ہو جانے کا امکان موجود تھا۔ (Bagchi 1998)

آئی ایم ایف کی عمومی شرائط نے وقتی طور پر جنوبی کوریا کے روبہ ترقی ریاست کے رتبے کو زک پہنچائی گو کہ عارضی طور پر۔

بلاشبہ زرعی بحران نے جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیاء کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے پھر بھی اس خطے کی کئی ریاستیں ابھی بھی ترقی کے سفر پر رواں دواں ہیں ان سب ریاستوں میں سے عوامی جمہوریہ چین سب سے زیادہ متحرک ہے لیکن اس ریاست پر تفصیلی اظہار خیال کے لیے ایک علیحدہ مقالے کی ضرورت ہے اب ہم روبہ ریاستوں کے زوال پر توجہ کرتے ہیں۔

7-روبہ ترقی ریاست کا ڈھلتا ہوا کردار: فنانس کا ڈیویلپمنٹ پر غلبہ

ولندیزی روبہ ترقی ریاست پہلے تو ڈولی اور پھر زوال کا شکار ہو گئی اس زوال کی کئی وجوہات کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ یعنی گھریلو منڈی کا چھوٹا سائز اجرتوں میں اس قدر اضافہ کہ اسے فوجی لحاظ سے اسکا دونوں قریبی حریفوں کے مقابلے میں ممکنہ برتری کا امکان معدوم ہو گیا اور نیدرلینڈز انگلستان اور فرانس کے ساتھ برسرپیکار ہو گیا۔ (Wilson 1939; Boxer 1973: chapter 10; De Vries 1982) لیکن تین دوسری وجوہات بھی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے اور میری دانست میں تو یہ زیادہ اہم ہیں (جو معیار ہم پہلے سے طے کر چکے ہیں اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایلزبتھ اول کے دور سے لے کر 1851ء میں کرسٹل پیلس نمائش کے انعقاد تک برطانیہ روبہ ترقی ریاست تھی اور جب یہ روبہ ترقی ریاست عہد زوال میں داخل ہوئی تو اس کی اکثر علامات وہی تھیں جو کہ زوال کا شکار ولندیزی ریاست میں بھی پائی جاتی تھیں سوائے اس کے کہ ولندیزی ریاست غیر ملکی قوت کی غلامی میں آ چکی تھی) اس ضمن میں پہلی بات تو یہ کہ ولندیزی معیشت کو بین الاقوامی تجارت میں مدغم کر دیا گیا جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ دیگر نوزائیدہ ریاستوں کے ساتھ برابری کی سطح پر مقابلہ کرنے سے قاصر ہو کر رہ گئی۔ اس کے برعکس برطانیہ، فرانس اور ولندیزوں کی دوسرے مدمقابل ریاستوں نے ماہی گیری، جہاز سازی اور مختلف النوع چھوٹی ٹیکسٹائل کی صنعتوں کو غیر ملکی مقابلہ سے تحفظ دیا اور اپنی قومی منڈیوں کو مجتمع کیا۔ ان اقدامات کا ڈچ ریاست اپنے ہاں کامیابی سے اعادہ کرنے

میں ناکام رہی ڈچ ریاست کا ایک مسئلہ اس کی عدم مرکزیت کا بھی تھا اس لیے وہ اپنی پالیسی سازی میں وحدت نہ لا سکے جبکہ برطانوی اور فرانسیسی ریاستیں کا نظام غیر معمولی طور پر مرکزیتی (Centralized) تھا۔

دوسری بات جو کہ ڈچ روبہ ترقی ریاست کے زوال کا سبب بنی نیدرلینڈز کے سماجی ڈھانچے میں درآنے والی تبدیلی تھی۔ اس تبدیلی کی وجہ جہاز رانی کے شعبے سے متعلق تھی۔ یہاں جہازوں کے مالکان جو کہ ان کے کپتان بھی ہوا کرتے تھے اب محض جہازوں کے مالکان بن کر رہ گئے اور ڈچ ارباب اقتدار کی کاہل عوام کو متحرک کرنے میں نااہلی اور ضرورت سے زیادہ شہروں میں بسی ہوئی آبادی پر مشتمل ریاست کی بڑے پیمانے پر نئے سی مین (Seamen) ڈھونڈنے میں ناکامی کے ساتھ ساتھ ڈچ بورژوا کی بہت بڑی تعداد فنانسرز (Financiers) اور رینٹیئرز (Rentiers) میں تبدیل ہوگئی جس سے ولندیزوں کی مقابلہ کرنے کی صلاحیت ماند پڑ گئی (Boxer 1973: chapter 10; Israel 1995; chapters 37-39) اب جب برطانوی صنعتی انقلاب آیا تو یورپ میں تکنیکی اختراعات کی گویا دوڑ سی لگ گئی لیکن ولندیزی نہ تو اس پیمانے پر اختراعات کر سکے اور نہ ہی انہوں نے دوسرے ممالک سے کچھ سیکھنے کی سعی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشی عمل کی سمندری سمت نمائی جہاز سازی، ویل مچھلیوں کو پکڑنا اور ٹیکسٹائل کی جیسی اہم شاخیں متروک اور زوال زدہ ہو گئیں۔

آخری نقطہ ڈچ سرمایہ داروں سے متعلق ہے جنہوں نے اپنا سرمایہ سرکاری قرضے کو فنانس کرنے نیز نجی کاروبار اور دوسرے ممالک کے علاوہ انگلستانی جنگوں کو فنانس کرنے میں صرف کیا جو کہ ان کے سخت ترین حریف بن گئے تھے۔ مثلاً 1782ء تک ڈچ سرمایہ کاری کا تخمینہ ایک ہزار ملین فلورن تھا جو سرکاری قرضوں اور قیمتی دھاتوں پر صرف کیا گیا اور 335 ملین غیر ملکی قرضوں اور 140 ملین نوآبادیاتی قرضوں پر صرف ہوا 335 ملین غیر ملکیوں کو قرضے کے طور پر دیے گئے جبکہ 280 ملین فلورن کی برطانوی قرضوں میں سرمایہ کاری کی گئی (Braudel 1984:267) 1801ء میں برطانوی قومی قرضے میں ڈچ سب سے بڑے حصے دار تھے۔ برطانوی قرضے کی کل

رقم جو کہ 17.44 ملین پاؤنڈ تھی اس میں سے 10.54 ملین پاؤنڈ ولندیزیوں کا حصہ تھا یاد رہے یہ وہ قرضہ تھا جو برطانیہ نے غیر ملکیوں سے حاصل کر رکھا تھا۔(Neal 1990:207)

ڈچ ری پبلک بالآخر 1806ء میں ختم ہو گئی جب اسے فرانسیسیوں سے عبرتناک شکست ہوئی۔ 19 ویں صدی میں ولندیزیوں کو صنعتکاری کے عمل کو نئی بنیادوں پر استوار کرنا پڑا۔ اب وہ برطانیہ کے پیروکار تھے۔ موخر الذکر نے ولندیزیوں کے اس عمل میں بھرپور مدد کرتے ہوئے زمانہ بعداز نپولین میں انہیں انڈونیشیا کی نوآبادی لوٹا دی۔ انڈونیشیا کی نوآبادیاتی لوٹ مار نے ہالینڈ کی صنعتکاری کو بہت سہارا دیا اور اس طرح وہ مغربی یورپ کے امیر ممالک کے کلب میں دوبارہ سے شامل ہو گیا(Bagchi 1982: chapter 4)

میں یہاں پر برطانوی روبہ ترقی ریاست کے زوال کا زیادہ تذکرہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ 19 ویں صدی ہی میں برطانیہ کی اقتصادی برتری کے خاتمے پر بے شمار تحریری مواد موجود ہے۔ آجرانہ روح میں درآنے والی کمی بزنس مینوں کا پبلک سکولوں کی سی روایات کو اپنا لینا بالکل جیسا کہ سکول کے کم سن طلباء کو عزت و وقار کے ضوابط کا پابند کر دیا جاتا ہے برطانوی بزنس مینوں نے بھی انہی ضوابط کو اپنا شعار بنا لیا۔ اسی طرح 19 ویں صدی کے جینٹل مین کی سی مخصوص اقدار جو کاروباری حلقوں میں بھی سرایت کر گئی تھیں جن کے تحت تجارت کرنا اور دولت کمانا کوئی قابل رشک اقدام تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ ان سب رویوں کے ساتھ ساتھ بچتوں کی کم ہوتی ہوئی شرح اور گھریلو معیشت میں سرمایہ کاری میں آنے والی کمی برطانیہ کی اقتصادی قوت میں آنے والے زوال کو وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔

(Elbaum and Lazonick 1986; Mccloskey 1973; Wiener 1981)

19 ویں صدی کے دوران برطانوی کیپٹل مارکیٹ کچھ مسائل کا شکار رہی۔ برطانیہ میں ایک قاعدے کے تحت گھریلو صنعت کے مقابلے میں زراعت اور پورٹ فولیو فارن انوسٹمنٹ (سٹاک ایکسچینج میں سرمایہ کاری کرنا) اور غیر ملکی و نوآبادیاتی پبلک قرضوں میں زیادہ سرمایہ کاری کی گئی۔(Kennedy 1987) 1870ء اور 1914ء کے درمیانی عرصہ میں برطانیہ اپنی بچتوں کا

نصف غیر ملکی قرضوں یا پھر دوسرے ممالک میں سرمایہ کاری پر صرف کرتا رہا۔ گو کہ یہ سرمایہ کاری ان رقوم سے کی گئی جو کہ سابقہ سرمایہ کاری سے حاصل کی گئی تھی۔ (Pollard 1985) 1870ء کی دہائی سے 1890ء کی دہائی تک برپا ہو جانے والی عظیم تر کساد بازاری کے دوران برطانوی زراعت اور خوردنی اشیاء کی صنعتیں جزوی طور پر متاثر ہوئیں۔ برطانوی پالیسیاں آزاد تجارت اور سرمایے کی آزادانہ نقل و حرکت کے حق میں تھیں کیونکہ برطانوی سلطنت کے مفادات اور اس کی ادائیگیوں کے توازن نیز وہاں کے طبقہ امراء کے مفادات کا اسی طرح کی پالیسیاں ہی تحفظ کرتی تھیں۔ گھریلو صنعتی ترقی کی بجائے غیر ممالک میں سرمایہ کاری (جس میں نوآبادیوں سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی شامل تھی) سے حاصل ہونے والے منافع جات کہیں زیادہ باعث کشش تھے۔ فنانس اور نوآبادیوں میں سرمایہ کاری کا غالب رجحان برطانوی روبہ ترقی ریاست کے لیے کافی مضر ثابت ہوا۔

اب اگر جاپان کی بات کی جائے تو یہ نہایت ہی دلچسپ مطالعہ ہوگا کیونکہ ڈچ ری پبلک اور برطانیہ کی مثال تو یہ ثابت کرتی ہے کہ فنانس نے انڈسٹری پر غلبہ پالیا اور غیر ممالک میں سرمایہ کاری کو گھریلو اقتصادی ترقی پر ترجیح دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روبہ ترقی ریاست زوال کا شکار ہونے لگی۔ جہاں تک جاپان کا سوال ہے تو وہاں سٹاک مارکیٹ میں بحران آ گیا اور 1990ء کی دہائی کے اختتامی ایام میں رئیل اسٹیٹ کی قیمتیں بڑھنا شروع ہو گئیں (Morishima 1995) لیکن یہ لازمی نہیں کہ جاپان بھی فنانس کے غلبے کا شکار ہو جائے گا۔ اب بھی انڈسٹریل فرموں، ان کے سب کنٹریکٹرز اور اہم بینکوں کے مابین قریبی روابط قائم ہیں اگرچہ کیپٹل مارکیٹ وغیرہ میں بعض بے قاعدگیاں ضرور دیکھنے میں آتی ہیں (Ito 1992: chapters 5 and 7; Aoki 1994) جاپان میں غیر ملکی مصنوعات کا تناسب اسی قدر ترقی کے مدارج طے کر لینے والی معیشتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھا۔ اس حوالے سے آخری نقطہ یہ ہے کہ جاپانی دیگر ترقی یافتہ اقوام سے اس حوالے سے زیادہ سمجھدار ثابت ہوئے کہ انہوں نے ڈوبتی ہوئی صنعتوں کو پبلک فنڈز کے ذریعے سہارا دے کر منافع آور بنایا اور وہ کم آمدنی والے ممالک کی صنعتوں سے مسابقت کے

قابل ہوگئیں۔

8-ناکام روبہ ترقی ریاستیں: سوویت یونین، برازیل، ہندوستان

سوویت یونین کے زوال کو عام طور پر سوشلزم کی ناکامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لیکن یہ شاید بہتر ہو اگر ہم اسے ایسی روبہ ترقی ریاست کی ناکامی سمجھیں جو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے عود آنے والے چیلنج کا مقابلہ نہ کرسکی۔اس اثناء میں یہ بات بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ سوویت یونین بہت سے ممالک کے لیے ترقی کرنے والے ملک کی حیثیت سے ایک ماڈل کا کردار بھی ادا کرتا رہا ہے۔ سوویت یونین ہی کی طرز پر کئی ممالک نے جن کے حکومتی طبقات کمیونزم دشمن تھے سرمایہ دارانہ نظام کے بحرانی دور میں پانچ سالہ منصوبہ جات وضع کیے اور ترقیت (Developmentalism) کے لیے اس ملک سے تحریک حاصل کی۔

سوویت روبہ ترقی ریاست نے 1950ء کی دہائی کے دوران کئی غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں۔اس نے ترقی کی شرح کی حد تک تو نئی تاریخ رقم کی۔علاوہ ازیں سوویت یونین نے صنعت کاری کی بھی بلند ترین شرح حاصل کی اور اکثر افراد کو زرعی شعبے سے نکال کر صنعتی شعبہ میں روزگار پر لگانے کے لیے پیشہ ورانہ ڈھانچے (Occupational Stuctare) میں بھی تبدیلی کردی۔سرمایے کو مجتمع کرنے کی خاطر کی جانے والی کوششیں اور اشیائے سرمایہ کی پیدائش کے لیے صنعتوں کا قیام اور سوشلزم کے قیام کے لیے محنت کش طبقے کا حامی نظریہ: ان تمام عناصر نے باہم مل کر نازی جرمنی کی جارحیت کا زور توڑنے میں سوویت یونین کی اقتصادی طور پر نسبتاً کمزور ریاست نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔سوویت یونین کی بعد از جنگ عظیم دوئم بحالی اور مشرقی یورپ کے بڑے حصے کی تعمیر نو جس میں کہ مغربی سرمایہ دارانہ طاقتوں کا کوئی کردار نہ تھا بذات خود ایک بڑی کامیابی تھی۔ٹیکنالوجی کے میدان میں بھی نیوکلیئر پاور پلانٹ کا کسی کی معاونت کے بغیر تیار کرلینا اور اسی زمانے میں سوویت یونین ہی نے پہلا انسان خلا میں بھیجا جو کہ فخر کی بات تھی۔ سوویت شہریوں میں عمومی صحت اور طوالت عمر کے حوالے سے بھی 50ء اور 60ء کی دہائیوں میں خاطر خواہ بہتری ہوئی۔

بیروچ (Bairoch) کے مسابقانہ صنعتی سطحوں سے متعلق اندازے (Bairoch 1982:281) بتاتے ہیں کہ 1913ء میں سوویت یونین کے صنعتکاری کے فی کس انڈکس کے مطابق وہ انگلستان کے مقابلے میں 20:100 تھا جو کہ 1928ء میں بھی 20 ہی رہا (کیونکہ پہلی جنگ عظیم سے ہونے والے تباہ کن اثرات کے باعث سوویت یونین میں زیادہ ترقی نہ ہوسکی) البتہ 1953ء میں یہ شرح 73 تک جا پہنچی (حالانکہ دوسری جنگ عظیم سے ہونے والے نقصانات اور بعدازاں بحالی کے مرحلے سے بھی سوویت ریاست کو گزرنا پڑا) جاپان میں صنعت کاری کی فی کس شرح 1913ء میں 20 '1928ء میں 30 اور 1953ء میں 40 تھی۔ چنانچہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ 1950ء کی دہائی میں اقتصادی لحاظ سے سوویت یونینؒ کی کارکردگی جاپان سے کہیں بہتر تھی لیکن اس کے بعد حالات میں کافی تبدیلی آ گئی اور 1980ء میں سوویت یونین میں فی کس صنعت کاری کی سطح 252 جبکہ جاپان میں 353 تھی۔ پیداواری ترقی میں بھی یہ تنزلی کافی عیاں تھی (Bergson, 1989, chapter 6) سوویت یونین میں 1950-60ء '1960-70 اور 1970-75ء میں پیداواری کی شرح ترقی بالترتیب 3.63 '1.83 اور 0.26 سالانہ تھی۔ اگرچہ سوویت یونینؒ نے مزدوروں میں تعلیمی ترقی کے میدان میں حیران کن پیش رفت ہوئی۔ اگر اس تعلیمی ترقی کو جو کہ مزدوروں میں ہوئی آئندہ تین صدیوں میں پیداواری ترقی میں تنزلی سے منہا کر دیا جائے تو (1950-60, 1960-70, 1970-75) میں پیداواری ترقی میں تنزلی کم ہو کر بالترتیب 3.26 '1.29 اور 0.21 رہ جاتی ہے (Ibid. 113)

1980ء کی دہائی میں مشرقی یورپ کو لپیٹ میں لے لینے والے بحران سے قبل ہی سوویت اقتصادی نظام ایسے مسائل میں گھر چکا تھا جو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی شدت کو بڑھاتے بھی تھے۔ (Nove 1977) پبلک سیکٹر میں قائم ادارے اس قدر وسائل کے متقاضی تھے جن کا مہیا کرنا ممکن نہ رہا تھا اور مزید یہ کہ منصوبہ سازی پر فائز عہدیداران ان منصوبہ جات کو کسی موثر نظم وضبط کے تحت لانے میں ناکام رہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ کاری میں رقوم تو زیادہ خرچ ہوئیں لیکن حاصل کم ہوا۔ مذکورہ مسائل زیادہ گھمبیر تب ہو گئے جب ترقیاتی

کاموں کا رخ زیادہ تر فوجی منصوبہ جات کی تکمیل کی طرف موڑ دیا گیا اور وہ سویلین شعبوں کی پیداواری ترقی کے کام نہ آ سکے۔ فوجی ساز و سامان تیار کرنے کے لیے استعمال ہونے والا خام مال دوسرے شعبوں کی ترقی کے لیے قطعاً ناقابل استعمال تھا۔ دیگر شعبہ جات میں ترقی نہ ہو سکنے کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ مغربی اقوام نے سوویت یونین کو ٹیکنالوجی کی منتقلی پر پابندی عائد کر دی تھی لیکن اس ضمن میں سب سے بڑی وجہ سوویت بیوروکریٹک و پولیٹکل سسٹم تھا جو کہ جامد و ساکت ہو چکا تھا جس کی وجہ سے سوویت یونین دوسرے ممالک میں ہونے والی اختراعات کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے سے قاصر رہا (Nove 1977: chap. 6)

سوویت روبہ ترقی ریاست کی ناکامی کے پیچھے کئی سیاسی اور سماجی ناکامیاں بھی کارفرما تھیں۔ وہاں کمیونسٹ پارٹی کے اندر اور دیگر سیاسی معاملات کے نپٹانے میں جمہوریت کا قطعاً کوئی عمل دخل نہ تھا۔ سوویت یونین مارکیٹ میکنزم کو منصوبہ بندی کی تشکیل اور دیگر مشکلات کو دور کرنے کے لیے استعمال کرنے میں ناکام رہا (Brus 1995) ایک ناکام روبہ ترقی ریاست سرمایہ دارانہ بلاک کی جانب سے 1980ء کی دہائی کے دوران درپیش چیلنجوں (جو کہ فوجی اور اقتصادی دونوں نوعیتوں کے تھے) کا جواب دینے سے قاصر رہی (Holliday 1990)۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ سوویت ترقیت (Developmentalism) یا پھر سوویت طرز سوشلزم کا زوال 1950ء کی دہائی تک تو بالکل ناگزیر نہ لگ رہا تھا۔ سوویت یونین کے زوال کی بابت یہ دلیل دی جاتی ہے کہ (Chandra 1993) یہ 1960ء کے سالوں میں شروع ہوا جب خروشیف نے کمیونسٹ پارٹی کے ڈھانچے کی اصلاح کرنی چاہی اور اس کے عوام سے تعلقات کی بھی تشکیل نو کرنا چاہی نیز اداروں کے منتظمین کو نظم و ضبط کے تابع کرنا چاہا اور یہ بھی کوشش کی کہ مسابقانہ فضا میں یہ ادارے منافع کمانا یقینی بنائیں تو برزنیف کی قیادت میں رجعت پسند اور ذاتی مفاد کو ترجیح دینے والے عناصر پر مبنی بیوروکریسی نے اس نے ایک نہ چلنے دی چنانچہ خروشیف کے عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح زرعی اصلاحات غیر ملکی چندسری سرمایہ داروں کی بیدخلی، مکمل خواندگی کے حصول اور آمدنی کی مساویانہ تقسیم سے نظر آنے والے امکانات کو ذاتی مفادات کے غلام طبقے نے بالکل معدوم

کر کے رکھ دیا اور سوشلزم کے حقیقی مقاصد مذاق بن کر رہ گئے۔

برازیلی اور ہندوستانی روبہ ترقی ریاستوں کے بارے میں بھی انہی اصولوں کی روشنی میں بات کی جاسکتی۔ جہاں تک برازیلی ترقییت (Developmentalism) کی ناکامی کا سوال ہے تو یہ محض آمرانہ طرزِ حکومت کی وجہ سے نہ ہوا تھا (Fiori 1997) کیونکہ اس سے پہلے پروشین (جرمن) جاپانی اور جنوبی کوریائی روبہ ترقی ریاستیں بھی کچھ زیادہ جمہوری نہ تھیں۔ اصل مسئلہ جو کہ برازیلی آمریت کے حوالے سے اہم ہے وہ یہ کہ اس کی بنیادیں قطعاً غیر محفوظ تھیں اور اس کے مقاصد بہت ہی محدود تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہاں کبھی بھی کسانوں کی بھلائی کی غرض سے زرعی اصلاحات نہ کی گئیں۔ جس کی وجہ سے دیہات میں زمینداروں کی قوت کو بیجا استحکام حاصل ہوا حتیٰ کہ ان کی قوت کا اثر شہروں پر بھی ہوا جس سے قومی سیاسی ڈھانچے پر مضر اثرات مرتب ہوئے اور محنت کشوں، بزنس مینوں اور سیاسی آقاؤں کے مابین بہت ہی پیچیدہ سرپرست زیردست (Patron Client) تعلقات نے جنم لے لیا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ ریاست نے گھریلو یا غیر ملکی سرمایہ داروں کو کسی نظم وضبط کے تحت لانے کی کوشش ہی نہ کی۔ داخلی سطح پر سرمایہ کاری میں جب رکاوٹ آئی تو معیشت مکمل طور پر غیر ملکی سرمائے پر انحصار کرنے پر مجبور ہوگئی۔ جس کے باعث ریاستی امور کی خودمختاری بہت ہی محدود ہو کر رہ گئی۔ حتیٰ کہ جب فوج نے بھی ریاستی ڈھانچے کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا تبھی یہی صورتحال برقرار رہی۔ تیسری اہم بات تعلیمی بنیاد کی کمزوری تھی اور ساتھ ہی پیداواری ترقی میں عدم تسلسل اور آمدنی کی غیر مساویانہ تقسیم برازیلی روبہ ترقی ریاست کی ناکامی کی اہم وجوہ ثابت ہوئیں۔

اسی طرح کے اصولوں کو ہندوستانی روبہ ترقی ریاست پر بھی منطبق کیا جاسکتا ہے جس کی منصوبہ بندی کافی حد تک سوویت نمونے سے ماخوذ اصولوں کی روشنی میں کی گئی تھی لیکن سوشلزم چوٹی کے فیصلہ سازوں کے لیے محض ایک نعرہ ہی تھا (Bagchi 1995a; Chaudhuri 1995; kaviraj 1995) جموں کشمیر، کیرالہ اور مغربی بنگال کی ریاستوں کے علاوہ کہیں بھی سنجیدگی کے ساتھ ایسی زرعی اصلاحات نہیں کی گئیں جو کہ کسانوں کے لیے موافق ثابت ہوسکتیں چنانچہ ہندوستان کے دیہات

کا پیشتر علاقہ ایسے زمینداروں کے غلبے میں رہا جو کہ ایسی طاقت کے حامل تھے جو منڈی کے اصولوں کے تابع نہ تھی۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں تعلیمی ترقی بہت سست روی سے ہوئی اور ہندوستان کی اکثریتی آبادی 1980ء کے عشرے تک ناخواندہ رہی۔ اس ضمن میں تیسرا پہلو یہ ہے کہ ہندوستانی معیشت کا بڑا حصہ غیر ملکی سرمایہ کا دست نگر رہا جس سے گھریلو سرمایہ اور آزاد آجرین کے منصوبہ جات بیجا پابندیوں میں جکڑے رہے آخری نقطہ یہ ہے کہ وہاں جائیداد سے متعلق قوانین جو کہ چیدہ چیدہ بزنس قومیتوں میں رائج تھے ان میں خاندانی تعلقات کی بڑی اہمیت تھی یعنی تاریخی طور پر بعض گھرانے کاروبار کرنے کے نااہل قرار پا گئے تھے اور یہ پابندی زمانہ حال تک موجود رہی جو اقتصادی ترقی کے لیے قطعاً سازگار ثابت نہ ہو سکی۔

جمہوریت نے طبقہ بالا یا یوں کہہ لیں کہ حکمران طبقے میں سمجھوتے کی راہ ہموار کی اور اس سلسلے میں باقاعدہ میکنزم (Mechanism) کی تشکیل پا گئی۔ اس کے ساتھ ہی جمہوریت نے داخلی سطح پر اجارہ دارانہ سرمایہ داری کی زیادتیوں کی بھی مزاحمت کی۔ البتہ 1991ء میں ہندوستان کو لپیٹ میں لے لینے والا قرضوں کا بحران جو کہ ٹیکنوکریٹس کاروباری افراد اور سیاستدانوں کا پیدا کیا ہوا تھا کیونکہ یہ لوگ معیشت کو زیادہ آزادی دینے کے حق میں تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی ریاست آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نیز ٹرانس نیشنل سرمایے اور بین الاقوامی گھریلو سرمایے کے سامنے بے بس ہو گئی۔ ایک بنیاد پرست ہندو جماعت کا ظہور اور نیوکلیئر بم بنانے کی مہم جوانہ پالیسی کے نتائج کے اثرات کا بھی ہندوستانی روبہ ترقی ریاست پر بہت ہی مضر اثر مرتب ہوا۔ خاص طور پر سماجی سرمایے کے لیے ضروری بنیاد کھوکھلی ہونی شروع ہو گئی۔ غیر ملکی ادائیگیوں کے توازن میں آنے والی بحرانی کیفیت دو چند ہو گئی جب دفاعی اخراجات میں خاص کر ایٹمی دھماکوں کے بعد اضافہ ہوا اس کے ساتھ ہی کرنسی کے بحران نے تمام ایشیائی ریاستوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی اقتصادی حالت کو مزید بگاڑ دیا۔ یہی کیا کم تھا کہ امریکہ نے بھی اقتصادی پابندیاں عائد کر دیں۔ سودیشی بم نے جو کہ کہنے کو تو مقامی وسائل سے بنا تھا لیکن اس کی وجہ سے ہندوستان غیر ملکی سرمایے کا زیادہ محتاج ہو گیا۔

References

Amsden, A.H. 1987. "The paradigm of late industrialization," in Bagchi, 1987a, 133-160.

Amsden, A. H. 1989. *Asia's Next Giant: South Korea and Late Industrialization*. New York: Oxford University.

Amsden, A. H. 1994. "Why isn't the whole world experimenting with the East Asian model to develop." World Development, 22(4), April, 627-33.

Aoki, M. 1987. "The Japanese firm in transition," in Yamamura and Yasuda, 1987, 263-88.

Aoki, M. 1994. "The Japanese firm as a system of attributes: a survey and research agenda," in Aoki and Dore, 1994, 11-40.

Aoki, M. and R, Dore (eds.) 1994, "The Japanese Firm: the sources of competitive strength", Oxford: Oxford University Press.

Atkinson, A.B. et al. 1995. Income Distribution in the OECD Countries. Paris, OECD.

Aymard, M. (ed.) 1982. "Dutch Capitalism and World Capitalism". Cambridge: Cambridge University Press.

Aymard, M. 1982a. "Introduction," in Aymard, 1982, 1-10.

Bagchi, A. K. 1982. The Political Economy of Underdevelopment. Cambridge: Cambridge University Press.

Bagchi, A. K. 1987. "Public Intervention and Industrial Restructuring in China, India and Republic of Korea". New Delhi, ILO-ARTEP.

Bagchi, A. K. (ed.) 1987a. "Contributions on East Asian capitalism," Political Economy: Studies in the Surplus Approach, 3(2).

Bagchi, A. K. 1987b. "East Asian capitalism: an introduction," in Bagchi, 1987a, 115-032.

Bagchi, A. K. (ed.) 1995. Democracy and Development. London: Macmillan for the International Economic Association.

Bagchi, A. K. 1995a. "Dialectics of Indian planning: from compromise to democratic decentralization and threat of disarray," in Sathyamurthy. 1995:46-93.

Bagchi, A. K. 1998. "East and South-east Asia: Growth miracle and its unraveling," Economic and Political Weekly, XXXIII(18), 2 May, 1025-1042.

Bairoch, p. 1976. "Europe's gross national product: 1800-1975," Journal of European Economic History, 5(2), Fall: 273-340.

Bairoch, p. 1982. International industrialization levels from 1750 to 1980, Journal of European Economic History, 11(2), Fall:69-333.

Beasley, W. G. 1973. The Meiji Restoration, Stanford, Calif., Stanford University Press.

Benabou, R. 1993. Workings of a city: Location, education and production, Quarterly Journal of Economics, CVIII(3), August, 619-652.

Benabou, R. 1996. Equity and efficiency in human capital investment: the local connection, Review of Economic Studies, 63(2), 237-264.

Bergson, A. 1989. Planning and Performance in Soviet Economics: the USSR and Eastern Europe, Boston: Unwin Hyman.

Blackbourn, D. 1984. "The discreet charm of the bourgeoisie: Reappraising German History in the nineteenth century," in Blackbourn and Eley, 1984, 159-192.

Blackbourn, D. and G. Eley. 1984. The Peculiarities of German History: Bourgeois society and politics in nineteenth-century Germany, Oxford: Oxford University Press.

Blum, J. 1978. The End of the Old Order in Rural Eruope Princeton, N.J. Princeton University Press.

Borchardt, K. 1973. "The Industrial Revolution in Germany 1700-1914," in Cipolla, 1973, 76-160.

Boxer, Ç. R. 1973. The Dutch Seaborne Empire 1600-1800. Harmondsworth, Middlesex, Penguin Books.

Braudel, F. 1984. The Perspective of the World, Civilization and Capitalism 15th – 18th Century, Vol.III, translated from the French by Sian Reynolds, London: Collins.

Breman, J. and S. Mundle (eds.) 1991. Rural Transformation in Asia. Delhi, Oxford University Press.

Brewer, J. 1989. The Sinews of Power: War, Money and the English State, 1688-1783. London: Unwin Hyman.

Brus, W. 1995. "Marketization and democratization: the Sino-Sovier divergence," in Bagchi, 1995, 256-281.

Byres, T. 1991. "The agrarian question and differing forms of capitalist agrarian transition: an essay with reference to Asia," in Breman and Mundle, 1991:3-76.

Chaudhuri, p 1995. "Economic planning in India," in Sathyamurthy, 1995:94-114.

Chandra, N. K. 1993. "Was Collapse of CPSU Inevitable A Polemical Essay," Economic and Political Weekly, 28(5), 30 January, PE-23, PE-36.

Chowdhury, A. and I. Islam. 1993. The Newly Industrialising Economics of East Asia. London: Routledge.

Cipolla, C. M. (ed.) "The Fontana Economic History of Europe," Vol.4(1), The Emergence of Industrial Societies, Part I, London: Collins/Fontana.

Clark, G. N. 1947. The Seventeenth Century. Second edition, Oxford: Clarendon Press.

Coleman, J. 1988. "Social capital in the formation of human capital," American Journal of Sociology, Vol. 94, 595-5120.

Corrigan, p. and D. Sayer. 1985. The Great Arch: English State Formation as Cultural Revolution. Oxford: Blackwell.

Craig, G. A. 1981. Germany 1866-1945. Oxford: Oxford University Press.

Cumings, B. 1987. "The origins and development of the Northeast Asian political economy," in Deyo, 1987, 44-83.

Dasgupta, p. 1988. "Trust as a commodity," in Gambetta, 1988.

De Vries, J. 1976. The Economy of Europe in a Age of Crisis, 1600-1750. Cambridge: Cambridge University Press.

De Vries, J. 1982. "An inquiry into the behaviour of wages in the Dutch Republic and the Southern Netherlands from 1380 to 1800," in Aymard, 1982, 37-61.

De Vries, J. and A. van der Woude. 1997. The First Modern Economy: Success Failure, and Perseverance of the Dutch Economy, 1500-1815. Cambridge: Cambridge University Press.

Deyo, F. C. (ed.) 1987. The Political Economy of the New Asian Industrialism. Ithaca, NY: Cornell University Press.

Dickson, P. G. M. 1967. The Financial Revolution in England 1688-1755. London: Macmillan.

Dore, R. P. 1959. Land Reform in Japan, Oxford: Oxford University Press.

Dreze, J. and A. Sen. 1989. Hunger and Public Action. Oxford: Clarendon Press.

Elbaum, B. and W. Lazonick (eds.). 1986. The decline of the British Economy. Oxford: Oxford University Press.

Eley, G. 1984. "The British Model and the German road: Rethinking the course of German history before 1914," in Blackbourn and Eley, 39-158.

Fei, J. C. H., K. Ohkawa and G. Ranis. 1985. "Economic development in historical perspective: Japan, Korea, and Taiwan" in Ohkawa and Rains, 1985, 35-66.

Fiori, J. L. 1992. "the political economy of the developmentalist state in Brazil," CEPAL Review, No. 47, August, 173-86.

Gambetta, D. (ed.). 1988. Trust: Making and Breaking of Cooperative Agreements. Oxford: Baul Blackwell.

Gerschenkron, A. 1965. Economic Backwardness in Historical Perspective. New York: Praeger, 5-30.

Granovetter, M. 1992. "Economic Institutions as Social Constructions: A Framework for Analysis," Acta Sociologica, Vol.35, 3-11.

Greenfeld, L. 1992. Nationalism: Five Roads to Modernity. Cambridge, Mass: Harvard University Press.

Haggard, S. 1990. Pathways to the Periphery: The Politics of Growth in the Newly Industrializing Countries, Ithaca NY: Cornell University Press.

Halliday, F. 1990. "The Ends of Cold War, "New Left Review, No. 180, March-April, 5-37.

Hill, C. 1961. The Century of Revolution 1603-1714. London, Thomas Nelson & Sons.

Himmelfarb, G. 1984. The Idea of Poverty: England in the Early Industrial Age. London, Faber.

Hoffman, K. 1955. British Industry 1700 1950. Oxford, Blackwell.

Israel. J. I. 1989. Dutch Primacy in World Trade, 1585-1740. Oxford: Clarendon Press.

Israel. J. I. 1995. The Dutch Republic: Its Rise, Greatness, and Fall 1477-1806. Oxford: Oxford University Press.

Ito, T. 1993. The Japanese Economy. Cambridge, MA:MIT Press.

Jones, L. P. and Il Sakong. 1980. Government, Business and Entrepreneurship in Economic Development: The Korean Case. Cambridge, MA: Council on East Asian Studies and Harvard University Press.

Kahn, H. 1973. The Emerging Japanese Superstate. Harmondsworth, Middlesex: Penguin.

Kaviraj, S. 1995. "Democracy and development in India," in Bagchi, 1995:92-130.

Kennedy, W. P. 1987. Industrial Structure, Capital Markets and the Origins of British Industrial Decline. Cambridge: Cambridge University Press.

Kikuchi, M. and Y. Hayami. 1985. "Agricultural growth against a land-resource constraint: Japan, Taiwan, Korea and the Philippines," in Ohkawa and Ranis, 1985, 67-90.

Kelp, P. M. M.1988. "Urban decline in Brabant: the traditionalization of investments and labour (1374-1806)," in H. Van der Wee (ed.) The Rise and Decline of Urban Industries in Italy and in the Low Countries (Late Middle Ages-Early Modern Times). Nijmegen (Netherlands): Leuven University Press, 261-86.

Koike, K. 1987. "Human Resource Development and Labour-Management Relations," in Yamamura and Yasuba, 1987: 289-330.

Kwon, J. 1994. "The East Asia challenge to neoclassical orthodoxy," World Development, 22(4), April, 635-44.

Ladejinsky, W. 1939. Japan's agricultural crisis, Journal of Farm Economics, August: reprinted in Walinsky, 1977, 39-49.

Ladejinsky, W. 1940. Chosen's agriculture and its problems,l Foreign Agriculture, February: excerpted in Walinsky, 1977, 48-58.

Ladejinsky, W. 1947. Farm Tenancy in Japan, Report No. 79 by Supreme Commander for the Allied Powers, Tokoy: reprinted in Walinsky, 1977, 68-93.

Landes, D. S. 1965. "Technological change and development in western Europe, 1750-1914," in H. J. Habakkuk and m. Postan (eds.) The Cambridge Economic History of Europe, Vol. VI, The Industrial Revolutions and After, Part I. Cambridge: Cambridge University Press, 274-601.

Lee, E. 1979. "Egalitarian peasant farming and rural development," in D. Ghai et al. (eds.) Agrarian Systems and Rural Development. London:Macmillan, 24-71.

Lee, J. J. 1970. "Labour in German Industrialization," in Mathias and Postan, 1978, 442-91.

Lis, C. and H. Soly. 1982. Poverty and Capitalism in Pre-Industrial Europe, revised edition. Brighton: Harvester Press.

Livingston, J. et al (eds.) 1976. Postwar Japan, 1945 to the Present, The Japan Reader, Vol. 2. Harmondsworth, Middlesex: Penguin.

Loury, G. C. 1977. "A dynamic theory of racial differences," in A. Le Mond (ed.) Women, Minorities and Employment Discrimination, Lexington, MA: Lexington Books.

McCloskeyk, D. 1973 Economic Maturity and Entrepreneurial Decline: British Iron and Steel 1870-1913. Cambridge, MA: Harvard University Press.

Macleod, C. 1988. Inventing the Industrial Revolution: The English patent system, 1660-1800, Cambridge: Cambridge University Press.

MeNeill, W. H. 1983. The Pursuit of Power: Technology, Armed Force, and Society Since A. D. 1000. Oxford, Blackwell.

Maddison, A 1991. Dynamic Forces in Capitalist Development: a long-run comparative view, Oxford: oxford University Press.

Mason, E. S. et al. 1980. The Economic and Social Modernization of the Republic of Korea. Cambridge, MA: Council on East Asian Studies and Harvard University Press.

Mathias, P. and M. M. Postan (eds.). 1978. The Industrial Economics: Capital, Labour, and Enterprise, Vol. VII, The Cambridge Economic History of Europe. Cambridge: Cambridge University Press.

Mathias, M. and M. M. Postan (eds.). 1978a. The United States, Japan and Russia, Vol. VII, The Cambridge Economic History of Europe. Cambridge: Cambridge University Press.

Minami, R. 1998. "Economic Development and Income Distribution in Japan: An Assessment of the Kuznets Hypothesis," Cambridge Journal of Economics, 22(1), January, 39-58.

Mitchell, B. R. 1973. "Statistical Appendix," in Cipolla, 1973a, 738-822.

Mitchell, B. R. 1973a. European Historical Statistics 1750-1970, abridged edition, London: Macmillan.

Mokyr, (ed.) 1993. The British Industrial Revolution: an Economic Perspective. Oxford: Oxford University Press.

Morishima, M. 1982. Whay -Has Japan "Succeeded?" Western Technology and the Japanese Ethos. Cambridge: Cambridge University Press.

Morishima, M. 1995. "Democracy and Economic Growth: The Japanese Experience," in Bagchi, 1995, 138-60.

Mulier, E. H. 1987. "The language of seventeenth century republicanism in the United Provinces: Dutch or European?," in Pagden, 1987, 179-96.

Neal, L. 1990. The Rise of Financial Capitalism: International capital markets in the Age of Reason. Cambridge: Cambridge University Press.

Nove, A 1977. The Soviet Economic System. London: Allen & Unwin.

Ohkawa, K. and G. Ranis (eds.) 1985. Japan and the Developing Countries. Oxford: Blackwell.

Ohkawa, K. et al. 1993. The Growth Mechanism of Developing Countries: Investment, Productivity and Employment. San Francisco: ICS Press.

Ohkawa, K. et al. and H. Rosovsky. 1978. "Capital formation in Japan," in Mathias and Postan, 1978a, 134-65.

Pagden, A. (ed.). 1987. The languages of Political Theory in Early-Modern Europe. Cambridge: Cambridge University Press.

Pagden, A. (ed.) 1988. "The destruction of trust and its economic consequences in the case of eighteenth-century Naples" in Gambetta, 1988.

Parker, G. 1988. The Military Revolution: Military Innovation and the Rise of the West, 1500-1800. Cambridge: Cambridge University Press.

Plumb, J. H. 1973. "Introduction" to Boxer, 1973, xiii-xxvii.

Polanyi, K. 1957. The Great Transformation: The Political and Economic Origins of our Time. Boston: Beacon Press.

Pollard, S. 1985. "Capital exports 1870-1914: Harmful or Beneficial?" Economic History Review, Vol. 38, 489-514.

Sathyamurthy, T. V. (ed.) 1995. Industry and Agriculture in India since Independence. Delhi: Oxford University Press.

Schama, S. 1987. The Embarrassment of Riches: an Interpretation of Dutch Culture in the Golden Age, London: Fontana.

Senghaas, D. 1985. The European Experience: A Historical Critique of Development Theory. Dover: Berg Publishers.

Sylla, R. 1991. "The role of banks," in Sylla and Toniolo, 1991, 44-83.

Sylla, R. and G. Toniolo (ed.). 1991. Patterns of European. Industrialization: The Nineteenth Century. London: Routledge.

Szreter, S. 1997. "The Politics of Public Health in Nineteenth-Century Britain," Population and Development Review, 23(4), December, 693-728.

Taira, K. 1978. "Factory Labour and Industrial Revolution in Japan," in Mathias and Postan, 1978, 166-214.

Tadashi, F. 1967. "Land reform laws," excerpted from F. Tadashi: Japanese Rural Society. Tokyo: Oxford University Press, 17-18, in Livingston et al. 1976, 187-8.

Thane, P. 1990. "Government and society in England and Wales, 1750-1914" in Thompson, 1990, 1-62.

Thompson, E. P. 1977. Whigs and Hunters: Origins of the Black Act, revised edition. Harmondsworth, Middlesex: Penguin Book.

Thompson, F. M. L. (ed.) 1990. The Cambridge Social History of Britain, 1750-1950, Vol. 3, Social Agencies and Institutions, Cambridge: Cambridge University Press.

Tilly, R. H. 1978. "Capital formation in Germany in the nineteenth century," in Mathias and Postan, 1978, 382-441.

Tilly, R. H. 1986. "German banking, 1850-1914: development assistance to the strong," Journal of European Economic History, Vol. 15, spring, 113-52.

Tilly, R. H. 1991. "Germany," in Sylla and Toniolo, 1991, 175-96.

Tsuru, S. 1993. Japan's Capitalism: Creative Defeat and Beyond. Cambridge: Cambridge University Press.

UNCTAD. 1997. Trade and Development Report 1997, New York: United Nations.

Walinsky, L. J. (ed.) 1977. The Selected papers of Wolf Ladejinsky: Agraian Reform as Unfinished Business. New York: Oxford University Press for the World Bank.

Wan, H. Y. 1988. Nipponized Confucian ethos or incentive-compatible institutional design: Notes on Morishima, "Whay has Japan succeeded?" International Economic Journal, 2(1), Spring, 101-8.

Watanabe, S. 1987. "On socio-institutional conditions of Japan's modernization," in Bagchi, 1987a, 181-99.

Wiener, M. J. 1981. English Culture and the Decline of the Industrial Spirit, 1850-1914. Cambridge: Cambridge University Press.

Wilson, C. H. 1939. The economic decline of the Netherlands, The Economic History Review, IX(2), May, 111-27.

Woo, Jung-en. 1991. Race to the Swift: State and Finance in Korean Industrialization, New York, Columbia University Press.

Yamamura, K. 1972. "Japan, 1868-1930: a revised view," in R. Cameron (eds.): Banking and Economic Development: Some lessons of history, New York, Oxford University Press, 168-198.

Yamamura, K. 1978. "Entrepreneurship, ownership, and management in Japan," in Mathias and Postan, 1978, 215-264.

Yamamura, K. and Y. Yasuba (eds.) 1987. The Political Economy of Japan, Vol. 1, The Domestic Transformation, Stanford: Stanford University Press.

Zamagni, V. 1993. The Economic History of Italy 1860-1990, Oxford: Clarendon Press.

❁

سندھ کی تاریخ پر جغرافیہ کے اثرات

پرویز ونڈل

جغرافیہ یعنی زمین، دریا، پہاڑ، جنگل پر انسانی عمل سے دولت پیدا ہوتی ہے اور یوں جغرافیائی خدوخال دولت کی فراوانی کا سبب بنتے ہیں اور تاریخ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے اور سندھ کی قدیم و حالیہ تاریخ اسی بات کا ثبوت ہے یوں تاریخ دانوں کو جغرافیہ کے مطالعہ سے تاریخ میں دوررسی کا شعور ملتا ہے۔

سندھ کی سرزمین کے آباد ہونے، یہاں آبادی بننے شہر بسنے یعنی سندھ کی پوری زندگی پر دریا کا اثر ہے۔ دریا کے حوالے سے ہی یہاں کاشت ہوتی ہے کیونکہ بارش زیادہ نہیں ہوتی۔ مون سون کا زیادہ اعتبار نہیں۔ لگ بھگ 20 ہزار سال پہلے جب کہ دنیا پر برف چھائی ہوئی تھی تو اس خطہ میں پانی زیادہ تھا۔ آثار بتاتے ہیں کہ دریائے سندھ کے متوازی ایک اور دریا ''گھاگرہاکڑہ'' نام کا بہتا تھا۔ یہاں بارشیں بھی زیادہ ہوتی ہوں گی اور زمین پر پانی کے بہاؤ کے نشانات بتاتے ہیں کہ دریا میں شامل ہونے والی بالخصوص بلوچستان سے ندیاں زیادہ تھی۔ نقشہ نمبر 1 مارک کینور (Mark Kenoyer) سے لیا گیا ہے اور اس میں اس وقت کے دریا بتائے گئے ہیں۔ وقت کے ساتھ یہاں گرمی بڑھتی گئی اور گھاگرہاکڑہ دریا خشک ہو گیا اور دریا سندھ اس علاقے میں اکلوتا رہ گیا۔ آبادی سمٹ کر اس کے دونوں کناروں پر مرکوز ہو گئی اور پھیلی ہوئی آبادی زیادہ گنجان ہو گئی۔ یوں گاؤں، قصبہ اور شہر بننا شروع ہوئے اور ایک نئی تہذیب نے جنم لیا۔ دریا ہی زندگی اور سیلاب کے وقت موت کا سبب بن گیا۔ موہنجوداڑو جیسے شہر آباد ہوئے۔ زراعت کے ساتھ تجارت میں بھی ترقی ہوئی اور دریائی نظام کی بدولت تجارت کا پھیلاؤ کشیر پنجاب تک پھیل گیا۔ دریائے نیل کی تہذیب کے برعکس دریائے سندھ کے لوگوں نے بڑے بڑے مقبرے اور دیگر عمارتیں نہیں بنائیں۔ سندھ کی تہذیب کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے انتہائی ترقی یافتہ شہر آباد کیے، لوگوں کی فلاح و بہبود کا خاص خیال رکھا پینے کا پانی الگ اور پانی کے نکاس کا انتظام الگ تھا۔ یوں پتا چلتا ہے کہ انہیں بیماریوں کا گندے پانی کی وجہ سے پھیلنے کا احساس تھا۔ یہ بات سائنسی سوچ کی نشاندہی بھی کرتی ہے گویا ان کا دھیان لوگوں کی بہبود پر تھا نہ کہ بادشاہوں اور چند روٴسا کے عیش پر۔ ایک حیران کن بات یہ بھی ہے کہ دریائے سندھ کی تہذیب میں جنگ پرستی نہیں پائی جاتی اور نہ ہی کسی بڑی جنگ اور بہت سے لوگوں کا جنگ میں ہلاک ہونے کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔

Major Geographical Features of the Northwestern Subcontinent and Adjacent Regions.

FROM KENOYER, M.
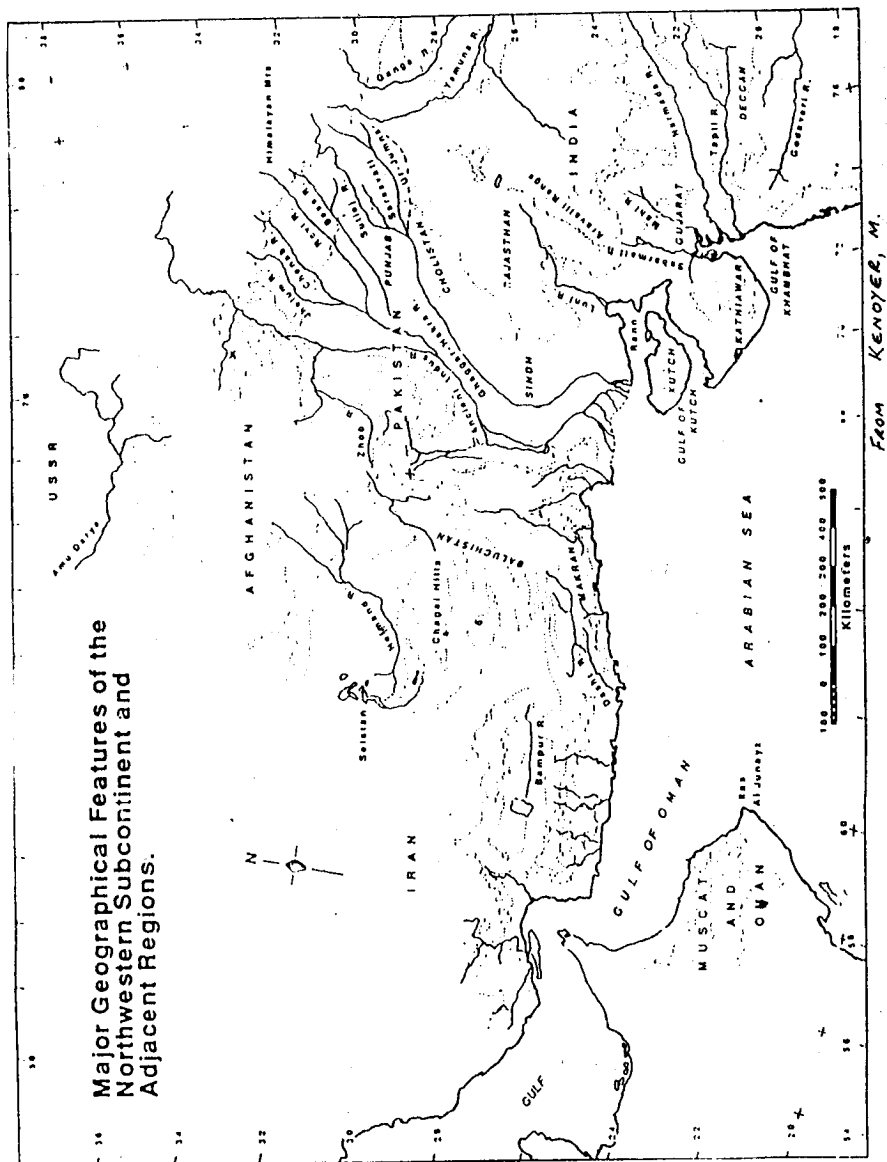
موہنجوداڑو کے آرٹ میں بھی کوئی جنگ پسندی کا مظاہرہ نہیں ملتا۔لوگ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں لیکن لڑائی کا کوئی سین نہیں ملتاامن پسندی کے ساتھ کینور کا کہنا ہے کہ یہاں عورت کا مقام بھی عزت کا تھااور مردوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ تھا۔انسانی حسن اور نمائش کا اہتمام کرتے تھے' زیورات کا استعمال عام تھادریائی نظام کے بدولت تجارتی نظام میں بہت وسعت تھی اور اسی حوالے سے صنعت میں بھی اچھا فروغ تھا۔مثال یوں ہے کہ پتھروں کا ہار بنانے کے واسطے چھوٹے سخت پتھروں میں سوراخ کرنا پڑتے اور وہ سوراخ خاص دھات سے ایک سوئی بنا کر اور پھر اسے پتھر میں گھما کر ہی بن سکتے تھے۔اس کام کے لیے اوزار بنائے گئے ہوں گے جو کافی پیچیدہ ہوتے ہیں۔یاد رہے کہ سب کچھ چھ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔

نقشہ نمبر 2 سندھ کے جغرافیہ کے ایک اور پہلو کی نشاندہی کرتا ہے وادی سندھ کا ڈھلان شمال سے جنوب ہے۔لاہور سندھ سے تقریباً800 میل کے فاصلے پر ہےاور سطح سمندر سے 800 فت کی بلندی پر ہے گویا ایک میل میں ایک فٹ کا ڈھلان ہے۔یہ غور کریں کہ اس کمرے سے بھی زیادہ چپٹا ہے پچاس(50) فٹ میں 1/8" (ایک سوتر) کا ڈھلان۔اسی لیے طغیانی کے وقت تمام علاقہ ایک سمندر بن جاتا ہے۔(اب تو بے شمار براج اور بند بننے کی وجہ سے سیلاب کم ہو گئے ہیں لیکن 200 سال سے پہلے کے حالات میں یہ درست تھا) زمین کے مغرب سے مشرق کی طرف گھومنے کی وجہ سے دریا مغرب کی جانب کاٹتے ہیں یعنی اپنے دائیں کنارے کو۔اس لیے پنجاب کے دریا بیاس' ستلج' راوی اور چناب دائیں کنارے کی طرف مڑتے ہیں اور سیلاب کا زور بھی اسی طرف ہوتا ہے۔ان دریاؤں پر پرانے شہر ہمیشہ اسی لیے بائیں کنارے پر ملتے ہیں۔ کیوں کہ دائیں کنارے کی آبادیاں تباہ و برباد ہو جاتی تھیں۔اس لیے ان دریاؤں میں قدیم آبادیاں صرف بائیں کنارے پر پائی جاتی ہیں۔سندھ میں صورت حال الٹی ہے۔یہاں دریا دائیں کاٹتے ہوئے زمین کے ساتھ بہتا ہے۔پنجد کے بعد دریا کا دایاں کنارہ اونچا ہو جاتا ہے۔ اس لیے قدیم سندھ کے زیادہ شہر دائیں کنارے پر واقعہ ہیں۔حیدرآباد چونکہ ایک ٹیلہ بائیں طرف موجود تھا۔شہر یہاں بسالیا گیا۔بائیں طرف کے دوسرے شہر دریا سے دور ہیں۔سندھ میں چونکہ سیلاب کے وقت پانی زیادہ بائیں طرف آتا ہے۔اس لیے یہ زمین زیادہ زرخیز ہے۔اور آبادی کی اکثریت بھی اس طرف زیادہ ہے۔ہر سال کے سیلاب کی وجہ سے یہاں پکے گاؤں کم ہیں اور بڑے زمینداروں کے بڑے گھر دریا سے دور یا اونچی جگہ پر ملتے ہیں۔
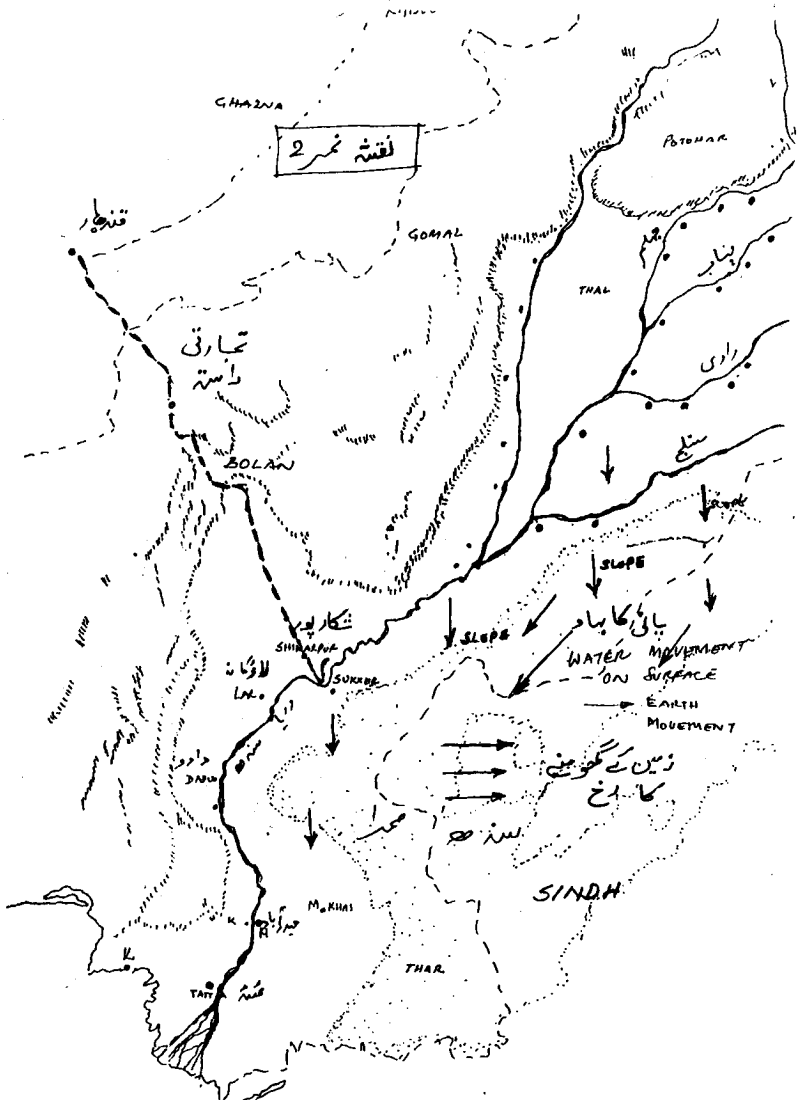
اگر دریا کا ایک حصہ کاٹا جائے تو ہم آبادی میں مختلف حصے دیکھ سکتے ہیں- یہ صورت حال سندھ کی نہریں بننے سے پہلے کی ہے۔ دریا کے دونوں طرف پہلی صف میں ملاح اور مچھیرے پائے جاتے ہیں۔ یہاں دریا کے کنارے کشتی سازی اور مرمت کی صنعت' جال بننے اور مچھلی پکڑنے کا سامان بنانے کا کاروبار ہوتا تھا۔ گھنے جنگل میں کسی حد تک بھینسیں (بڑے جانور) بھی پائے جاتے تھے اور یہ گوالوں کا علاقہ بن جاتا تھا۔

دوسری صف میں جنگل صاف کر کے چھوٹے پیمانے کی کھیتی باڑی اور زیادہ تر سبزی اگائی جاتی تھی۔ یہاں کنویں کم گہرائی کے تھے اور زیادہ پانی والی فصل مثلاً چاول کی کاشت ہوتی۔ چھوٹی نہریں جو دریا سے پانی لاسکتی وہ بھی بنائی جاتی تھیں۔ تیسری صف بڑے پیمانے پر کاشت ہوتی تھی۔ جنگل کم ہو جاتا اور اسے کاٹ کر زمین برابر کر کے کنوؤں سے پانی لیا جاتا تھا۔ نسبتاً کم پانی والی فصل گیہوں' چنا وغیرہ اگائی جاتی تھیں۔

چوتھی صف میں چونکہ پانی کم ہو جاتا ہے کاشت کم ہو جاتی ہے۔ تو جانور پالنے کا سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ چھوٹے یعنی بکری بھیڑ وغیرہ یوں یہ گڈریوں کا علاقہ بن جاتا۔ چراگاہیں یہاں ملتی تھیں ان کا انحصار بارش پر بھی تھا پانچویں صف میں اب وہ لوگ آجاتے ہیں۔ جن کا مستقل ٹھکانا کم یا بالکل نہ ہوتا ہے۔ جانوروں کے ساتھ یہ گھاس کی تلاش میں گھومتے ہیں۔ یہ وہ جانور پالتے جو سخت جان ہوتے ہیں جیسے اونٹ وغیرہ۔ ان کے گھر ان نے جانوروں پر لادھے جاسکتے ہیں۔ خانہ بدوشوں کے یہ قبیلے موسم کے حوالے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ بتایا گیا ہے سمندر سے 800 میل سے بھی زیادہ فاصلے تک کوئی بڑا پہاڑ یا پہاڑیوں کا سلسلہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سمندری ہوا جو شام ہونے پر سمندر سے زمین کی طرف چلتی ہے بغیر کسی رکاوٹ کے دور تک پہنچ جاتی ہے۔ حیدرآباد سو میل سمندر سے دور ہے لیکن شام کو یہاں ہوا بری خوبی سے چلتی ہے اور موسم نہایت خوشگوار ہو جاتا ہے۔ ٹھٹھ بھی کسی قدر سمندر کی امس سے بچ جاتا ہے اور ہوادار ہے۔ اندرون سندھ گھروں پر ہوا کو گھروں کے اندر لانے کے واسطے چھت پر بادگیر بنائے جاتے جو یہاں کے فن تعمیر کا انوکھا پہلو بن گیا ہے' یہ سمندری ہوائیں دریائی تجارت میں بھی مدد دیتی تھیں شام کے وقت کشتیوں کے قافلے ہوا کے زور دریا کے اوپر والے حصہ یعنی ٹھٹھ سے حیدرآباد یا حیدرآباد سے سکھر کی طرف چل پڑتے تھے۔

سندھ کا جغرافیہ یوں ہے کہ دریا اسے پنجاب سے ملاتے ہیں اور سندھ وادی کے حوالے یہ ایک ہی علاقہ گردانا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف دریائے بولان کی وادی، جو کہ ایک زمانے میں زیادہ زرخیز تھی، سندھ کو افغانستان اور وسطی ایشیا کے ممالک سے ملاتی تھی۔ یہ تجارتی راستہ بڑا فائدہ مند تھا اور وسطی ایشیا کو اسی راستے قریب ترین سمندر ملتا تھا۔ یوں شکار پور جو کہ اس راستے پر گویا ایک چوراہا تھا تجارت کا ایک بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں کے تاجروں کی دولت کی دھوم پھیل گئی اور رنجیت سنگھ کی یہ پوری کوشش تھی کہ وہ شکار پور قبضہ کرے۔ تجارتی راستے ایک ملک کی دولت بڑھانے میں بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں لیکن ستم یہ کہ انہی راستوں سے فوجیں بھی آ جاتی ہیں یہ شکار پور۔ قندھار کا راستہ سندھ کو بہت مہنگا پڑا۔ انیسویں صدی کے شروع میں انگریز ہندوستان کے وسیع علاقوں پر تیزی سے قابض ہوتے جا رہے تھے۔ دوسری جانب روس بھی وسطی ایشیا پر اپنا قبضہ بڑھاتا جا رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ وہ افغانستان پر قابض ہو کر ہندوستان پر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ پنجاب پر رنجیت سنگھ کی حکومت تھی اور اس نے اپنا دفاع مضبوط کیا ہوا تھا۔ انگریزوں نے پہلے تو ایران کے راستے روسیوں کے سامنے بند باندھنے کا بندوبست کیا اور اور پھر وہ افغانستان تک پہنچنے کی کوشش میں لگ گئے سندھ پنجاب کی نسبت کمزور تھا یوں انگریزوں نے سندھ کے راستے افغانستان تک پہنچنے کا پروگرام بنایا۔ تو یہ ہی تجارتی راستہ یعنی شکار پور۔ قندھار والا راستہ استعمال کرنے کا منصوبہ بنا۔ یوں سندھ انگریزون کے تسلط میں پنجاب سے بھی پہلے آ گیا اور انگریزوں نے پہلی افغان جنگ سندھ کے راستے لڑی اور یوں سندھ کو بھی ہڑپ کر لیا۔ جغرافیہ تاریخ تو نہیں بناتا لیکن اس کا رخ متعین کرنے ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔

❁

امن مکالمہ اور دعوۃ
مولانا وحید الدین خان کی تحریروں کا تجزیہ

یوگندر سکند/ رحمان فیض

عہد جدید کے تقاضوں سے مربوط و ہم آہنگ ہونا متعدد مسلمان مفکرین کا مطمع نظر رہا ہے۔ قومی و ریاستی نظاموں کے حوالے سے کس طرح اسلام کو ایک عالمگیر نظریئے کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے؟ دنیا کے بیشتر ملکوں میں مذہب اور سیاست کو جداگانہ حیثیت دیئے جانے اور مذہب کا دائرہ کار ذاتی معاملات تک محدود کر دیئے جانے کے بعد اسلامی شریعت عالمی نظام میں کس مقام پر فائز نظر آتی ہے؟ کیا اسلامی ریاست کا قیام اسلام کی بنیادی ترجیح ہے؟ منطق اور سائنس کی روشنی میں وحی و الہام کی تفہیم کیونکر ممکن ہے؟ مسلمانوں کو دوسرے مذاہب و عقائد سے تعلق رکھنے والے افراد سے کس قسم کے روابط استوار کرنے چاہئیں؟ کس طرح اپنے عقیدے پر مکمل ایمان کے ساتھ مسلمان اقلیتیں اپنے ملکوں میں محبّ وطن شہریوں کی حیثیت سے زندگی بسر کرسکتی ہیں؟ یہ اور ان سے ملتے جلتے بیشتر سوالات ایسے موضوعات ہیں کہ جن کی وضاحت عہدِ حاضر کے مسلمان مفکرین اپنے اپنے انداز میں کرتے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون میں ایک بھارتی عالم مولانا وحید الدین خان کی تحریروں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو بڑی حد تک اپنی طرز کی منفرد اسلامی فکر کے علمبردار ہیں اور جس کے تحت انہوں نے آج کی دنیا میں اسلام کی نمائندگی کا ازسرِ نو تعین کیا ہے۔ اس مضمون میں خصوصاً مولانا کی اس کاوش کا جائزہ لیا گیا ہے کہ بھارتی مسلمان اقلیت کے لیے اسلام کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ ایک طرف وہ جدید ذہنی تقاضوں سے مربوط و ہم آہنگ نظر آئے تو دوسری طرف مذہب اور ریاست کی بظاہراً متضاد وفاداریوں کے درمیان ایک توازن کو یقینی بنایا جائے۔ اگرچہ خان صاحب کے بنیادی مخاطب

بھارتی مسلمان ہیں اور ان کی منفرد فکر کا مخصوص بھارتی تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے لیکن متعدد بار وہ پوری مسلمان امت کو مخاطب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک میں ان کی تحریروں کے بارے میں بڑھتی ہوئی دلچسپی ان کے نقطہ نظر کی آفاقیت کی ترجمان ہے۔

مضمون کے پہلے حصے میں مولانا وحید الدین خان کی ابتدائی زندگی اور اس پر اثر انداز ہونے والے فیصلہ کن رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان معلومات کی روشنی میں ان کی مذہبی فکر کو بنیادی طور پر اس تذبذب کے شاخسانے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ جس کے تحت 47ء کے بعد کے بھارتی مسلمان خود کو محصور اور نچلی سطح کی اقلیت کے طور پر دریافت کرتے اور بڑھتے ہوئے غربت و افلاس، مستقل اور لگاتار تعصب اور اپنے خلاف روا رکھے جانے والے منظم تشدد کا شکار پاتے ہیں۔ خان صاحب کی یہ منفرد دینی تفہیم اور اس کی جدید دنیا میں حیثیت اس تاثر کا ایک اظہار نظر آتی ہے جسے انہوں نے متحرک اسلامی گروہوں کی کمزوریوں اور مسلمان آبادی کو ایک با قاعدہ اور بقول ان کے مستند دینی قیادت فراہم کرنے میں ناکامی سے اخذ کیا ہے۔

مضمون کے دوسرے حصے میں خان صاحب کے اسلامی تصور کے بنیادی ؟ ڈھانچے اور خاص طور پر ان کی تخلیقی فکر کی اس کاوش پر نظر ڈالی گئی ہے جو ان کے خیال میں ہمارے زمانے کی ضروریات کے عین مطابق ہے۔ اس حصے میں خصوصیت کے ساتھ ان کے تصور امن و سلامتی، بین العقیدہ مکالمے اور دعوۃ یا اسلامی تبلیغ کے ساتھ ساتھ اسلامی نظامِ سیاست پر ان کی رائے کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ابتدائی ایام

وحید الدین خان 1925ء میں مشرقی متحدہ صوبے (موجودہ اتر پردیش) کے قصبے اعظم گڑھ کے نواحی گاؤں بدھاریہ میں پٹھان زمینداروں کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کم سنی ہی میں ان کے والدین کا انتقال ہو گیا اور یوں ان کے چچا صوفی حامد ماجد خان نے انہیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اگرچہ ان کے دوسرے دو بیٹے مغربی طرز کے جدید سکولوں میں زیرِ تعلیم تھے لیکن نوعمر وحید الدین خان کو عالم بننے کے لیے اعظم گڑھ کے نواحی گاؤں سرائے میر کی ایک روایتی دینی درسگاہ مدرسۃ الاسلام میں داخل کروا دیا گیا۔ یہاں وہ چھے برس تک زیرِ تعلیم رہے اور یوں

1944ء میں عالم کا نصاب مکمل کرنے کے بعد فارغ التحصیل ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد خان صاحب اپنے بیشتر ہم مکتب ساتھیوں کے برعکس کسی مدرسے، یا مسجد میں ملازمت کے حصول کی بجائے واپس اپنے گاؤں چلے گئے۔

اپنے خاندان میں واپس آنے کے بعد انہیں اپنے اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ ساتھ دیگر رشتہ داروں کے درمیان جو جدید مغربی تعلیم سے بہرہ ور ہو چکے تھے ایک وسیع خلیج کا احساس ہوا اور یوں وہ ان کے درمیان خود کو تنہا محسوس کرنے لگے۔ مدرسے سے حاصل کی گئی تعلیم پر گہرا غور وخوض کرتے ہوئے ان پر مایوسی کا کچھ ایسا شدید دور آیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے تشکیک ہی کا شکار ہو گئے اور بالآخر اس فیصلے پر پہنچے کہ مدرسے کی تعلیم جدید دنیا کے مسائل کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ یہ دور 1948ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد انہوں نے اس زمانے میں موجود دینی تفسیروں اور تعبیروں پر انحصار کرنے کی بجائے بنیادی اسلامی ذرائع کو ان کے اصل متن سے اخذ کرنا شروع کیا اور یوں انہوں نے اپنے دینی عقیدے کو از سرِنو دریافت کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک طرح سے یہ ان کے لیے از سرِ نو تشکیل کا عمل تھا جو ثقافتی روایت کے طور پر ورثے میں ملنے والے عقیدے کی بجائے خردمندانہ انتخاب کا حامل تھا۔ صدیوں پرانی تشریحوں اور تفسیروں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اور قرآن وحدیث سے براہ راست استفادے کے ذریعے خان صاحب نے اسلام کو ایک ایسی منفرد تفہیم عطا کی جو جدید دنیا سے اپنی مطابقت ثابت کر سکتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنے طور پر انگریزی زبان پر بھی دسترس حاصل کی اور یوں مغربی دانشوروں اور فلسفیوں کے نظریات و تجربات سے آگاہی حاصل کر لی جس کے دوران وہ برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) کے کام سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کے مغربی ادب کے مطالعے نے اسلام کو دنیا کے سامنے کچھ اس انداز میں پیش کرنے کی ضرورت پر زور دیا کہ جس کے ذریعے وہ جدید مغربی تعلیم یافتہ دماغ کو متاثر کر سکے۔(1)

رفتہ رفتہ خان صاحب کی اسلام کے بنیادی ذرائع سے حاصل کردہ یہ دریافتِ نو روحانیت کی معاشرتی ضروریات سے مطابقت اختیار کرتی چلی گئی۔ 1949ء میں خان صاحب کو بنیاد پرست جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کو تفصیل سے پڑھنے کا موقع ملا جن سے وہ بہت متاثر ہوئے اور بالآخر ان کی دینی تفہیم کو ایک جامع دنیاوی نقطہ نظر اور بڑے

معاشرتی انقلاب کی نقیب سمجھتے ہوئے جماعت کے بھارتی حصے ''جماعت اسلامی ہند'' میں شامل ہو گئے۔ جماعت کے ساتھ اپنی گہری وابستگی، نمایاں انتظامی صلاحیت، زورِ خطابت اور سب سے بڑھ کر اپنے ہنرمندانہ قلم کی بدولت وہ جلد ہی جماعت کے اعلیٰ حلقوں میں شمار کیے جانے لگے اور تنظیم میں اپنی شمولیت کے چند ہی برسوں کے دوران اس کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن بن گئے اور اس کے ساتھ رام پور میں جماعت کے اشاعت خانے کے منتظم اعلیٰ کے طور پر خدمات سرانجام دینے لگے۔

وحید الدین خان صاحب نے جماعت کے اردو رسالے ''زندگیٔ نو'' کے لیے باقاعدگی سے لکھنا شروع کیا اور یوں 1955ء میں اپنی پہلی اردو کتاب ''نئے عہد کے دروازے پر'' شائع کروائی۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد ان کی ایک اور کتاب ''مذہب اور جدید چیلنج'' سامنے آئی جس کا بعد میں عربی ترجمہ بھی شائع ہوا اور جو نہ صرف دنیائے عرب میں بہترین فروخت ہونے والی کتاب قرار پائی بلکہ اسے بیشتر عرب یونیورسٹیوں کے نصاب کا حصہ بھی بنا لیا گیا۔ مذکورہ بالا کتابوں کے عنوانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خان صاحب اسلام کی ایسی تعبیر میں دلچسپی رکھتے تھے جو ایک طرف جدید ذہن کے فکری تقاضوں پر پورا اترے تو دوسری جانب اسلام کے بنیادی ذرائع سے اپنا فطری رشتہ بھی برقرار رکھے۔

تاہم مولانا وحید الدین خان جماعت اسلامی سے اپنا ناطہ طویل عرصے تک برقرار نہ رکھ پائے اور ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ جماعت کا منشور جس کے تحت وہ بھارت میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کی خواہاں تھی نہ صرف غیر عملی تھا بلکہ بھارتی مسلمانوں کی حالتِ زار کے تحت اسلامی فکر کے منافی بھی تھا۔ جیسے جیسے وہ مولانا مودودی کی تحریروں کی گہرائی میں اترتے چلے گئے ان کا یہ خیال یقین میں بدلتا چلا گیا کہ مودودی کا اسلام کے بارے میں بنیادی نقطہ نظر ہی غیر حقیقی اور مبہم تھا اور جو مغربی استعماریت کا ایک ردعمل تھا نہ کہ اسلام کی حقیقی تفہیم کا ایک اظہار۔ بالآخر خان صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ مولانا مودودی نے مسلمان دنیا کے زیادہ تر حصے پر یورپی نوآبادیاتی تسلط کے چیلنج کے طور پر اسلام کی خالصتاً سیاسی بنیادوں پر تشریح کی تھی جس کے تحت اسلامی مشن کا جائزہ سادہ نظریاتی بنیادوں کی بجائے خالصتاً سیاسی بنیادوں پر لیا گیا تھا اور جس میں مقصد کے حصول کے لیے تشدد آمیز ذرائع کے استعمال کی واضح گنجائش موجود تھی۔ خان صاحب

نے مولانا مودودی کی اس دینی تفہیم کا جائزہ فطری طور پر ابھرنے والی گہری اور خالص روحانی جستجو کی بجائے مسلمانوں کی مغرب کے ہاتھوں شکست کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساسِ زیاں کے طور پر لینا شروع کر دیا۔(2) رفتہ رفتہ خان صاحب کو یہ ادراک بھی ہوا کہ جماعت اسلامی کا سیاسی نقطہ نظر بھارتی مسلمان اقلیت کے حالات وضروریات سے مطابقت نہیں رکھتا۔

خان صاحب نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو بھارت میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد پر آمادہ کرنے کی بجائے مسلمانوں اور دوسرے عقائد سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان روابط استوار کرنے کی سعی کرنی چاہیے کیونکہ اسلامی ریاست کا قیام بھارت کے مخصوص تناظر میں نہ صرف غیر عملی تھا بلکہ ایسی کوئی کوشش ہندو اکثریت کو مزید برانگیختہ کر سکتی تھی۔ جماعت کے ایک بڑے منصب پر فائز ہونے کے باوجود خان صاحب نے جماعت کے نظریات اور پالیسیوں پر اپنے اختلافات کا برملا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ جب یہ اختلافات مزید بڑھنا شروع ہوئے تو انہوں نے 1962ء میں جماعت سے اپنی پندرہ سالہ رفاقت کو خیر باد کہہ دیا۔

بقول خان صاحب کے جماعت کے سیاسی رجحانات کی حامل مذہبی فکر سے مایوس ہونے کے بعد اب ان کے دل میں احیائے دین سے متعلق الٰہیاتی مذہبی فکر کی حامل اسلامی تحریک تبلیغی جماعت کی رغبت پیدا ہوئی۔ تبلیغی جماعت میں ان کی اس دلچسپی کی وجہ اس کی جماعتی سیاست سے مکمل کنارہ کشی تھی جو جماعت اسلامی کی اسلامی سیاسی نظام کی جدوجہد کی بجائے فرد کی اصلاح و ترویج پر توجہ دیتی تھی۔ بھارتی مسلمانوں ایسی محروم و مایوس اقلیت کے لیے تبلیغی جماعت کی ریاست کے حصول کی بجائے فرد کی دینی اصلاح کی کوشش نہ صرف زیادہ منطقی تھی بلکہ سنت نبویؐ کے عین مطابق بھی تھی۔(3) لیکن جماعت کے ساتھ کچھ برس بتانے کے بعد وحیدالدین خان اس سے بھی بیزار ہو گئے اور 1975ء میں اس سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اس تحریک کو اجتہاد سے کوسوں دور پایا جو بدلتے ہوئے معاشرتی حالات میں بھارتی مسلمانوں کے لیے ایک ممکنہ تخلیقی ذریعہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے تبلیغی جماعت کو ناقدانۂ خودمختارانہ اور تخلیقی فکر کے علاوہ سائنسی جستجو سے بھی عاری پایا۔ ایسی فکر نہ صرف ان کی دانشورانہ پیش رفت کے راستے میں حائل تھی بلکہ اسلام کی حقیقی روح کے بھی خلاف تھی۔(4)

نئی دینی فکر کا احیاء

اگرچہ وہ تبلیغی جماعت کے اس مثبت رول کے قائل تھے جو اس نے عام مسلمانوں میں اسلامی سمجھ بوجھ پیدا کرنے میں ادا کیا لیکن وہ اس سے کہیں بڑھ کر ایک ایسی نئی دینی فکر کی ترویج کی ضرورت پر یقین رکھتے تھے جو جدید دور کے تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ذہنی تقاضوں پر بھی پورا اترتی ہو۔ اور بالآخر انہوں نے 1976ء میں نئی دہلی میں اسلامی مرکز کے نام سے اپنے تحقیقی ادارے کا احیاء کیا جس میں ''الرسالہ'' کے نام سے جاری ہونے والے ماہانہ اردو جریدے کے ذریعے اپنے منفرد نقطہ نظر کی اشاعت کا آغاز کیا جو ان کے نزدیک اسلام کو جدید دور کے تقاضوں سے مربوط و ہم آہنگ کرتا تھا۔ اس جریدے کے تقریباً تمام ہی مضامین خود ان کی اپنی تصنیف ہوتے۔ 1984ء میں اس جریدے کے انگریزی ایڈیشن کا اجراء ہوا جس کے بعد 1990ء میں اس کے ہندی ایڈیشن کا آغاز بھی ہو گیا۔ یہ جریدہ بھارت کے ساتھ ساتھ بیرون ملک آباد لوگوں کی ایک بڑی تعداد میں کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے جبکہ اس کے بیشتر شمارے انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہیں۔

اس رسالے کے اجراء کے ساتھ ساتھ خان صاحب نے اب تک دو سو سے زائد کتب بھی تصنیف کی ہیں جن میں زیادہ تر اردو زبان میں ہیں اور جن کا عربی کے ساتھ ساتھ یورپی اور دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ خان صاحب عہد حاضر کے اہم مسائل پر اسلامی نقطہ نظر کی ترجمانی کے لیے متعدد بھارتی اخباروں کے لیے بھی لکھتے ہیں۔ وہ یقیناً ان معدودے چند بھارتی علماء میں سے ہیں جو قومی دھارے کی غیر مسلم صحافت سے براہ راست منسلک ہیں۔

اگر مولانا وحید الدین خان کی منفرد اسلامی تفہیم کے پس منظر کے محرکات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے ساتھ ان کی برسوں کی رفاقت اور بھارت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑھتے ہوئے مسائل کے علاوہ مسلم دنیا کے بڑے حصوں میں ابھرنے والی شدت پسند اسلامی تحریکیں نمایاں محرکات کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ یہی وہ پس منظر ہے کہ جس نے نہ صرف اس فکری تحریک کے نشو و ارتقاء کے لیے ایک راستہ متعین کیا بلکہ اس کے جدید دنیا میں مقام اور کردار کا تعین بھی کیا۔ جہاں عقیدے میں سیاسی کی بجائے انفرادی نقطہ نظر کی

ترویج پر مبنی اصلاحات خان صاحب کی تبلیغی جماعت کے ساتھ وابستگی کے اثرات کا اظہار ہیں تو وہیں انقلابی اجتہاد کی ضرورت پر زور اور صدیوں سے مستعمل تفسیر وتشریح کی صورت میں موجود اسلامی مواد سے اجتناب کرتے ہوئے اسلام کے بنیادی ذرائع یعنی قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ انہیں تبلیغی فکر سے منفرد اور جداگانہ فکر کا حامل بنا دیتے ہیں۔(5) اگرچہ وہ بھی شدت پسند اسلامی حلقوں کی طرح اجتہاد کی فوری ضرورت پر زور دیتے ہیں لیکن ان کے ہاں شریعت کی تخلیقی فکر کا مفہوم بالکل جداگانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔

مولانا وحید الدین خان کا بنیادی مطمعِ نظر اسلام کو جدید دنیا کے سامنے ایک نہایت موزوں مذہبی فکر کے طور پر پیش کرنا ہے جیسا کہ ان کی تحریروں میں ہندوستان کے کثیر الاقوامی مسائل، بین المذاہب مکالمہ اور امن جیسے موضوعات پر سیر حاصل تجزیے سے واضح ہوتا ہے۔اس کے مقابلے میں شدت پسند اسلامی سوچ میں خطیبانہ جوش وجذبہ اور تبلیغی جماعت کی بے نیازی کی صورت میں روایتی فقہ کی جدید وضاحت سے انکار کو اگر ایسے موضوعات پر سنجیدہ غور وفکر سے عدم دلچسپی نہ کہا جائے تو عدم قابلیت ضرور کہا جا سکتا ہے۔اب ہم خان صاحب کی اس منفرد فکر کا جائزہ لیتے ہیں کہ جس کے تحت انہوں نے اسلام کو عہد حاضر کے تقاضوں سے مربوط وہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک ایسی سوچ کی ترجمانی ہے کہ جو نہ صرف مستند ہونے کی دعویدار ہے بلکہ آج کے موضوعات سے متعلق بھی ہے۔

امن، مکالمہ اور کثیر الاقوامی چیلنج

مولانا وحید الدین خان کا شمار گنتی کے ان چند بھارتی علماء میں ہوتا ہے کہ جو بیشتر دوسرے مسلمان مکاتب کی دوسرے مذاہب کے لوگوں خصوصاً ہندوؤں کے بارے میں رٹی رٹائی، مناظرانہ اور یکطرفہ رائے کی بجائے کثیر الاقوامی مسائل اور بین الآبادیاتی تعلقات جیسے موضوعات پر سنجیدگی سے بات کرتے نظر آتے ہیں۔(6) 70ء کی دہائی کے وسط میں ولفریڈ کانٹویل سمتھ (Wilfred Cantwell Smith) نے مسلمانوں کی خود کو کثیر الاقوامی اور کثیر المذاہب ہندوستان میں ایک مساوی قوم اور شہریت کے طور پر اجاگر کرنے میں ناکامی پر ایک سادہ اور واضح اسلامی موقف کو مسلمان قوم کے لیے نہایت اہمیت کا حامل قرار دیا تھا۔(7)

درحقیقت یہ وہی اسلامی موقف ہے جس کا اظہار خان صاحب کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ محروم اقلیت کا حصہ ہوتے ہوئے بھارتی مسلمان کا تذبذب جو خود کو مسلح ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے خطرات کے سامنے خوف و دہشت کا شکار پاتا ہے' ایک ایسا موضوع ہے جسے خان صاحب نے اپنی پہلی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ مسلمانوں کو وحشت و خوف اور علیحدگی پسندانہ سوچ کے حصار سے باہر آنا چاہیے۔(8) اور بظاہراً حالات کے مخالف بہاؤ کے باوجود بہتر مواقعے کی تلاش کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کے افراد کے ساتھ مل کر ایک نئے معاشرے کی تشکیل کرنی چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی سرپرستی کرنے والوں کو گم گشتہ خیالات کی بجائے حقیقت پسندانہ فکر سے کام لینا چاہیے۔(9) ان کے خیال میں مسلمانوں کو مایوسی کے عالم میں کنارہ کشی اختیار نہیں کرلینی چاہیے کیونکہ اسلام مایوسی کو بہت بڑا گناہ قرار دیتے ہوئے اس سے منع کرتا ہے۔ یہاں خان صاحب قرآن کا حوالہ دیتے ہیں جس میں ارشاد ہوتا ہے ''کسی کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان نہیں رکھتے۔'' (القرآن 12:87) (10)

بھارت کے بیشتر مسلمان علماء کے برعکس خان صاحب کا موقف یہ ہے کہ مسلمانوں کی زیادہ تر مایوسی خود انہی کی پیدا کردہ ہے۔ بھارتی مسلمانوں کو نسبتاً غریب' غیر تعلیم یافتہ اور پسماندہ حالت میں دیکھتے ہوئے اور کبھی کبھار منظم دہشت گردی کا شکار پاتے ہوئے خان صاحب اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ان مصائب و مشکلات کی بنیادی وجہ مسلمانوں کا اسلام کے راستے سے اجتناب اور دینی تعلیمات پر عمل کرنے سے احتراز ہے۔ وہ اصرار کرتے ہیں کہ خدا نے اپنی ناراضگی کے اظہار کے طور پر دوسروں کو ان پر مسلط کر دیا ہے اور اس طرح یہ قرآن کے ان کو خیر الامہ قرار دیئے جانے کے بعد ان پر عائد ہونے والی الٰہیاتی ذمہ داریوں سے کوتاہی کی سزا ہے۔ خان صاحب دلیل دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی مشکلات کا الزام دوسروں پر عائد نہیں کرنا چاہیے اور ان کے ساتھ احتجاج اور محاذ آرائی کا رویہ ترک کر دینا چاہیے۔(11) چونکہ ان کی مشکلات اسلامی تعلیمات سے انحراف کے نتیجے میں خدا کے غضب کا نتیجہ ہیں اس لیے انہیں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔ اگر مسلمان اپنی ذاتی زندگیوں اور معاشرتی تعلیمات میں پختگی کے ساتھ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں تو فضل و اکرام خداوندی سے نوازے جائیں گے اور یوں نہ صرف ان

کی تہہ در تہہ مشکلات ہی کا خاتمہ ہو جائے گا بلکہ انہیں دوسروں پر واضح فتح بھی حاصل ہو جائے گی۔(12) یوں خان صاحب کے نزدیک مسلمانوں کو اپنی اندرونی اصلاحات کی جانب توجہ مرکوز کرنی چاہیے نہ کہ ریاست یا قابض ہندوؤں سے محاذ آرائی کے ذریعے ان مشکلات کو ختم کرنا چاہیے۔اس نقطہ نظر کے تحت مسلمانوں کے لیے ایک ایسی منفرد اور باصلاحیت قیادت کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے جو ان کی رہنمائی تخریبی کی بجائے تعمیری انداز میں کرے۔

خان صاحب مسلمانوں کے دوسری اقوام کے ساتھ امن قائم کرنے اور نئے رشتے و رابطے استوار کرنے کو نہایت اشد اور ضروری قرار دیتے ہیں۔عہد حاضر کے بھارت میں مسلح ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے خطرات نے ملک میں آباد مسلمانوں کو عدم تحفظ کے بڑھتے ہوئے احساس سے دوچار کیا ہے۔کچھ اسلامی گروہوں نے ان خطرات کے موثر سد باب کے لیے جہاد کی صورت میں مسلح تصادم کی ضرورت پر زور دیا ہے۔خان صاحب کے نزدیک یہ ایک منفی رجحان ہے کیونکہ نہ صرف یہ مسلمان قوم کے مفادات کے لیے بڑے خطرے کا باعث بن سکتا ہے بلکہ قرآن بھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔وہ ایسے لوگوں کی تشبیہ جو دوسری اقوام کے ساتھ مسلح تصادم کا درس دیتے ہیں' قرآن اور انجیل میں مذکور جھوٹے نبیوں سے دیتے ہیں جو اسرائیل کے بچوں کو خدا کے راستے سے بھٹکاتے تھے' انہیں جھوٹی انا کی شراب پلاتے تھے' ان کی عظمت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے' ان کے جذبات کو بھڑکاتے اور انہیں ایک فرضی جنت کی راہ دکھلاتے تھے۔(13)

خالص گروہی مفادات اور دنیاوی فوائد سے تحریک پانے کی بجائے جو ان کی نظر میں حرام اور عصبیت پر مبنی ہیں اور جن کی قرآن شدید مذمت کرتا ہے' خان صاحب مسلمانوں پر زور دیتے ہیں کہ وہ اسلام کی حقیقی تعلیمات پر مکمل عملدرآمد کریں۔(14) مزید برآں وہ انہیں تاکید کرتے ہیں کہ دنیاوی مفادات پر مبنی اپنے نقطہ نظر کو وہ اسلام یا اسلامی جہاد کے لبادے میں پیش نہ کریں۔(15) خان صاحب کا موقف ہے کہ اسلام درحقیقت سلامتی کا مذہب ہے اور وہ مسائل کے ہر ممکن حد تک پرامن حل پر زور دیتا ہے حتیٰ کہ مسلح تصادم ناگزیر ہو جائے۔وہ کہتے ہیں کہ آج بھارت میں امن کی بہت سی ایسی راہیں کھلی ہیں کہ مسلمان جن پر چلنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔بین المذاہب مکالمہ ان کے نزدیک ایسا ہی ایک نہایت اہم راستہ ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ قرآن مسلمانوں کے دوسرے عقائد کے لوگوں کے ساتھ مکالمے کی

بھرپور حمایت کرتا ہے جو ایک خدا پر یقین اور اعمال صالحہ کی مشترک بنیادوں پر شروع کیا جا سکتا ہے۔ اور ایسے میں تمام عقائد کے حامل لوگوں کو اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کا مکمل حق حاصل ہے جیسا کہ قرآن میں آتا ہے ''تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین'' (القرآن 109:6)(16)

وہ لکھتے ہیں کہ ہر مذہب چند بنیادی انسانی اقدار کا تقاضہ کرتا ہے جن میں محبت، ہمدردی اور امن کے ساتھ ساتھ غریبوں اور پسماندہ طبقات کی خدمت کے جذبات شامل ہیں۔ یہی وہ بنیادی اقدار ہیں جو کسی مکالمے کے آغاز کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کر سکتے ہیں۔ مزید برآں اسلام کے نقطہ نظر کے مطابق خدا کی مخلوق کی حیثیت سے تمام انسان ایک دوسرے کے لیے بھائی بہن کا درجہ رکھتے ہیں اور یوں اسلام مسلمانوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ روحانی طور پر بھی بھائی اور بہنوں ہی کی طرح رہیں۔ نبی اسلام حضرت محمد صلعم نے ہمیشہ مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ ہر انسان کے ساتھ عزت سے پیش آئیں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کا احترام کریں(17) اس طرح اسلام مسلمانوں کو اپنے عقائد پر عمل کرتے ہوئے مختلف مذاہب کے لوگوں کے ساتھ باہمی عزت و احترام کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا درس دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مختلف النوع مذاہب کی مشترک صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کا یہ واحد حقیقی راستہ ہے۔(18)

خان صاحب کہتے ہیں کہ بھارتی مسلمانوں کی آج کی صورتحال حضور اکرم صلعم اور ان کے صحابہ کی مکہ کی صورتحال سے بہت مشابہت رکھتی ہے کہ جب نوخیز مسلم معاشرہ چھوٹا اور قدرے کمزور تھا۔ جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ نے اس موقع پر خود کو صرف پرامن اشاعتِ اسلام تک ہی محدود رکھا بالکل اسی طرح عہد حاضر کے بھارتی مسلمانوں کو بھی دوسرے افراد کے دل تمام باہمی اختلافات فراموش کر کے اسلام کی پرامن اشاعت اور مکالمے کے ذریعے جتنا چاہئیں۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ اپنی ہدایت و رہنمائی کے لیے قرآن و سنت کے پس منظر میں قیام مکہ کا نمونہ پیش نظر رکھیں۔(19)

وحید الدین خان کہتے ہیں کہ اسلامی فکر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بھارتی مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے افراد کے ساتھ مشترک اقدار کی بنیادوں پر تعلقات استوار کرنا چاہئیں اور سنتِ نبویؐ کو پیش نظر رکھ کے ان کے ساتھ مل کر ایک انصاف پسند، خوشحال اور امن پسند معاشرے

کی تشکیل کرنی چاہیے۔ اس طرح انہیں جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہو کر ملک کو درپیش اجتماعی مسائل اور مشکلات کے حل کے لیے بھرپور کوششیں کرنا چاہئیں (20) اور موجودہ صورتحال کی مانند صرف اپنے گروہی مفادات کے حصول کی سوچ کو ترک کر دینا چاہیے۔ (21) یوں وہ دوسروں کے سامنے یہ مثال قائم کر دیں گے کہ معاشرے کو درپیش وسیع و پیچیدہ مشکلات کے حل کے لیے اسلام جامع حل پیش کرتا ہے۔ خان صاحب مدلل انداز میں کہتے ہیں کہ یہی وہ طریقہ ہے کہ جس پر عمل کرتے ہوئے مسلمان ایک وسیع تر معاشرے کے لیے اپنی افادیت کا ثبوت دے سکیں گے اور جس کے نتیجے میں دوسرے لوگ نہ صرف ان کا اہم تحادیوں کے طور پر احترام کریں گے بلکہ اسلام کو ایک مذہبی انتخاب کے طور پر قبول بھی کر سکیں گے۔

مولانا وحید کے نقطہ نظر کے مطابق مسلمانوں کو معاشرے کی عظیم تر اصلاح کے لیے اپنی خدمات پیش کر دینی چاہئیں اور اپنی حیثیت کو ''لینے والے'' کی بجائے ''دینے والے'' میں تبدیل کر دینا چاہیئے۔ (22) اس کے ساتھ ساتھ ایک پرامن مکالمہ دوسروں کی اسلام کے بارے میں قائم ہونے والی ''تشدد پسند مذہب'' کی رائے کو تبدیل کرتے ہوئے مسلمانوں کو عالمگیر زندگی کے بنیادی دھارے میں شامل ہونے کے مواقع بھی فراہم کرے گا۔ (23) اگر مسلمان خود کو وسیع تر معاشرے میں امن کے فروغ کے لیے وقف کر دیتے ہیں تو ان توانائیوں کا رخ معاشی و تعلیمی ترقی کے حصول کی جانب ہو جائے گا اور یہ ایک ایسا پہلو ہے جسے انہوں نے اپنے ماضی کے شدت پسند رویئے کی بناء پر مکمل طور سے نظرانداز کر دیا ہے۔ (24) خان صاحب کے نزدیک فروغ امن کی کوششوں کا یہ مطلب ہونا چاہیے کہ مسلمان دوسرے مذاہب کے لوگوں کے پاس تعمیری مکالمے کے جذبے کے ساتھ پہنچیں۔

خان صاحب کا شمار گنتی کے ان چند علماء میں ہوتا ہے کہ جو سنجیدگی سے دوسرے مذاہب کے نمائندوں کے ساتھ بین المذاہب مکالمے میں مشغول رہتے ہیں اور جس دوران وہ باقاعدہ مقرر یا شریک گفتگو کی حیثیت سے شرکت کرتے ہیں حتیٰ کہ ان کے مخاطبین میں جنگجوانہ نقطہ نظر کے حامل مسلمان مخالف گروہ مثلاً راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ (RSS) بھی شامل ہیں۔ اس امر کی وضاحت وہ اس بات سے کرتے ہیں کہ بھارت میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ زندگی بسر کرنا سیکھنا ہوگا۔ حکومت کو مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرانے کی بجائے وہ کہتے

ہیں کہ مسلمانوں کو معاشرے کے تمام طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد سے بہتر تعلقات استوار کرنے کی کوششیں کرنا چاہئیں اور صرف یہی ایک قدم ان کے مفادات کے تحفظ کی ضمانت بن سکتا ہے۔ اگر چہ اپنے اس رویئے کی بناء پر انہیں کچھ مسلمانوں کی جانب سے مولانا آر ایس ایس (RSS) کا ''خطاب'' بھی مل چکا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اس عزم پر کاربند ہیں کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی اشاعت کے لیے مسلمانوں کو اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی بہتر تعلقات استوار کرنا چاہئیں۔

مولانا وحید الدین خان کے نزدیک مذاہب کی بنیادی اقدار پر مشتمل مشترک نقطہ نظر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام مذاہب یکساں طور پر مستند ہیں۔ خان صاحب کے موقف کے مطابق اسلام وہ واحد مذہب ہے کہ جس کا تمام کلام اپنے اصل متن میں موجود ہے اور اسی لیے وہ سب سے جامع مذہب ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حق کے ایک متلاشی کے لیے صرف ایک ہی انتخاب بچ رہتا ہے اور وہ انتخاب اسلام ہے' وہ واحد مذہب جو تاریخی سند کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ (25) ان کے نزدیک اسلام اور دوسرے مذاہب کا باہمی تعلق بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے جدید کیمسٹری اور الکمی کا۔ اگر چہ ان کا بنیادی ماخذ ایک ہی ہے لیکن جدید کیمسٹری کی طرح اسلام کی بنیاد سائنسی طور پر مصدقہ حقائق پر ہے جبکہ الکمی کی طرح دوسرے مذاہب کی بنیاد غیر مستند مفروضات پر ہے۔ (26) البتہ اسلام کی اس سبقت کو دوسروں کے ساتھ مکالمے کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔ خان صاحب کے مطابق ایک حقیقی مکالمے کا مطمع نظر مذاہب کے درمیان موجود بنیادی اختلافات کا خاتمہ نہیں ہے نہ ہی اس کا مقصد مختلف مذاہب کی تعلیمات پر مشتمل ایک نئے مذہبی ملغوبے کا قیام ہے۔

خان صاحب کا موقف ہے کہ اسلام بین المذاہب مکالمے کے موضوع پر نہایت حقیقت پسندانہ نقطہ نظر رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام مختلف مذاہب کے درمیان موجود فرق کو تسلیم کرتا ہے اور مسلمانوں کو دوسرے عقائد سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ عزت سے پیش آنے کی تلقین کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کا دوسرے مذاہب کے بارے میں نقطہ نظرِ دوطرفہ اصول پر مشتمل ہے' اول اختلاف پر اتفاق کیا جائے اور دوئم مذہبی لوگوں کا اتحاد قائم کیا جائے نہ کہ مذاہب کا انضمام۔ خان صاحب کہتے ہیں کہ اسلام یہ کہتے ہوئے مذاہب کے باہمی وجود کو تسلیم کرتا ہے کہ

''تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین''۔ وہ کہتے ہیں کہ باہمی رضا و تسلیم کا یہ قانون پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں مثالی حیثیت کا حامل ہے۔ آپؐ نے مدینے کی مسجد میں یہودیوں، مسیحیوں اور مسلمانوں کے مابین مکالمے کا انعقاد کروایا جو اس لحاظ سے تاریخ انسانی میں اپنی مثال آپ ہے کہ اس کے دوران مسجد میں یہودیوں اور مسیحیوں کو اپنے اپنے انداز میں عبادت کی اجازت دی گئی۔(27)

خان صاحب کے مطابق نہ صرف قرآن پاک میں یہ صراحت کے ساتھ آیا ہے بلکہ حضور اکرمؐ کا یہودیوں اور مشرکینِ مدینہ کے ساتھ میثاق بھی اس بات کا غماز ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے ساتھ امن کے ساتھ رہنا چاہیے، انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی دینی چاہیے اور کسی بھی صورت میں ان کے عقیدے کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔(28) یعنی اگرچہ اسلام اپنی انفرادیت، تشخص اور برتری پر اصرار کرتا ہے اور مذاہب کے بنیادی اختلافات کو باہمی ادغام کے ذریعے ختم کرنے کی شدت سے مخالفت کرتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ مختلف عقائد سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے درمیان رواداری، اشتراکِ عمل اور باہمی احترام و تعاون کی ہدایت کرتا ہے۔ خان صاحب کہتے ہیں کہ اختلاف کی بجائے یہ ایک اتحاد ہے جو ان کے نزدیک ''بغیر اختلافی اتحاد'' کی نسبت زیادہ حقیقت پسندانہ طرزِ عمل ہے۔(29) اسی سلسلے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو اسلام کی انفرادیت اور الگ تشخص سے باخبر رہتے ہوئے دوسرے مذاہب اور مذہبی گروہوں کے ساتھ عزت و احترام کا سلوک کرنا چاہیے۔(30) خان صاحب کی نظر میں بین المذاہب مکالمے کا مطلب اشاعت اسلام کے فرض سے کوتاہی نہیں ہے بلکہ ان کے مطابق درحقیقت مکالمہ اشاعت اسلام (دعوۃ) کے نئے در وا کرتا ہے۔ صرف دوسروں کے ساتھ دوستانہ اور پرامن تعلقات استوار رکھتے ہوئے ہی مسلمان ان کو اسلام کی حقانیت پر قائل کر سکتے ہیں۔

خان صاحب کے نقطہ نظر کے مطابق دعوۃ کا عمل مکمل طور پر پُرامن معاملہ ہے جیسا کہ قرآن میں آتا ہے کہ مذہب کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ یوں دعوۃ اشاعت اسلام کی پرامن سعی کے طور پر اسلام کی حقیقی جدوجہد کا نام ہے۔(31) پیغمبر اسلامؐ کے وصال کے بعد دعوۃ کے فرض کی ادائیگی اب تمام تر امت مسلمہ پر عائد ہوتی ہے۔ یہ امت کی بنیادی ذمہ داری ہے جسے اس نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔(32) مسلم امہ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ کلامِ الٰہی کی ترویج

کرے، نیکی کی تلقین کرے اور برائی سے روکے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے کہ جس پر چل کر مسلمان خدا کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں اور یہی ان کے تحفظ اور دفاع کا واحد ذریعہ بھی ہے۔ خان صاحب کہتے ہیں کہ دعوۃ کے فرض سے انحراف خدا کی ناراضگی کو دعوت دیتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی محکومی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کلامِ الٰہی کی اشاعت کے اپنے بنیادی فرض سے اغماض برتا ہے۔ اگر اشاعت اسلام کے دوران غیر مسلم اس دعوت کا مثبت جواب دیتے ہیں اور اسلام قبول کر لیتے ہیں تو ان کی جانب سے مسلمانوں کو درپیش خطرات از خود ختم ہو جائیں گے۔ تاہم اگر وہ دائرہ اسلام میں داخل نہیں بھی ہوتے تو بھی اسلامی دعوۃ کا خیر سگالی عمل ان کے دلوں سے مسلمانوں کی کدورت کا خاتمہ کر دے گا۔(33)

خان صاحب کہتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے دشمنوں کو دوستوں میں بدلنا چاہیے بالکل اسی طرح کہ جیسے نبی اکرمؐ نے ہر برائی کا جواب بھلائی سے دیا۔ اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ محاذ آرائی کے ذریعے اپنا دشمن بنانے کی بجائے اسلامی تعلیمات اور اپنے مثبت کردار کے ذریعے متاثر کرنا چاہیے۔(34) خان صاحب کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو دعوۃ کے عمل میں پیش آنے والی ممکنہ شدید مزاحمت سے دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ایک اچھا دوکاندار اپنے خوش آئند گاہک کے ناراضگی کے الفاظ کو بھی خوش دلی سے قبول کرتا ہے۔ اگر وہ بھی ردعمل کے طور پر ناراضگی کا اظہار کرنے لگے تو جلد ہی اپنے گاہکوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اسی طرح ایک اچھا مسلمان مبلغ دوسروں سے معاملات بڑھانے میں مخالفت یا ناراضگی کو نظر انداز کر دیتا اور اس کے بدلے احسن طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ انہیں اسلام کی جانب راغب کرنے کا یہ واحد راستہ ہے۔(35) زیادتی کے بدلے میں صبر و برداشت قرآن کا بنیادی اصول ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو دوسروں کے ساتھ اپنے طرزِ عمل میں صبر و برداشت کا مظاہرہ کرنا چاہیے اگرچہ ان کا رویہ کتنا ہی اشتعال انگیز کیوں نہ ہو۔(36) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو فتح کی بشارت دیتا ہے جو اس کے ساتھ وابستگی میں ثابت قدمی سے ڈٹے رہتے ہیں اگرچہ وہ اپنے مخالفین سے تعداد کے لحاظ سے کتنے ہی قلیل کیوں نہ ہوں۔(37) خان مزید لکھتے ہیں کہ حضرت محمد صلعم اپنے تمام تر تبلیغی دور میں ثابت قدمی کے ساتھ اس اصول کا عملی مظاہرہ کرتے رہے۔ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرام کو مخالفین مکہ کی جانب سے شدید زیادتیوں کا

نشانہ بنایا گیا لیکن وہ دل جمعی کے ساتھ اشاعتِ اسلام کے مشن پر ڈٹے رہے اور بالآخر تقریباً تمام تر جزیرہ نما عرب کو حلقہ بگوشِ اسلام کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

خان صاحب میثاقِ حدیبیہ کا بار بار تذکرہ کرتے ہوئے اسے مسلمانوں کے لیے تقلید کا قابل عمل نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔اپنی نبوت کے انیسویں سال حضرت محمد صلعم نے قریش مکہ کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر ایک دس سالہ میثاق باندھا جس میں کچھ ایسی شقیں بھی شامل تھیں کہ جو کچھ صحابہ کرام کے نزدیک مسلمانوں کے لیے توہین آمیز تھیں۔البتہ قرآن نے اسے ''فتح مبین'' سے تعبیر کیا جو بعد میں بالکل ویسا ہی ثابت ہوا۔اس معاہدے کی دستاویز پر قریش نے نبی اسلامؐ کو اپنا نام ''اللہ کے رسول'' کے طور پر لکھنے سے منع کر دیا اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے بارے میں ''عبداللہ کا بیٹا محمدؐ'' لکھیں۔اس کے علاوہ انہوں نے مسلمانوں کو اس سال مکہ آکر عمرہ ادا کرنے سے روک دیا اور یہ بھی اصرار کیا کہ اگر کوئی شخص مکہ سے آکر مدینہ میں پناہ لینا چاہے گا تو اسے قریش کو واپس کر دیا جائے گا۔خان صاحب کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے قریش مکہ کی یہ بظاہر اتوہین آمیز شرائط بھی مان لیں کیونکہ آپؐ کے ذہن میں ایک نہایت جامع اور ارفع تبلیغی منصوبہ موجود تھا۔قریش کے ساتھ امن کے اس معاہدے نے مسلمانوں کے لیے دعوۃ کے نئے در وا کیے جن کے ذریعے آئندہ کے چند ہی برسوں میں نہ صرف قریشِ مکہ ہی نے بلکہ تقریباً تمام خطہ عرب نے اسلام قبول کرلیا۔(38) اس سے ثابت ہوتا ہے امن کی قوت جنگ کی قوت سے کہیں بڑی قوت ہے۔(39)

خان صاحب کہتے ہیں کہ دعوۃ کے کام کو سنجیدگی سے اختیار کرنے کے لیے مسلمانوں کو دوسروں کے لیے اپنا زاویہ نظر مکمل طور پر تبدیل کرنا ہوگا۔ان کے نزدیک روایتی اسلامی فقہ کا احیاء مسلمانوں کی سیاسی بالادستی کے دور میں ہوا تھا اور اسی کے نتیجے میں مسلمانوں میں سیاسی حکمرانی کی سوچ نے رواج پایا۔اور یوں خود کو حقیقی تبلیغی جذبے سے سرشار کرنے کی بجائے ان میں فاتحانہ فکر کی آبیاری ہوئی اور اسلام کے بارے میں ان کا نقطہ نظر ''فخر والے اسلام'' کا ہو گیا۔(40) درحقیقت یہ اس نقطہ نظر کی عکاسی کرتا ہے کہ جس کے تحت مسلمان مفکرین اپنے اطراف میں دنیا کا تجزیہ کرتے تھے اور یوں انہوں نے دنیا کو دو انتہائی یکطرفہ اور شدت آمیز دھڑوں ''دارالاسلام'' اور ''دارالحرب'' میں تقسیم کر دیا۔خان صاحب کے نزدیک دنیا کو دیکھنے کا یہ غیر اسلامی انداز ہے کہ

جو توسیع پسندانہ ہونے کے ساتھ ساتھ بنیادی طور پر جارحانہ بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ درحقیقت غیر مسلموں کی حکمرانی کے زیر اثر کسی علاقے کو دارالحرب قرار نہیں دیا جاسکتا سوائے ان علاقوں کے کہ جہاں مسلمانوں کو اپنے عقیدے سے وابستگی کی بناء پر ظلم کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور وہ اپنے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھالیتے ہیں۔

خان صاحب کہتے ہیں دنیا کی ایسی نظریاتی تقسیم کرتے ہوئے ایک تیسری قسم کو بالکل نظرانداز کر دیا جاتا ہے جسے وہ ''دارالدعوۃ'' کا نام دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں روایتی شریعت دان سیاسی حکمرانی کی اپنی سوچ کی بناء پر غیر مسلموں کو اپنے حقیقی یا امکانی مخاطب کے طور پر پہچاننے کے امید افزاء امکان کو بالکل نظرانداز کر دیتے ہیں۔ خان صاحب کا نقطہ نظر ہے کہ اسلام اپنی اصل میں کوئی سیاسی پروگرام نہیں ہے اور روایتی علماء کے اس سخت گیر دو رخے پن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ جس کے تحت مسلمانوں کا تجزیہ حکمرانی یا عدم حکمرانی کے پس منظر میں کیا جاتا ہے۔ خان صاحب تاکید کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کو اپنا مخالف یا دشمن سمجھنے کی بجائے انہیں خدا کے بڑے خاندان کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے اور اس کے علاوہ مستقبل میں ان کے قبول اسلام کے خوش کن امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں اپنا ہی ساتھی سمجھنا چاہیے اور یوں مسلمانوں کو ان کے سامنے نہایت احسن اور پرامن طریقے سے دعوۃ کا پیغام پیش کرنا چاہیے۔ لیکن اس سارے عمل سے پہلے مسلمانوں کو خود اپنے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ خود کو داعی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا حکمران کی۔ (41)

خان صاحب کے نزدیک عہد حاضر کے مسلمانوں کے پیش نظر اولین مقصد ''فخر والے اسلام'' کے غیر حقیقی نقطہ نظر کو ترک کر کے ''تواضع والے اسلام'' کے حقیقی نقطہ نظر کو اپنانا چاہیے۔ اور جس کی بنیاد تکبر، محاذ آرائی، نفرت اور جھگڑے کی بجائے خوف خدا، محبت، امن اور بھائی چارے پر ہونی چاہیے۔ (42) وہ لکھتے ہیں کہ روایتی طور پر مسلمان دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات کا جائزہ طاقت کے لحاظ سے لیتے ہیں جبکہ قرآن پاک کا سچا اور مخلص مطالعہ انہیں غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات میں نرم خوئی اور متانت کا تقاضہ کرتا ہے۔ (43) مسلمانوں کو فتوحات اور شاہانہ جاہ وجلال کی تاریخی روایت متاثر ہونے کی بجائے براہ راست قرآن حکیم اور سنت رسولؐ کے چشمے سے سیراب ہونا چاہیے جو صرف مسلمانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ مساوات،

محبت اور ہمدردی سے معاملات کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو مسلمان بادشاہوں اور فاتحین کی عظمت وسطوت سے متاثر ہونے کی بجائے تمام انسانوں کے خالق خدائے بزرگ و برتر کی عظمت سے متاثر ہونا چاہیے اور انہیں اسی محبت آمیز رویئے کے ساتھ دنیا سے اپنے تعلقات استوار کرنا چاہئیں۔(44)

مولانا وحید الدین خان جس عمل کا مسلمانوں سے تقاضہ کرتے ہیں وہ خود شناسی کے ذریعے اپنی مکمل از سرِ نو تشکیل سے کچھ کم نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اب اس مفروضے کو ترک کرنا ہوگا کہ وہ ہمیشہ ہی حق پر ہوتے ہیں جبکہ دوسرے ہمیشہ ہی باطل پر۔ دوسروں کو اپنا یقینی دشمن گردانتے ہوئے تمام حقوق سے عاری حقیر و کمتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ دوسرے مذاہب کے افراد کے بارے میں مسلمانوں کے عمومی انداز کو چیلنج کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ غیر مسلموں کو کافر قرار دیا جانا لازمی امر نہیں ہے۔ کسی پر کفر کا اشتہار صرف اس لیے چسپاں کر دینا کہ وہ مسلمان نہیں ہے درحقیقت خدا کی حکم عدولی ہے۔ اسلامی اصطلاح میں کافر وہ ہے جو جانتے بوجھتے ہوئے حق کو جھٹلاتا یا رد کرتا ہے۔ چونکہ مسلمان دوسروں کے پاس حق کی باقاعدہ دعوت کے ساتھ پہنچے ہی نہیں اس لیے انہیں کافر قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کی بجائے عقیدے کے لحاظ سے انہیں مسلمانوں کا ممکنہ اتحادی سمجھا جانا چاہیے۔ خدا کے انبیاء ان لوگوں کو کہ جن کے درمیان انہیں تبلیغ کے لیے بھیجا جاتا تھا' میرا بھائی یا میری قوم کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر وہ اسلام کی دعوت کا انکار بھی کر دیتے تھے تو بھی کافر کہہ کر ان کی مذمت نہیں کی جاتی تھی کیونکہ ایسے معاملات میں اختیار صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔(45)

خان صاحب کے نقطہ نظر کے مطابق مسلمان داعیان کو اپنے اور غیر مسلم مخاطبین کے درمیان حائل تمام نفسیاتی رکاوٹیں دور کر دینی چاہئیں۔ مسلمانوں کو ان کے بارے میں مخالفانہ طرز عمل اختیار کرنے کی بجائے اپنے پیش نظر ان کی فلاح و بہبود اور بہترین مفادات کو رکھنا چاہیے۔ ایسا کرتے ہوئے انہیں صوفیائے کرام کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے جن کی عام محبت' امن اور جذبہ خدمت اسلام کی حقیقی روح کی غمازی کرتے ہیں۔ خان صاحب کہتے ہیں نبی اکرمؐ کو تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا نہ کہ اپنے نہ ماننے والوں کو سزا دینے اور ان پر جنگ نافذ کرنے کے لیے۔(46) بالکل اسی طرح ایک مثالی مسلمان جس کا دل خدا کی محبت سے مامور ہے یقینی طور

پر اس کے تمام بندوں کے ساتھ بھی بے لوث محبت کا اظہار کرے گا۔ (47) ابتدائی مسلمان اشاعت اسلام کے عمل میں اسی لیے حیرت انگیز طور پر کامیاب ہو گئے تھے کہ انہوں نے ان عالمگیر اصولوں کو اپنا لیا تھا جن کے تحت وہ دوسروں کے ساتھ اپنے معاملات میں کامل رواداری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر وہ ان کو اپنی مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے سے روکیں یا اپنا عقیدہ تبدیل کرنے پر مجبور کریں گے تو اس بات سے مشتعل ہو کر وہ اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیں گے اور مسلمانوں کے خلاف ہو جائیں گے۔

خان صاحب کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو تفرقہ بازی جیسی سوچ سے بالاتر ہو جانا چاہیے کہ جو ان کو دوسروں کے ساتھ محاذ آرائی کی سطح پر لے آتی ہے اور جسے کج فہمی سے جہاد کا نام دے دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کو بے سود محاذ آرائی سے قطعی اجتناب برتتے ہوئے یکطرفہ طور پر ہی خود کو فرقہ وارانہ اختلافات سے الگ کر لینا چاہیے اور یوں اپنے دنیاوی فوائد پر اسلام کے عظیم تر مفادات کو ترجیح دینی چاہیے۔ اس طرح نہ صرف انہیں دوسروں کے ساتھ اپنے اختلافات دور کرنے کا موقع ملے گا بلکہ وہ دوسروں کو عظیم اسلامی تعلیمات سے متاثر بھی کر سکیں گے۔ (48) اس لیے مسلمانوں کو کلام الٰہی کی اشاعت کے جذبے سے مکمل سرشار ہو کر دوسروں کے ساتھ بے لوث محبت سے پیش آنا چاہیے۔ ان کا موقف ہے کہ اگر مسلمان ٹکراؤ کی اپنی روش چھوڑ کر سنت نبویؐ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی نظریاتی جدوجہد میں مشغول ہو جاتے ہیں تو یقیناً اسلام اور اس کے داعی بالآخر پوری دنیا پر غالب آ جائیں گے۔ (49) وہ مزید لکھتے ہیں کہ اگر مسلمان یکطرفہ طور پر دوسروں کے ساتھ محاذ آرائی کا خاتمہ کر دیتے ہیں اور اس کی بجائے اپنے تمام تر وسائل اور توجہ کا مرکز پرامن اشاعت اسلام کو بنا لیتے ہیں تو اسلام ایک عظیم ترین نظریاتی قوت کے روپ میں جلوہ گر ہو سکتا ہے۔ (50) یوں اسلام روئے زمین کی بڑی قوتوں کو زیر نگین کر سکتا ہے اور جس کے ساتھ مسلمان اپنا کھویا ہوا وقار اور شان و شوکت دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ (51)

جدید دعوۃ کی فکر جسے خان صاحب ایک طبقاتی کوشش کی نظر سے دیکھتے ہیں جہاد کے روایتی تصور کی از سرِ نو تفہیم کا بھی تقاضہ کرتی ہے۔ خان صاحب لکھتے ہیں کہ نہ صرف اسلام امن کا مذہب ہے بلکہ یہ مکمل رواداری کا مذہب بھی ہے جو تمام انسانوں کو سلامتی کے راستے کی جانب دعوت دیتا ہے۔ (52) جہاں امن خدا کے ننانوے ناموں میں سے ایک ہے وہیں قرآن میں جنت کو امن کا

گھر کہہ کر پکارا گیا ہے۔(53) وہ لکھتے ہیں کہ اسلام کا بنیادی مقصد انسان کی روحانی بالیدگی ہے جس کے تحت بالآخر وہ نفس مطمئنہ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔اس درجے پر فائز ایک مسلمان سے دوسرے لوگوں کو سوائے امن کے اور کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔مولانا ایک مثالی مسلمان کو ایک ایسے گلاب سے تشبیہ دیتے ہیں کہ جس کی خوشبو سے بلا امتیاز سبھی لوگ مسحور ہوتے ہیں۔ایسے ایک شخص کے دل میں نفرت کا کوئی جذبہ یا کسی کو نقصان پہنچانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی۔ وہ موت کی بجائے زندگی کا پیامبر ہوتا ہے اور کانٹے کی بجائے پھول بن کر زندگی بسر کرتا ہے۔اس کے دل میں دوسروں کو دینے کے لیے کچھ اور نہیں صرف محبت ہوتی ہے۔(54) خان صاحب کہتے ہیں کہ عصر حاضر کے مسلمانوں کو درپیش سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ انہوں نے امن وسلامتی کے سرچشمے کی صورت میں موجود نبی اکرم کی حدیث وسنت کو فراموش کر دیا ہے۔(55)

تاہم خان صاحب کے نزدیک امن اور عدم تشدد کا مطلب کاہلی یا جمود کی ایک حالت نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں درحقیقت یہ بھرپور عملی جذبے کا تقاضہ کرتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ یقینی طور پر عدم تشدد؛ تشدد سے کہیں زیادہ طاقتور عمل کی ایک حالت ہے۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو ''حالت کی مثبت تبدیلی'' سے تعبیر کرتے ہیں جو قوت کے بل بوتے پر تبدیلیٔ حالت کی بجائے امن پذیر اصلاحات کے ذریعے بتدریج ارتقاء پذیر مثبت تبدیلیوں کی حمایت کرتی ہے۔اسلام صراحت کے ساتھ فساد کی مذمت کرتا اور عمومی طور پر اپنے ماننے والوں سے تقاضہ کرتا ہے کہ وہ عدم تشدد کا راستہ اختیار کریں۔(56)

خان صاحب کہتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ نبی اسلامؐ نے بہت سی جنگوں میں حصہ لیا لیکن وہ تمام کی تمام اپنی حفاظت کے لیے تھیں؛ ایسے حالات میں جب مخالفین کے ساتھ پرامن مفاہمت کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔لیکن اس کے باوجود تمام جنگیں نہایت محدود پیمانے پر لڑی گئیں جن میں دونوں جانب سے کل ملا کر ایک سو تیں (130) سے زیادہ جانیں ضائع نہیں ہوئیں۔(57) اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے اس عظیم تبلیغی مشن کے مقابلے میں جو تئیس (23) برس پر محیط تھا آپؐ نے حالت جنگ میں کل ملا کر ڈیڑھ دن سے زیادہ کا عرصہ صرف نہیں کیا۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کے لیے پرامن اشاعت اسلام اولین ترجیح تھی جبکہ جنگ ایک استثنیٰ کا درجہ رکھتی تھی۔(58)

اس بات کا ادراک کرتے ہوئے کہ عہد حاضر میں تشدد کی بنیادی وجہ ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج ہوتا ہے خان صاحب مسلمانوں کو باور کراتے ہیں کہ اسلام ہر قیمت پر امن قائم کرنے کا تقاضہ کرتا ہے جسے انصاف کے سوال کے ساتھ مشروط نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی اسلام صلعم نے قریشِ مکہ کی جانب سے عائد کی گئی سخت شرائط کو میثاقِ حدیبیہ کے دوران تسلیم کرلیا جو بظاہر اً مسلمانوں کے خلاف یکطرفہ طور پر عائد کردہ اور ناانصافی پر مبنی تھیں۔ لیکن یہ شرائط تسلیم کر لینے کا بعد آپؐ امن کی فضاء قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے بڑے پیمانے پر اشاعتِ اسلام کو ممکن بنا دیا۔ امن کے اس معاہدے پر دستخط کے کچھ ہی سالوں بعد تقریباً تمام خطہ عرب مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا اور یوں اس ناانصافی کا' جس کا مسلمان عرصے سے شکار تھے' خاتمہ ہو گیا۔ خان صاحب تاکید کرتے ہیں کہ ان مسلمانوں کو جو آج دنیا کے مختلف حصوں میں ناانصافی کے خلاف مسلح جدوجہد کر رہے ہیں' امن کو ناانصافی کے سوال سے جدا کرتے ہوئے اپنی سب سے پہلی ترجیح کے طور پر اختیار کر لینا چاہیے۔ اس طرح جب پرامن دعوۃ کے ذریعے امن کا حصول ممکن ہو جائے گا تو لامحالہ ان کی مخالفین پر فتح ہو جائے گا اور جس ناانصافی کا وہ شکار ہیں خود بخود ختم ہو جائے گی۔ (59)

خان صاحب قتال اور جہاد کے قرآنی احکامات میں واضح تفریق کا تقاضہ بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاد کا مطلب خدا کے راستے میں بھرپور کوشش اور انتھک جدوجہد کرنا ہے۔ یوں یہ مفہوم ایک مسلمان کی پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ خدا کے راستے میں کوشش اور جدوجہد کی بے شمار صورتیں ہو سکتی ہیں جو تقریباً تمام کی تمام ہی پرامن ہیں۔ یعنی غریبوں کی مدد کرنا' دوسروں کے دکھ دور کرنا اور امن و مفاہمت کے فروغ کے لیے کام کرنا سب جہاد کی مختلف اقسام ہیں۔ آج کے بھارت کے مخصوص تناظر میں حقیقی جہاد کا مطلب اپنی اندرونی نشوو ارتقاء کے لیے سعی کرنا اور دوسروں پر نشانے تاک کر بیٹھنے کی بجائے معاشرے کے محروم طبقات کی تعلیم و صحت اور ترقی و بہبودی پر اپنی توجہ مرکوز کرنا ہے۔ (60) وہ کہتے ہیں کہ حقیقی قرآنی مفہوم میں جہاد کا لفظ عدم تشدد پر مبنی دعوۃ کی پرامن جدوجہد کی غمازی کرتا ہے۔ (61) قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ مقدس کلام الٰہی کو ہتھیار بنا کر جہاد میں مشغول ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کے برتر فلسفے کے مطابق جہاد ایک نظریاتی جدوجہد کا نام ہے جس کا مقصد لوگوں کے دل و دماغ کی تسخیر ہے۔

دوسری طرف قرآن میں قتال کی اصطلاح خاص طور سے مسلح جنگ کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ قرآن قتال کی اجازت نہایت مخصوص اور مجبور کن حالات میں صرف اس وقت دیتا ہے جب پرامن مفاہمت کی تمام تر راہیں مسدود ہو چکی ہوں۔ یہ اجازت صرف اپنے دفاع اور محدود مدت کے لیے دی گئی ہے کہ جب تک فتنہ ختم نہ ہو جائے۔(62) یہاں فتنے سے مراد مذہب کی بنیادوں پر ایذارسانی کی ایک صورت ہے جس کا آج کے دور میں کوئی وجود نہیں۔ اس کی اولین بیخ کنی نبی اسلامؐ اور آپؐ کے صحابہ کے ہاتھوں خطہ عرب میں ہوئی اور جس کی تکمیل مغرب میں اٹھنے والی جدید اصلاحی تحریکوں کے ذریعے ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں آج کے دور میں نہ تو اس بات کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی وجہ کہ مسلمان اسلام کے نام پر مسلح تصادم کا راستہ اختیار کر لیں۔(63)

بیشتر روایتی علماء کے برعکس خان صاحب جدید ترقی یافتہ دنیا میں اسلام کی ترویج و ترقی کی نت نئی راہیں اور امکانات پیدا ہوتے دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو جدید طرز زندگی اور مغرب کے صرف منفی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھ کر ان کی مذمت نہیں کرتے رہنا چاہیے بلکہ ان کی جانب سے ملنے والی علم و آگہی کی روشنی کے مثبت پہلوؤں سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔ ان کے خیال میں بیشتر مسلمانوں کی جانب سے مغرب کے بارے میں پیدا کردہ ''شیطان'' کا تصور سراسر غلط ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ مغربی ملکوں کی متعدد معاشی اور سیاسی پالیسیوں نے مسلمانوں کے مفادات کو شدید نقصانات پہنچائے ہیں لیکن انہیں اسلام دشمنی کا شاخسانہ قرار دینا سراسر غلط ہے اس لیے کہ ان کا محرک فقط معاشی مسابقت کا حصول ہے۔ مولانا کا موقف ہے کہ مغرب کو نشانے پر رکھنے کی بجائے مسلمانوں کو اس کے ساتھ پرامن مکالمے کے ذرائع کو بروئے کار لانا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسری طرف مغرب اپنے جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے کلامِ الٰہی کی تمام نوعِ انسانی تک جامع ترسیل کے الٰہیاتی منصوبے میں ایک بھرپور امدادی قوت کا رول ادا کر سکتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو مغربی ذرائع ابلاغ کی بہترین تیکنیکی سہولتوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے پیغام کی بڑے پیانے پر ترسیل کو یقینی بنانا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں جدید مغربی سائنس کی دریافتوں کو اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے طور پر پیش کرنا چاہیے کیونکہ اسلام نے ان سائنسی ایجادات کی بہت پہلے ہی سے پیشین گوئی کر دی تھی جبکہ مغربی سائنس نے انہیں حال ہی میں ثابت کیا ہے۔ خان صاحب تاکید کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس آزادانہ تحقیق

جستجو کا کہ جس پر جدید مغرب کی بنیاد استوار ہوئی ہے' ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے اور اس کے ذریعے دنیا کو اس بات کا قائل کرنا چاہیے کہ مذاہب عالم میں یہ صرف اسلام ہی ہے کہ جو تاریخی صداقت کے معیار پر پورا اترتا ہے۔(64) اور یہ کہ یہی وہ مذہب ہے کہ جو دلیل' فطرت اور عقل و دانش کے تقاضوں سے حتمی مطابقت رکھتا ہے۔ خان صاحب زور دے کر کہتے ہیں اگر اسلام کی حقیقی تفہیم ممکن بنالی جائے تو اس کا حقیقی مطمع نظر تمام دنیا کو دانشورانہ قیادت فراہم کرنا نظر آتا ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے مغربی سائنس کی دریافتوں اور تیکنیکی ایجادات کو بھرپور طریقے سے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔(65)

اسلام اور سیاست

فرد کی اصلاح کو اسلام کا بنیادی مقصد قرار دیتے ہوئے مولانا وحید الدین خان شدت پسند اسلامی گروپوں کے اسلامی ریاست کے قیام کے اپنے عزم کے ساتھ طریقہ کار کو نہ صرف غیر حقیقی بلکہ غیر اسلامی بھی قرار دیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ صرف ناکامی ہی کی صورت میں سامنے آسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام کسی سیاسی نظام کا نہیں بلکہ ذاتی عمل کا نام ہے اور یوں اسلامی احکامات کی بجا آوری کا موقع ہر دو صورتوں میں یکساں طور پر موجود رہتا ہے چاہے سیاسی طور پر اسلام اقتدار میں ہو یا نہیں۔(66) شدت پسند اسلامی گروپوں کی کامیابی کے ممکنات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ایسی تحریکیں دنیا کے نہایت چھوٹے خطوں میں بھی اسلام کی علمی یا عملی بالادستی قائم نہیں کر سکتیں کیونکہ وہ الہیاتی منصوبے سے مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں اور یوں ان کے ذریعے انہوں نے تائیدِ الٰہی سے خود ہی انکار کر دیا ہے۔

خان صاحب کہتے ہیں کہ جہاں مسلمانوں کا بنیادی مطمعِ نظر آخرت کی تیاری ہونا چاہیے وہیں شدت پسند اسلامی گروہوں کا مرکز نگاہ دنیاوی فوائد کا حصول ہے۔ اس طرح وہ لوگوں کی توجہ ابدیت کے اس نہایت اہم مسئلے سے ہٹانے کے مرتکب بھی ہوئے ہیں جس پر اسلام بہت زور دیتا ہے۔(67) ایسے شدت پسند گروہوں کے خلاف دلیل دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اسلام نے مملکت کے نظم و نسق کا کوئی حتمی ڈھانچہ مرتب نہیں کیا بلکہ سیاسی معاملات کو احسن طریقے سے بجا لانے کے لیے اصول و ضوابط اور قوانین ہی وضع کیے ہیں۔ یہ حقیقت کہ سنّیوں کے پہلے چاروں

خلفائے راشدین کا انتخاب بالکل مختلف اور جداگانہ طریقوں سے عمل میں لایا گیا اس امر کی غماز ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی کوئی مخصوص شکل وصورت نہیں ہے۔(68) دراصل یہ مسلمانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ قرآن کے عمومی قوانین کو بدلتے ہوئے معاشرتی تناظر میں اجتہاد کے عمل کے ذریعے سیاسی ڈھانچے کی تشکیل میں بروئے کار لائیں۔ایک ایسا ڈھانچہ جو مسلسل بدلتے ہوئے حالات میں معاشرے کی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔

اگر چہ خان صاحب نے وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کیا کہ اسلامی ریاست سے ان کی کیا مراد ہے تاہم وہ لکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست کی بنیاد وحدانیت کے اصول پر ہوگی اور عملی طور پر اس کا تشخص ''لا اکراہ'' کے اصول سے اجاگر ہوگا۔(69) انتہاء پسند اسلامی گروہوں پر تنقید کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات اتنی جامع اور مکمل ہیں کہ زندگی کے تمام شعبوں بشمول ریاست' قومی اور بین الاقوامی امور کا بخوبی احاطہ کرتی ہیں۔لیکن شدت پسند اور اسلامی گروہوں نے اسلام کو محض ایک سیاسی نظریئے تک ہی محدود کر دیا ہے۔ان کے نزدیک یہ صورتحال اسلام کے بنیادی پیغام کو مسخ کر دینے کے مترادف ہے اور جس کی قران وسنت کے حوالے سے کوئی بنیاد نہیں ہے۔(70) وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ سیاست اسلام کا بنیادی رکن نہیں بلکہ ایک فروعی مسئلہ ہے۔(71) شدت پسند اسلامی فکر کے خلاف دلیل دیتے ہوئے خان صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کا مفہوم درحقیقت دانشورانہ سبقت ہے نہ کہ سیاسی اجارہ داری۔(72) اور یہ کہ اسلامی ریاست کا قیام اسلام کا بنیادی مطمع نظر نہیں ہے۔(73) حتیٰ کہ اپنے اس موقف کے ساتھ وہ انتہاء پسند اسلامی سوچ کے برعکس نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے عین ممکن ہے کہ وہ ایک اسلامی ریاست کی عدم موجودگی میں بھی اپنے عقیدے سے پوری طرح مخلص رہیں اور اپنے تمام دینی فرائض کی بجا آوری کرتے رہیں۔وہ کہتے ہیں اگر مسلمان اس قدر مستحکم ہو جائیں کہ ایک اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لے آئیں تو انہیں ایسا ضرور کرنا چاہیے لیکن اگر حالات سازگار نہیں ہیں تو ایسا کرنے کا ان پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا۔(74) بھارت اور ایسے دوسرے خطے کہ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں دراصل اس صورتحال کی عکاسی کرتے ہیں جس نے مولانا وحید الدین خان کی فکر کو پسِ منظر عطا کیا ہے۔ان کے نزدیک ایسی ایک صورتحال مسلمانوں کو دوطرفہ عمل کے ذریعے اپنے عقیدے سے وفاداری اور ایک غیر اسلامی ریاست کے شہری کی حیثیت سے اپنی ذمہ

داریاں پوری کرنے کے درمیان ایک توازن کے حصول کا موقع فراہم کرتی ہے۔ خان صاحب واضح کرتے ہیں کہ اسلام کی توجہ کا بہترین مرکز فرد ہے نہ کہ معاشرہ یا ریاست۔ اس لیے بھارتی مسلمانوں کی سی صورتحال کہ جہاں لوگوں کو اپنی زندگیاں اپنی شریعت کے مطابق بسر کرنے کی مکمل آزادی ہے جبکہ دوسرے معاملات میں وہ سیکولر قوانین کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں' اسلامی فکر سے بہترین مطابقت رکھتی ہے۔ اس مقام پر خان صاحب بلاشبہ انتہا پسند اسلامی نقطہ نظر کے بالکل متضاد دکھائی دیتے ہیں۔ (75)

بھارت کی مخصوص صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے خان صاحب مسلم لیگ اور اس کے دوقومی نظریئے کی بنیاد پر مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے مطالبے کو اپنی سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ برصغیر کی تقسیم نے اقلیتی مسئلے کو حل کرنے کی بجائے اسے کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ لیکن اب جب کہ پاکستان کا معرض وجود میں آنا ایک حقیقت بن چکا ہے اور یہ تقسیم اب ناقابل تنسیخ ہو چکی ہے' بھارتی مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی کوئی الگ سیاسی جماعت بنانے کی بجائے قومی دھارے کی اہم سیاسی جماعتوں میں شمولیت اختیار کر لیں۔ اس طرح وہ غالب ہندو اکثریت کو اپنا دشمن بنائے بغیر اپنے مفادات کا تحفظ زیادہ بہتر انداز میں کر سکیں گے۔ مزید برآں خان صاحب مسلمانوں کو سیاست میں معاملہ فہمی کا مشورہ دیتے ہوئے نظریاتی طور پر نظام ریاست کی سیکولر حیثیت کو خاموشی سے تسلیم کر لینے کا مشورہ دیتے ہیں۔

خان صاحب کا موقف ہے کہ ریاست کو مذہب کے زیر تسلط دے دینا نظریاتی طور پر صحیح یا غلط ہو سکتا ہے لیکن اسلامی شدت پسندوں اور مسلح ہندو گروہوں کا پچھلی نصف صدی کا تجربہ نہایت صراحت سے بتاتا ہے کہ ایسا نقطہ نظر یقینی طور پر درست نہیں ہے۔ ایسے نقطہ نظر نے ان کی کسی بھی صورت میں نظریاتی خدمت کی بجائے صرف اور صرف تخریب ہی کو جنم دیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اسلامی شدت پسندوں کے ساتھ ساتھ ہندو ریاست کے حامیوں کا بنیادی حقائق اور فطری تقاضوں سے اجتناب برتنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سیاست درحقیقت ممکنات کا ہنر ہے اور کسی بھی قسم کی مثالیت یا خیال انگیزی کو عقلیت پسندی یا تجرباتی حقائق کا متبادل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مولانا وحیدالدین خان عہد حاضر کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جدید معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ آج کے دور کی ایک تلخ حقیقت دنیا کا کسی مذہبی ریاست کو قبول کرنے سے انکار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عموماً کسی مذہبی ریاست کے حصول کی تشدد آمیز کوششیں ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس لیے ایک اسلامی ریاست کا حصول صرف مکالمے، بحث ترغیب اور سب سے بڑھ کر پرامن ذرائع سے حاصل کیے گئے ایک شعوری انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ دریں اثناء بھارتی مسلمانوں کے لیے صرف ایک ہی عملی راستہ بچ رہتا ہے جو کہ ایک سیکولر ریاست کو قبول کر لینا ہے اور اس میں موجود آزادیوں کی گنجائش کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلامی دعوۃ کے کام کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بھارتی مسلمانوں کے مخصوص پسِ منظر میں بہترین راستہ یہی ہے کہ اپنے انتہا پسندانہ مقاصد کے پیشِ نظر حقائق کو تبدیل کرتے ہوئے ایک ناممکن ہدف کے حصول کی کوشش کی بجائے عملی حقائق کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کی مناسبت سے اپنے طرزِ عمل میں نمایاں تبدیلی لائی جائے۔(76)

خان صاحب کا اسلام اور نظامِ ریاست کا تصور وسعت اختیار کرتے ہوئے ان انتہاء پسند اسلامی گروہوں اور تنظیموں تک بھی جا پہنچتا ہے کہ جو مسلمان اکثریتی ملکوں میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہ اس امر سے انکار نہیں کرتے کہ شریعت کے اصولوں پر استوار ایک اسلامی ریاست' اسلامی مشن کا ایک ضروری اور اہم حصہ ہے تاہم وہ اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ ایک مثالی اسلامی ریاست کسی بتدریج فطری عمل ہی کے ذریعے قائم کی جاسکتی ہے جس کی بنیادیں ان کی نظر میں عالمگیر شعوری انقلاب سے استوار ہوئی ہوں۔(77) وہ کہتے ہیں کہ اسلامی دعوۃ کا بنیادی مطمعِ نظر فرد کی روحانی تشکیل نو ہونا چاہیے۔(78) اور تمامتر معاشرے یا ریاست کی سیاسی تبدیلی کی بجائے یہ فرد ہی کی اصلاح ہے جو اسے روحانیت' جذبہ خدمت اور اطمینان کی عظیم حالت میں لے آتی ہے۔(79) اور یہی اسلام کا براہ راست مقصد بھی ہے۔(80)

وہ یہ بات زور دے کر کہتے ہیں کہ اسلام کا بنیادی ہدف ایک مثالی فرد کی تشکیل ہے نہ کہ ایک مثالی معاشرے یا مثالی ریاست کی۔(81) وہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر انفرادی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد سنجیدگی اور خلوصِ نیت کے ساتھ اپنی زندگیوں میں اسلام نافذ کر لے تو رفتہ رفتہ ایک حقیقی اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں آجائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ انتہا پسند اسلامی سوچ کے مطابق اگر ایک ایسی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ بھی جائے کہ جو ان کی توقعات کے عین مطابق ہو تو بھی

اس بات کی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ وہ ایک عملی صورت بھی اختیار کر سکے گی۔ نہ تو اس کی کوئی پیشین گوئی ہی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کوئی درست تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔(82) اس لیے یہ مسلمانوں کے لیے درست نہیں کہ وہ براہ راست ایک مثالی اسلامی ریاست کی تشکیل کی جدوجہد کریں۔ کیونکہ اسلامی ریاست کا قیام تو عطیہ خداوندی ہے ان لوگوں کے لیے جنہیں وہ عطا کرتا ہے۔قوت کے بل بوتے پر ایک اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد درحقیقت استحقاق خدوانڈی پر انسانی دعوے کے مترادف ہے۔(83) خان صاحب کہتے ہیں کہ اب اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ دنیا میں کبھی بھی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ سکتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزادانہ منشاء وارادے کا اختیار دیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حق اور باطل میں تفریق کرنے کی صلاحیت بھی۔ انسان کی آزادانہ مرضی وارادے کی وجہ سے اس دنیا میں ایک مکمل مثالی معاشرے کا قیام ممکن نہیں ہے کیونکہ معاشرے میں ہمیشہ کچھ لوگ ایسے بھی موجود رہیں گے جو نیکی پر برائی کو ترجیح دیں۔(84) اس لیے ایک مثالی اسلامی ریاست اور اس کے متوازی مثالی اسلامی معاشرے کے قیام کی تمنا اخروی زندگی ہی میں کی جا سکتی ہے کیونکہ قرآن جنت کو امن کے گھر سے تعبیر کرتا ہے۔(85) لیکن اسی اثناء میں ہمیں موجودہ دنیا کی غیر جامع حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے اس میں تبدیلی اور بہتری کی کوششیں کرتے رہنا چاہیے بجائے ایک ایسی تصوراتی ریاست کے قیام کی خواہش میں بیقرار رہنے کے کہ جس کا حصول اس دنیا میں ممکن نہیں۔ خان صاحب کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو پرامن ذرائع نشر واشاعت میں موجود وسیع گنجائش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اپنے خلاف نظر آنے والے بظاہراً انتہائی ناموافق حالات سے بے خوف رہتے ہوئے ایک حقیقی دنیا کی عملی صورت کو ممکن بنانا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں اپنی مشکلات کے مثالی یا تصوراتی حل تلاش کرنے کی بجائے مسلمانوں کو ایک حقیقی نقطہ نظر کو اپنانا چاہیے۔

خان صاحب کا موقف ہے کہ اسلام درحقیقت اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ مسلمان بظاہراً دلکش اور خوشنما نعروں کی رو میں بہہ جانے کی بجائے حقیقی اور عملی ذرائع کو بروئے کار لائیں۔ پس قرآنی آیات کا نزول یہ ظاہر کرتا ہے کہ کلام الہٰی کی ابتدائی آیات عام قوانین سے متعلق ہیں جن میں خدا کا خوف وغیرہ نمایاں ہے۔ لیکن جیسے جیسے نومسلموں کے دل نرم ہوتے گئے اور وہ روحانی

طور پر اس بات کے لیے تیار ہوتے گئے قرآنی آیات کے موضوعات میں بھی بتدریج تبدیلی آتی گئی اور شرعی احکامات کی بجا آوری کی تاکید میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔اس حقیقت سے خان صاحب یہ دلیل دیتے ہیں کہ اسلام ایک انقلابی طریقہ کار کی بجائے بتدریج ارتقائی عمل کی دعوت دیتا ہے۔(86) عقلی بنیادوں پر استوار یہ تدریجی عمل اسلامی شدت پسندوں کے طریقہ کار کے بالکل متضاد دکھائی دیتا ہے جو اسلامی ریاست کا قیام قوت کے بل بوتے پر ممکن بنانا چاہتے ہیں۔(87)

خان صاحب پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ تقدس آمیز مذہبی تشدد نے امن وسلامتی کے مذہب کو فقط بدنام کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر لوگ اسے تشدد و خونریزی کا متبادل سمجھنے لگے ہیں۔اور یوں اس نقطہ نظر کی وجہ سے اسلامی دعوۃ کے عظیم مشن کو بُری طرح سے نقصان پہنچا ہے۔چونکہ اسلامی انتہاء پسندوں کا حتمی مقصد فرد کی اصلاح کی بجائے ریاست پر قبضہ ہے اس لیے تشدد ان کے پروگرام کا لازمی حصہ ہے کیونکہ کسی دور حکومت کے خلاف محاذ آرائی لازمی طور پر بدلے میں تشدد کو ہوا دے گی۔

مولانا وحیدالدین خان لکھتے ہیں کہ اسلامی شدت پسندی کی ابتداء مغربی نوآبادیاتی تسلط کے خلاف ردعمل سے ہوئی تھی جو ایک شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ تھی۔(88) ایسا طرز عمل نہ صرف اسلام کی غیر حقیقی تصویر کشی کرتا ہے بلکہ دوسروں کے ساتھ شدید نفرت کا اظہار بھی کرتا ہے جس کی اسلام بالکل اجازت نہیں دیتا۔وہ کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر نفرت انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم ہے کیونکہ ''مقدس خونریزی'' میں بے گناہوں کو تہ تیغ کرتے ہوئے احساسِ ندامت سو جاتا ہے۔''خدا حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' خان اس قرآنی فرمودے کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ شدت پسند مسلمان جو دوسروں کے خلاف تشدد کا مظاہرہ کرتے ہیں اسلام کے حقیقی راستے سے کوسوں دور ہیں۔(89) وہ مزید کہتے ہیں کہ اسلامی احتجاج کی یہ شکل اگر مکمل طور پر نہیں تو بڑی حد تک حقیقی اسلامی فکر کے منافی ہے۔(90) وہ کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت کو لوگوں کی مرضی کے خلاف ریاستی ایجنسیوں کے ذریعے نافذ کرنے کی بجائے ایک ایسے عمل کا آغاز کرنا چاہیے کہ لوگوں کے دل و دماغ میں اسلام کی آبیاری کچھ اس طرح سے ہو کہ وہ خود کو اسلامی شریعت کے احکامات پر عمل کرنے کے لیے رضا کارانہ طور پر پیش کر دیں۔

خان صاحب دلیل دیتے ہیں کہ شریعت کے نفاذ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چھڑی یا بندوق اٹھا لی جائے۔ایک ایسا سیاسی نظام جو اپنے احکامات اس قدر سختی سے نافذ کروائے' اگرچہ شریعت کی

بنیادوں ہی پر کیوں نہ ہو' ہمیشہ ناکامی سے دوچار ہوگا۔ مزید برآں وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کی منشاء و مرضی کے خلاف ریاستی نظام پر قبضہ کر لینا اور اسے شریعت کے نفاذ کے لیے استعمال کرنا اسوۂ حسنہ کے طریقہ کار سے مطابقت نہیں رکھتا۔ (91) اس کے بجائے مسلمانوں کو پرامن ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے اور دوسروں کو دیگر نظام ہائے حکومت پر اسلامی حکومت کی اعلیٰ خصوصیات کے بارے میں قائل کرتے ہوئے عوامی رائے میں اپنا نفوذ کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان صرف اسی صورت ہی میں اسلامی شریعت کی بنیادوں پر ایک سیاسی نظام تشکیل دے سکتے ہیں کہ جب وہ لوگوں کی رضا کارانہ رضامندی کا حصول یقینی بنا لیں۔

روایتی اسلامی تنظیموں کے نقطہ نظر پر تنقید کرتے ہوئے خان صاحب کہتے ہیں کہ یہ بات یقینی ہے کہ اسلامی شدت پسندوں کی بزورِ طاقت ریاست کے حصول اور اس پر اسلامی شریعت کے نفاذ کی کوششیں ناکامی سے دوچار ہوں گی۔ خان صاحب مسلمانوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ماضی میں ناکامی سے دوچار ہونے والی ایسی کوششوں کا تنقیدی جائزہ لیں اور ان کا موازنہ ان کے برعکس اختیار کردہ اولین مسلمانوں کی ان حکمت عملیوں سے کریں جنھوں نے انہیں شاندار کامیابی سے ہمکنار کروایا تھا۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ مروجہ معاشی و معاشرتی نظاموں کو بزور طاقت تبدیل کرنا ترقی معکوس سے دوچار کرتا ہے' معاشرتی توازن کو بگاڑ دیتا ہے اور مزید تشدد اور خون خرابے کو ہوا دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ موثر انقلاب عدم تشدد کی بنیادوں پر تشکیل پاتا ہے جو بتدریج اور مفید تبدیلیوں کو سامنے لاتا ہے۔

اپنی بات کے ثبوت میں خان صاحب لکھتے ہیں کہ جب ابھی لوگ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھے' بجائے مکہ میں اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد کے' نبی اسلامؐ نے تیرہ سالہ طویل عرصے میں اپنی توجہ کا تمام تر محور اسلام کی پرامن اشاعت کو بنائے رکھا۔ اسی طرح جب قریش مکہ نے مسلمانوں پر جنگ نافذ کر دی تو بجائے اس کے جواب میں جنگ کرنے کے حضرت محمد صلعم اور آپؐ کے صحابہ کرام نے مدینے ہجرت کر کے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ آپؐ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپؐ کے نواسے امام حسنؓ نے خلافت کے مسئلے پر بنوامیہ کے خلاف جنگ سے انکار کر دیا اور یوں محاذ جنگ کو ترک کر کے اشاعتِ اسلام کی طرف لوٹ گئے۔

اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ انتہائی ناموافق حالات میں بھی دعوۃ کے مشن کو جاری رکھنا صرف عدم تشدد کی تحریک ہی کی وجہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے

اسلامی دانشوروں نے بدکردار حکمرانوں حتیٰ کہ ان حکمرانوں کے خلاف بھی جو اسلامی احکامات کے مطابق حکومت نہیں کرتے تھے بغاوت سے منع کر دیا۔ ان علماء کا موقف تھا کہ حکمرانوں کے ساتھ الجھنے کی بجائے اپنی تمام تر توانائیوں کا رخ دعوۃ کے عظیم کام کی طرف مرکوز رکھنا چاہیے۔(92)

قرآن اور ابتدائی اسلامی تاریخ کی مثالوں کے بعد خان صاحب تاکید کرتے ہیں کہ آج کے مسلمانوں کو بھی مقابلے اور تشدد کی بجائے جھگڑے کو پرامن ذرائع سے رفع کر دینا چاہیے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ جدید دور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ گہری وابستگی برقرار رکھتے ہوئے مسلمانوں کو پرامن ذرائع سے اپنے بنیادی فرض کی بجا آوری کرتے رہنا چاہیے اور مثبت سوچ کے ساتھ اسلام کے پیغام کو تمام لوگوں تک پہنچاتے رہنا چاہیے کیونکہ آج کی دنیا کو درپیش بیشتر پیچیدہ اور سخت مشکلات کا یہی ایک حل ہے۔

حرف آخر

جدید دور کا چیلنج بیشتر مسلمان علماء کے لیے ایک پریشان کن محرک رہا ہے اور اس کا سامنا وہ اپنے اپنے انداز میں کرتے رہے ہیں۔ جدیدیت کے سوال پر اسلام کے دو مختلف نقطہ ہائے نظر میں فرق نہایت واضح ہے۔ پہلا نقطہ نظر اسلامی شدت پسندوں کی نمائندگی کرتا ہے مثلاً جنوبی ایشیاء میں جماعت اسلامی اور مغربی ایشیا میں اخوان المسلمین اور بیشتر دوسرے جہادی گروپ۔ اس نقطہ نظر کے حامل مسلمان جدید دنیا کے پیش کردہ چیلنجوں کا دینی حل اجتماعیت میں تلاش کرتے ہوئے اسلامی ریاست کے قیام کو اپنا بنیادی مطمع نظر قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرح کا نقطہ نظر تبلیغی جماعت کا ہے جو آج دنیا کے وسیع و عریض خطوں تک پھیلی ہوئی ایک تحریک ہے۔ اس تحریک کا طریقہ کار جدید دنیا سے مکمل انحراف کا تقاضہ کرتا اور ایک طرز کی اسلامی نجکاری کا نظریہ پیش کرتا ہے جو سختی سے روایتی اسلامی فقہ کی عملداری پر زور دیتا ہے۔

اس عمومی اسلامی تناظر میں مولانا عبدالوحید خان ایک صدائے یگانہ کی مانند کھڑے دکھائی دیتے ہیں جو ایک طرف اسلام کے ابتدائی اور بنیادی ذرائع سے براہ راست استفادہ کرنے والی اسلامی تفہیم کے علمبردار ہیں تو دوسری طرف بھرپور لیکن تنقیدی انداز میں جدیدیت کا سامنا کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور یوں آج کے دور کے بیشتر سنجیدہ مسائل مثلاً بین المذاہب مکالمہ، کثیر القومی صورتحال اور ریاستی اور سیاسی امور پر سیر حاصل اور مثبت ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔

خان صاحب اپنی طرز کی جداگانہ از سرنو اسلامی تشکیل میں صدیوں سے رائج اسلامی تفاسیر اور تعبیرات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے براہِ راست قرآن وحدیث سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا موثر اور بھرپور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام آج کے دور میں بھی ایک بڑی اور قابل عمل قوت ہے اور ان کے نزدیک اسلام عہد حاضر کے بیشتر حل طلب مسائل کا جامع حل پیش کرتا ہے۔

خان صاحب اپنی طرز کی بالکل منفرد فقہ کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ ایک ایسی فقہ جو اسلام کی روایتی حاکمانہ سوچ سے متعدد انتہائی اہم حوالوں سے مختلف ہو اور جو عہد حاضر کے تقاضوں سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکے۔ اسلام کا یہ جدید روشن تصور ایک ایسی فکر ہے کہ جسے خان صاحب نبی اسلامؐ کے پیغام کی ازسرِ نو تشکیل قرار دیتے ہیں جو وضاحت کے ساتھ سائنس اور سائنسی دانشورانہ جستجو کا خیر مقدم کرتی ہے اور عقل و دانش جس کے نزدیک خدائی الہام کے سیاق وسباق کو تفہیم عطا کرتی ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے یہ ان فطری قوانین سے متصادم نہیں ہوسکتا جن پر جدید سائنس کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ درحقیقت یہ ایک ایسا خاکہ ہے کہ جس کے تانے بانے انیسویں صدی کے مسلمان جدت پسند دانشور سر سید احمد خان سے جاملتے ہیں اور جن کے بارے میں وحیدالدین خان کا خیال ہے کہ وہ ان معدودے چند دانشوروں میں سے ہیں جنہوں نے اسلام کو اس کی حقیقی روح میں سمجھا ہے۔(93) اگرچہ خان صاحب نے نئی فقہ کی تفصیلی وضاحت پیش نہیں کی لیکن یہ بات واضح ہے کہ وہ فقہ کو اجتہاد سے مستفید ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں جو اسلام کے بنیادی اور ابتدائی ذرائع کے تناظر میں نشوونما پائے اور جس کا حقیقت پسندی اور عمل انگیزی پر یقین ہو۔

اس جداگانہ نقطہ نظر نے خان صاحب کو ''موقع پرست'' اور ''اسلام کے دشمنوں کے خیرخواہ'' جیسے الزامات سے ''نوازا'' ہے اور کچھ مسلح اسلامی گروہوں نے تو ان کو اپنی ہٹ لسٹ پر بھی رکھا ہوا ہے۔ لیکن ان کے نقطہ نظر میں نہ صرف بھارت بلکہ دنیا کے متعدد ملکوں کے افراد کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اس بات کا اظہار ہے کہ ان کی آواز ان مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہی ہے جو جدیدیت کے تقاضوں سے ابھرنے والی کشمکش کا جامع حل چاہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ خان صاحب ایک بہت بڑی تحریک کی بنیاد نہ رکھ پائے ہوں جیسا کہ عمر نے ''الرسالہ'' میں بیان کیا ہے(94) لیکن وہ یقینی طور پر عہد حاضر کے بھارتی مسلمانوں میں ایک اہم آواز کی حیثیت رکھتے ہیں۔(95)

Reference

1. Interview with Wahiduddin Khan, New Delhi, 1 February, 2001.
2. Wahiduddin Khan, Two Types of Movements, http://www.alrisala.org/Articles/thought/twomvmnt.htm
3. Wahiduddin Khan, The Tabligh Movement, The Islamic Centre, New Delhi, 1986.
4. Interview with Wahiduddin Khan, New Delhi, 2 February, 2001.
5. Wahiduddin Khan, Islam Rediscovered: Discovering Islam From Its Original Sources , Goodword Books, New Delhi, 2001, p.70.
6. For an interesting study of how Muslims and Hindus in India tend to perceive each other, see Theodore P. Wright Jr., 'Hindu-Muslim Stereotypes in South Asia', in Journal of Asian and Atrican Affairs, 3 (July 1991): 7-16. For a historical treatment of the subject, see M.A. Saleem Khan, Early Muslim Perception of India and Hinduism, South Asian Publishers, New Delhi, 1997.
7. Wilfred Cantwell Smith, Islam in Modern History, Princeton University Press, Princeton, 1977.
8. Significantly. Khan fiercely condemns the Muslim League and its 'two nation' theory on which its movement for a separate Muslim state of Pakistan was based. See, Wahiduddin Khan, 'Factors Hindering Hindu-Muslim Unity', The Times of India, Bombay, 23 March, 1993.
9. Wahiduddin Khan, Hal Yahan Hai, Maktaba al-Risala, 1985, p.74.
10. Wahiduddin, The Tragedy of Muslims, http://www.alrisala.org/Articles/india/tragedy.htm.
11. Hal Yahan Hai, op.cit., p.77.
12. Hal Yahan Hai, op.cit., p. 10.
13. Hal Yahan Hai, op.cit., p.18.

14. Hal Yahan Hai, op.cit., p.57.
15. Islam Rediscovered, op.cit., p.63.
16. Wahiduddin Khan, Islam and Peace, al-Risala, New Delhi, 1999, p.112.
17. Ibid., pp.43-47.
18. Wahiduddin Khan, Islam on the Multi-Religious Society, http://www.alrisala.org/Articles/tolerance/multirelg.htm
19. Islam and Peace, op.cit., p.163.
20. Wahiduddin Khan, The Making of the Indian Nation, http://www.alrisala.org/Articles/india/nation.htm.
21. Wahiduddin Khan, The Political Misfortunes of Muslims, http://www.alrisala.org/Articles/india/misfortune.htm.
22. Hal Yahan Hai, op.cit., p.69.
23. Islam and Peace, p.194.
24. Wahiduddin Khan, New Decision, http://www.alrisala.org/Articles/india/decision.htm.
25. Islam Rediscovered, op.cit., p.43.
26. Islam Rediscovered, op.cit., p.45.
27. Wahiduddin Khan, Religious Harmony, http://www.alrisala.org/Articles/thought/harmony.htm.
28. Wahiduddin Khan, Islam on the Multi-Religious Society, http://www.alrisala.org/Articles/tolerance/multirelg.htm
29. Islam and Peace, op.cit., pp.90-92.
30. Islam and Peace, op.cit., pp.94-102.
31. Islam and Peace, op.cit., p.191.
32. Wahiduddin Khan, Tarikh-i-Da'wat-I-Haq: Ahmiyat, Zarurat Aur Taqaze, al-Risala Academy, Hyderabad, n.d., p.3.
33. Ibid., p.8.
34. Islam and Peace, op.cit., p.86.
35. Tarikh-i-Da'wat-i-Haq, op.cit., p.30.
36. Islam and Peace, op.cit., p.170.

37. Wahiduddin Khan, Raushan Mustaqbil, Maktaba al-Risala, New Delhi, 1990, p.3.
38. Tarikh-i-Da'wat-i-Haq, op.cit., pp.17-19.
39. Islam and Peace, op.cit., p.64.
40. Hal Yahan Hai, op.cit., p.9.
41. Raushan Mustaqbil, op.cit., pp.13-15.
42. Hal Yahan Hai, op.cit., p.9.
43. Islam Rediscovered, op.cit., p.63.
44. Islam Rediscovered, op.cit., p.74.
45. Islam and Peace, op.cit., p.168.
46. Raushan Mustaqbil, op.cit., p.48.
47. Islam and Peace, op.cit., pp.48-56.
48. Raushan Mustabil, op.cit., p.31.
49. Tarikh-i-Da'wat-i-Haq, op.cit., p.30.
50. Islam and Peace, op.cit., p.33.
51. Islam and Peace, op.cit., p.121.
52. Islam and Peace, op.cit., p.86.
53. Islam and Peace, op.cit., p.170.
54. Islam and Peace, op.cit., pp.37-38.
55. Islam and Peace, op.cit., p.181.
56. Islam and Peace, op.cit., p.169.
57. Islam and Peace, op.cit., p.201.
58. Islam and Peace, op.cit., 182.
59. Islam and Peace, op.cit., pp.195-196.
60. Hal Yahan Hai, op.cit., p.19.
61. Islam Rediscovered, op.cit., p.94.
62. Islam and Peace, op.cit., pp.170-79.
63. Islam and Peace, op.cit., p.110.
64. Islam and Peace, op.cit., pp.120-126.
65. Wahiduddin Khan, Islam; The Only Choice, http://www.alrisala.org/Articles/thought/choice.htm.
66. Christian W.Troll, 'Sharing Islamically in the Pluralistic Nation-State of India: The Views of Some Contemporary Indian Muslim Leaders and Thinkers', in Yvonne Yazbeck Haddad and Wadi Zaidan Haddad

(eds.), Christian-Muslim Encounters, University of Florida Press, Gainesville, 1995, p.257.

67. Wahiduddin Khan, The Present Day Islamic Movements, http://www.alrisala.org/Articles/thought/present.htm.
68. Islam and Peace, op.cit., p.142.
69. Islam Rediscovered, op.cit., p.50.
70. Islam and Peace, op.cit., p.153.
71. Islam and Peace, op.cit., p.148.
72. Islam and Peace, op.cit, p.115.
73. Islam Rediscovered, op.cit., p.51.
74. Islam and Peace, op.cit., p.148.
75. Cited in Troll, op.cit., p.258.
76. Wahiduddin Khan, 'Religion and Politics', in Religion and Society in Contemporary India, Rajiv Gandhi Institute for Contemporary Studies, New Delhi, 196, pp.103-104.
77. Islam and Peace, op.cit., p.155.
78. Dawat-i-Islami Ka Nishana: Fard Ya Ijtema?—Muraslat Mabayn Sayyed Abdul Qadir Aur Wahiduddin Khan Ki Raushni Mai, IdaraiI-Nashr-ul Huda, Hyderabad, 1990, p.18.
79. Islam Rediscovered, op.cit., p.52.
80. Islam and Peace, op.cit., p.141.
81. Islam Rediscovered, op.cit., p.56.
82. Islam Rediscovered, op.cit., p.51.
83. Islam and Peace, op.cit., p.150.
84. Islam and Peace, op.cit., p.143.
85. Islam Rediscovered, op.cit., p.56.
86. Islam and Peace, op.cit., 86.
87. Islam and Peace, op.cit., pp.132-140.
88. Islam and Peace, op.cit., p.151.
89. Islam and Peace, op.cit., p..140-141.
90. Raushan Mustaqbil, op.cit., p.13.
91. Islam and Peace, op.cit., p.68.
92. Islam and Peace, op.cit., pp.172-179.

93. Irfan A. Omar, 'Indian Muslims and the Search for Communal Harmony: Some Notes on Mawlana Wahiduddin Khan', in Studies in Contemporary Islam, vol.2, no.1, Spring 2000, p. 64. An elaborate discussion of the place of reason in Khan's understanding of Islam is to be found in his Islam: The Creator of the Modern Age (al-Risala Centre, New Delhi, 1998) and in his Islam and Modern Challenges (Goodword Books, New Delhi, 2001).
94. Irfan A.Omar, 'Islam and the Other: The Ideal Vision of Mawlana Wahiduddin Khan', in Journal of Ecumenical Studies, 36:3-4, Summer-Fall 1999, p. 425.
95. Recognising that his writings have an influence largely limited to a small, literate section, Khan insists that his appeal is directed principally at what he calls the 'thinking classes' among Muslims as well as others (Interview with Wahiduddin Khan, New Delhi, 2 February, 2001).

❁

پاکستان میں ماڈرن مسجد کی تشکیل و تشخص

غافر شہزاد

اسلامی دنیا میں تعمیر ہونے والی عمارات میں مسجد اپنی نوع کی مختلف' منفرد اور مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ مسجد کا ارتقاء' ترقی اور تسلسل چودہ صدیوں سے زائد عرصہ پر محیط ہے۔ اسلام سے قبل دنیا میں یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی عمارات کا غلبہ تھا اور وہ اپنا الگ تشخص بنا چکی تھیں ایسے حالات میں ایک نئے متعارف ہونے والے مذہب کے لوگوں کے لیے ایک ایسی نئی عمارت کی تعمیر' جو ان کی مذہبی ضروریات اور طریقہ عبادت کے عین مطابق ہو اور اس کا الگ اور مختلف تشخص بھی بنتا ہو اور اس کو پہلی نظر دیکھ کر پہچانا جا سکے' بہت مشکل اور اعلیٰ درجے کی تعمیراتی صلاحیتوں اور تخلیقی ذہانت کی متقاضی تھی۔

دن میں پانچ وقت اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہونے کے لیے یوں تو ایسی کوئی جگہ کی تخصیص نہیں ہے بلکہ جہاں بھی مسلمان سجدہ ریز ہو جائیں وہ جگہ مسجد بن جاتی ہے مگر پھر بھی مسلم بستیوں کے اندر ایسی مستقل سجدہ گاہوں کی ضرورت کئی حوالوں سے ابھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ سجدہ گاہ کے علاوہ سیاسی' سماجی اور بعض اوقات معاشی معاملات کو طے کرنے کے لیے ایک مرکز کا کردار بھی ادا کرتی ہے۔

حضرت محمدؐ جب تک مکہ میں تھے' مسلمان چوری چھپے گھروں اور کوٹھڑیوں میں نماز ادا کرتے رہے اور قرآن کی تلاوت جاری رہی مگر جب آپ نے اہل مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر مدینہ کی سمت ہجرت کی تو فوری طور پر نماز کی پنج وقتہ ادائیگی کے لیے ایک مستقل جگہ کی ضرورت پیدا ہوئی جہاں سب مسلمان مل جل کر ایک امام کے پیچھے ایک وقت میں بارگاہ ایزدی کے حضور سجدہ ریز ہو

سکیں۔اس مقصد کے لیے حضرت محمدؐ نے مدینہ میں اپنی ذاتی گرہ سے ایک زمین کا ٹکڑا خریدا اور پھر اپنی نگرانی اور شمولیت کے ساتھ اس کرہ ارض کی اولین مسجد قبا کی تعمیر کی جس کی بنیادیں بہت مضبوط اور گہری رکھی گئیں کہ آج چودہ صدیوں کے باوجود اس میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔

دنیا کی اولین مسجد کا سطحی نقشہ مربع تھا اور یقیناً اس کی وجہ خانہ کعبہ کی ربعیت ہی ہے کہ خدا کے گھر کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے حضرت ابراہیمؑ نے جس کی تعمیر کی تھی۔حضرت محمدؐ نے جب مسجد قبا کی بنیاد رکھی تو اس قطعہ اراضی کا مربع ہونا لازمی امر تھا' بلکہ یہ اس بات کا علامتی اظہار تھا کہ مسجد قبا بھی دراصل اسی سلسلے کی توسیع ہے جس کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے خانہ خدا کی تعمیر کر کے رکھی تھی۔

مسجد قبا کے مربع سطحی نقشہ میں داخل ہونے کے لیے مشرق مغرب اور جنوب کی جانب دروازے تعمیر کیے گئے' گویا تینوں اطراف سے مسلمان اس گھر میں داخل ہو سکتے تھے تا کہ چوتھی سمت منہ کر کے خدا کے حضور سجدہ ریز ہو سکیں۔مسجد کی عمارت بہت سادہ اور ضروریاتی تقاضوں کے عین مطابق تھی اس کی چھت کھجور کے پتوں سے بنائی گئی تھی' جبکہ چھت کو سہارا دینے کے لیے کھجور کے تنے دو قطاروں میں ستون کے طور پر استعمال کیے گئے۔جنوبی جانب حضرت محمدؐ کی رہائش کے لیے دو چھوٹے حجروں کی تعمیر بھی کی گئی' جن میں بعد ازاں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

یہ مسجد اس کرہ ارض پر پہلی عمارت تھی' جس کی تقلید میں بعد ازاں دنیا بھر میں نماز و دیگر معاملات کے لیے مساجد تعمیر کی گئیں۔یہ محض سجدہ گاہ نہیں تھی' بلکہ مسلم امہ کے لیے سیاسی' سماجی و انتظامی سرگرمیوں کو انجام دینے کے لیے اس کی حیثیت ایک مرکز کی بن گئی یہاں طائفے آتے رہے' حضرت محمدؐ مختلف وفود سے یہیں ملاقات کرتے رہے بے شمار اہم معاملات جن کی وجہ سے دین اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کو دنیا بھر میں غلبہ ملا' اسی مسجد میں طے پائے اور یوں یہ سادہ ترین شکل عمارت رہتی دنیا کے لیے ایک رول ماڈل بن گئی' جس کی تقلید میں دنیائے عالم میں لاتعداد مساجد تعمیر ہوئیں اور یوں مسجد کو ایک الگ مختلف اور منفرد تشخص ملا کہ دور سے دیکھ کر ہی ہم جان جاتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی عبادت گاہ مسجد ہے۔

یہ قسم عمارت پاکستان میں کس راستے سے داخل ہوئی' جب ہم اس کا جواب تلاش کرنے کے لیے تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں دو اطراف نظر آتی ہیں' جدھر سے مسلمانوں کی یہ مذہبی عمارت پاکستان میں داخل ہوئی۔

1- پاکستان کے جنوبی ساحلوں سے محمد بن قاسم نے 711ء میں راجہ داہر کو شکست دے کر اسلام کا جھنڈا لہرایا اگرچہ اس سے قبل تجارتی وسیاحتی مقاصد کے لیے مسلمان ان علاقوں میں آباد ہو چکے تھے مگر باقاعدہ اسلام کا آغاز فتح سندھ کے بعد ہی ہوا کہ جب محمد بن قاسم ملتان تک آن نکلا۔ محکمہ آثار قدیمہ کی کھدائیوں میں ہمیں دو مساجد کے آثار ملے ہیں۔ ایک بھمبور اور دوسری المنصورہ میں' جس شہر کی بنیاد محمد بن قاسم نے رکھی تھی۔

2- محمود غزنی پاکستان کی شمالی سرحدوں کے راستے داخل ہوا اور اس نے لاہور میں خشتی مسجد کی تعمیر کی۔ اس کے بعد دیگر مسلمان حکمرانوں نے شہر لاہور میں سینکڑوں مساجد تعمیر کیں۔

پاکستان میں جنوبی جانب سے داخل ہونے والے مسلمان اپنے ہمراہ جو مسجد کا نمونہ لے کر داخل ہوئے' وہ مسجد قباء کی طرح ہی تھا' جس میں ستون والی چھت تھی اور گنبد نہ تھا جبکہ شمالی جانب سے مسجد کی جو شکل متعارف ہوئی وہ تین' پانچ یا سات مربعوں کو ایک لائن میں ملانے سے حاصل ہوتی ہے اور یوں چھت پر گنبد کی تعمیر لازمی جزو کے طور پر کی جاتی ہے۔ اور ایوان بھی مستطیل شکل میں تشکیل پاتا ہے۔

جنوبی جانب سے پاکستان کی سرحدوں میں داخل ہونے والا مسجد کا انداز تعمیر ملتان' اچ شریف اور مظفر گڑھ کے علاقوں میں بکثرت استعمال ہوا۔ لکڑی کی ان چھتوں کی زیریں سطح پر نقش و نگار نے اندرونی تزئین و آرائش میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اسی طرح شمالی سرحدوں سے داخل ہونے والے انداز تعمیر نے مغلیہ عہد میں عروج حاصل کیا اور لاہور میں مسجد مریم زمانی' مسجد وزیر خان' بادشاہی مسجد' مسجد دائی انگہ کی تعمیر نے اس علاقے کے لوگوں کے دلوں پر گہرے اثرات مرتب کیے اور مجموعی طور پر جمالیاتی ذوق کو ایک نئے زاویے سے آشنا کرایا گیا۔

سکھوں اور انگریزوں کے عہد حکومت میں یہ عظیم الشان مساجد غیر مسلموں کے زیر استعمال

رہیں۔ کہیں تو گھوڑے باندھے گئے‘ کہیں بارود خانے بنا دیئے گئے یہاں تک کہ انگریزی عہد کے افسروں نے ان مساجد کو رہائش کے لیے بھی استعمال کیا اور یوں اس غیر رسمی اور غیر اخلاقی استعمال نے مساجد کی شان وشوکت کو ماند کیا۔

پاکستان 1947ء میں معرض وجود میں آیا یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا میں آر سی سی (RCC) کا استعمال شروع ہو چکا تھا‘ سیمنٹ اور سریے کے استعمال نے عمارت سازی میں انقلاب برپا کر دیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تمام عالم عمارتوں کا تشخص یکسر بدل گیا تھا اور ایک نئی جمالیات سے لوگوں کو متعارف کرایا گیا۔ آر سی سی کے ستون اور ان کے سہارے آزادانہ کھڑی چھتوں نے تعمیراتی امکانات میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ تعمیر وتناسب کے نئے اصول وضع کیے گئے‘ تزئینی وآرائشی ضابطے بدل گئے۔ جہاں دیگر عمارتوں کی نئی جمالیاتی تشکیل ہوئی وہاں مسجد کی تعمیر نو اور نئی شباہت بھی وجود میں آئی۔ یہ تمام تجربات دراصل جدید فن تعمیرات کی تحریک کے زیر اثر ہوئے اور تمام دنیا کی عمارات اس کی زد میں آئیں۔

قومی سطح پر اگر جائزہ لیا جائے تو پاکستان میں ماڈرن مسجد کی تعمیر کا نقطہ آغاز ڈھاکہ میں تعمیر ہونے والی مسجد بیت المکرّم کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز 1959ء میں ہوا اور یہ مسجد 1963ء میں پایہ تکمیل تک پہنچی۔ ڈھاکہ اس وقت پاکستان کا ایک حصہ تھا‘ بیت المکرّم مسجد کی تعمیر کے پیچھے اصل دلچسپی معروف صنعت کار عبدالطیف بھاوامی کی تھی جبکہ ماہر فن تعمیرات عبدالحسین تھریانی (جس نے ہندوستان سے فن تعمیر میں تعلیم حاصل کی تھی) نے پہلی مرتبہ خانہ کعبہ کی مکعب شکل کو بنیاد بناتے ہوئے مسجد بیت المکرّم کا ڈیزائن تیار کیا جو شباہت میں ہو بہو خانہ کعبہ جیسا تھا فرق صرف یہ تھا کہ بیت المکرّم مسجد کی بیرونی دیواروں کو سیاہ رنگ کے بجائے سفید رنگ کیا گیا اور حاشیے کو ہی صرف سیاہ رکھا گیا۔ دیکھنے میں یوں تو یہ بالکل خانہ کعبہ جیسی عمارت کی تعمیر ہی تھی اور اسی وجہ سے اس مسجد میں مینار بھی تعمیر نہ کیا گیا تاہم گرد ونواح کے اعتبار سے کئی مختلف چیزیں نظر آتی ہیں۔ اس کی تعمیر کو ممکن بنانے میں اس وقت کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میجر جنرل امراؤ خان کا ہاتھ تھا جبکہ تعمیراتی اخراجات مقامی صاحب ثروت لوگوں نے اپنے ذرائع سے پورے کیے۔

مسجدوں کے شہر ڈھاکہ میں تعمیر ہونے والی یہ مسجد شہری آبادی کے مرکزی حصے میں واقع تھی اور یہ محض مسجد نہ تھی بلکہ اس سے ملحقہ کئی دیگر عمارات سیاسی' سماجی اور مذہبی سرگرمیوں کو احسن طریق سے سرانجام دینے کے لیے تعمیر کی گئیں۔ان عمارات میں 305 دوکانات اور 22 گودام بھی تھے' جن کی تعمیر کا مقصد سال بھر کے اخراجات کی فراہمی تھا۔مسجد کے تین اطراف ایونیو تعمیر کیے گئے جب کہ چوتھی جانب سٹیڈیم کی عمارت تھی۔مسجد کا صدر داخلی دروازہ جنوبی جانب واقع ہے'اس طرف بڑی بڑی کمانیں تعمیر کی گئیں ہیں جو داخلی دروازے کا تاثر پیدا کرتی ہیں ان کمانوں سے مسجد کے داخلی دروازے تک فوارے' تالاب اور راستہ ہے۔مسجد کے شمال جنوب اور مشرقی جانب بڑے بڑے لان ہیں جو عیدین وغیرہ کے موقع پر نمازیوں کے رش کے لیے کافی جگہ مہیا کرتے ہیں۔مسجد بیت المکرّم کا مکعب نما ایوان پانچ منزلوں پر مشتمل ہے پہلی دو منزلوں پر مردوں کے نماز ادا کرنے کے لیے جگہ مختص کی گئی ہے جبکہ بالائی منزل پر خواتین کے لیے علیحدہ وضو اور نماز کے لیے جگہ مختص ہے۔عام طور پر مغربی دیوار میں کوئی کھڑکی وغیرنہیں رکھی جاتی مگر یہاں غربی دیوار میں لمبی کھڑکیاں ہیں' جن سے روشنی ہال کے اندر آتی ہے۔بالائی تین منزلوں کے درمیانی حصہ میں کھلا صحن ہے جہاں مختلف سرگرمیاں سرانجام پاتی ہیں۔ہال کی اونچائی 99 فٹ رکھی گئی ہے اور اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کے 99 ناموں سے عبارت کی گئی ہے' یہ بھی براہ راست اظہار کی ایک شکل ہے۔

بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں جب ماڈرن فن تعمیرات کی تحریک کے ماہرین اپنی عمارتوں کو نئے معانی اور نئی علامتیں پہنا رہے تھے' ایسے حالات میں بیت المکرّم کی مشابہت میں مسجد کی تعمیر کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے تاہم عمارت کی شکل و شباہت کے ساتھ براہ راست علامتی تعلق کی یہ ایک عامیانہ مثال ہے۔

مسجد بیت المکرّم کی تکمیل کے فوراً بعد ڈیفنس آفیسرز ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی کے رہائشی آرمی افسروں نے سوسائٹی کے لیے ایک نئی جدید مسجد کی تعمیر کی ضرورت محسوس کی۔جامع مسجد کی تعمیر کے محرک ریٹائرڈ فوجی افسران تھے' جن کی نظر میں اسلامی ملک کو بین الاقوامی سطح پر اپنی جدید پسندی کا تاثر ابھارنے کے لیے جدید انداز تعمیر کی مسجد کا قیام انتہائی ضروری تھا۔یہی وجہ ہے کہ

سوسائٹی کے لیے جدید انداز تعمیر کی حامل مسجد کے ڈیزائن کے لیے روم سے فن تعمیرات کی تعلیم مکمل کر کے آنے والے نوجوان بابر حمید کا انتخاب کیا گیا جو اس وقت اسلام آباد میں اٹلی کے آرکیٹیکٹ جے اے رچی کے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ بابر حمید نے چند ہفتوں میں ڈیزائن اور ڈرائنگیں مکمل کیں اور یوں مسجد طوبیٰ کی تعمیر 1966ء میں شروع ہوگئی اور مسجد کا افتتاح 1969ء میں ہوا۔ بابر حمید اٹلی میں مجسمہ سازی کی تعلیم کے لیے گئے تھے، مگر بعد ازاں اس نے فن تعمیرات میں بھی تعلیم مکمل کی اور یوں بابر حمید جو ایک مجسمہ ساز تھے ان کے لیے سطح زمین پر 212 فٹ قطر کے ایک کنکریٹ شیل (Shell) کو ایک مسجد کے ایوان کے لیے ڈیزائن کرنے کا اعتماد کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مسجد کو جدید شکل دینے اور روایتی ایوان سے انحراف کا یہ حوصلہ دراصل فن تعمیرات کی جدید تحریک کے زیر اثر ہی تھا ان سالوں میں انجینئرز کی تمام تر توجہ سٹیل اور کنکریٹ کے باہمی ملاپ سے حاصل ہونے والی جیومیٹری کی مختلف اشکال کے امکانات کی جانب مرکوز تھی۔ بابر حمید کے دوستوں کے حلقہ میں اٹلی کے ماہر انجینئرز بھی تھے لہٰذا ان کو مسجد کے ایوان کے لیے بغیر ستونوں کے جدت کے نام پر اتنا بڑا ہال تعمیر کرنے کا موقع ہاتھ لگ گیا۔ 212 فٹ قطر کے کنکریٹ شیل (Shell) کی تعمیر ہر خاص و عام کی دلچسپی کا باعث تھی مگر کوئی اس جانب دھیان نہیں دے رہا تھا کہ گول ہال کی وجہ سے مسجد کے ایوان کی اہم خصوصیت، اس کا قبلہ رخ کا تعین اپنی پہچان کھو رہا تھا۔ بابر حمید نے اس بات کا احساس کرتے ہوئے مرکز میں مغربی جانب ایک مینار کی تعمیر کو بھی ڈیزائن کا حصہ قرار دیا اور یوں ایک حد تک قبلہ کے رخ کا تعین مسجد کو دیکھتے ہوئے ہو جاتا تھا۔ یہاں بھی داخلی راستے پر فوارے، حوض، وضو گاہ اور لائٹیں لگائی گئیں اور اس روش گاہ نے ایک بالکل جدید جمالیاتی تاثر پیدا کرنے میں معاونت کی۔

جدت کے پرستاروں نے مسجد کی نئی شکل تو بنالی مگر شیل (Shell) کی بیرونی سطحوں سے نسبتاً زیادہ گرمی ایوان کے اندر داخل ہونے کے باعث، مجبوراً ٹھنڈک کے لیے مکینکل سسٹم کا سہارا لیا گیا۔ شیل (Shell) کے چاروں اطراف فواروں اور حوضوں نے ماحول تو خوبصورت کر دیا مگر اس سے فضا میں نمی کا اضافی تناسب کراچی کی آب و ہوا کے لیے مناسب نہ تھا۔

مسجد کا یہ ایوان اپنی انفرادیت اور شکل میں یقیناً بہت مختلف اور قابل ستائش تھا مگر اس نے روایتی ایوان اور جدید انداز کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچ دی جب اسی شباہت کو لاہور میں مسجد شہداء کی شکل میں قدرے چھوٹے سائز میں بنانے کی کوشش کی گئی تو مقامی لوگوں نے سخت احتجاج کیا' یہاں تک کہ معروف تاریخ دان ڈاکٹر عبداللہ چغتائی' جنہوں نے مساجد کے حوالے سے کئی کتب تحریر کی ہیں' جدت کے نام پر تعمیر ہونے والے اس نئے ایوان کی تعمیر کو رکوانے کے لیے عدالت سے رجوع کیا اور ہر ممکن کوشش کی کہ روایت سے کٹ کر ایک بالکل نئی شکل مسجد کے طور پر قبول نہ کی جائے' مساجد میں تقاریر کی گئیں' اخبارات ورسائل میں مضامین لکھے گئے مگر چونکہ اس کی تعمیر کے پیچھے مختار مسعود جیسے بیوروکریٹ تھے لہٰذا عام آدمی کی شنوائی نہ ہوئی اور یوں لاہور میں بھی ماڈرن مسجد کی تعمیر کی پہلی مثال قائم ہوئی۔

پاکستان کے قیام کے بعد جب دارالخلافہ کراچی سے اسلام آباد منتقل کیا گیا تو اس نے پاکستانی فن تعمیرات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اسلام آباد کا ڈیزائن پروفیسر ڈاکسیڈس نے تیار کیا تھا اور جہاں پریذیڈنٹ ہاؤس' پرائم منسٹر ہاؤس' پارلیمنٹ بلڈنگ' سپریم کورٹ بلڈنگ' فیصل مسجد وغیرہ کے لیے جگہ مختص کی گئی وہاں رہائشی سیکٹرز اور کمرشل دفاتر اور دوکانات بھی سکیم کا حصہ بنیں۔ اور یوں ایک مخصوص تعداد کے گھروں پر مشتمل ایک سیکٹر تشکیل دیا گیا' جس میں رہائش پذیر لوگوں کی ضرورت کے لیے دیگر سہولیات کے ساتھ ساتھ مسجد کی تعمیر کو بھی لازم سمجھا گیا۔ ترقیاتی ادارہ اسلام آباد نے اس مقصد کے پیش نظر ماہر فن تعمیرات انور سعید کو مساجد کے ڈیزائن کے لیے کہا۔ انور سعید جو مغرب سے تعلیم یافتہ تھے اور پروفیسر ڈاکسیڈس سے متاثر تھے انہوں نے 8'x8' کا ایک بنیادی گرڈ منتخب کیا اور اسی کی بنیاد پر مساجد کے ڈیزائن کا سلسلہ شروع کیا۔ اگرچہ انور سعید کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے روایتی انداز تعمیر کے عناصر کو جدید تر سامان تعمیرات جیسے کنکریٹ اور اسٹیل سے باہم ملا کر ایک ڈیزائن تیار کیا ہے مگر یہ محض دعویٰ ہی ثابت ہوا حقیقت میں جو چھ ڈیزائن مساجد کے لیے تیار کیے گئے تھے وہ اپنی سطح پر محض کنکریٹ اور اسٹیل کے اسٹرکچرل استعمال کے امکانات کی دریافت کا ایک سلسلہ تھے کہیں شیل (Shell) استعمال ہوا کہیں گنبد اور کہیں

والٹ(Vault) اور کراس والٹ(Cross Vault) کو استعمال کیا گیا۔ سطحی پلان اس انداز سے بنایا گیا کہ ہر طرح کی سائٹ(Site) کے لیے استعمال ہو سکے۔ ڈیزائن کی یہ شکل مسجد کے ڈیزائن کی صدیوں پر محیط روایت کے یکسر خلاف تھی اور یوں لگتا تھا جیسے صنعتی انقلاب کے دور میں ایک ہی طرح کے ملتے جلتے کھلونے بنانے کی فیکٹری تیار کی گئی ہو۔ یہ اندازِ تعمیر اور ڈیزائن کی شکل عوام الناس میں مقبولیت حاصل نہ کر سکی' البتہ جدت کے نام پر اہلِ اسلام آباد کو مسجد کی نئی شکل سے متعارف کرایا گیا۔

ویسے بھی انور سعید ترقیاتی ادارہ اسلام آباد میں ملازم تھے لہٰذا ان کو ڈیزائن کے لیے عوام الناس کی جانب سے کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا مگر جب مساجد تیار ہو کر لوگوں کے سامنے ظاہر ہوئی تو کوئی خاص قبولیت حاصل نہ کر سکیں

مغرب سے فنِ تعمیرات میں تعلیم حاصل کرنے والے یہ ماہرین آرکیٹیکچر کی جدید تحریک کے زیرِ اثر تھے اور کنکریٹ کے استعمال کے امکانات کی دریافت نے ان کی توجہ مسجد کی تعمیر کی صدیوں پرانی روایت کی جانب مبذول ہی نہ ہونے دی اور یوں انہوں نے مسجد کو بھی دیگر عمارات کی طرح سمجھتے ہوئے اس کے ڈیزائن کی مختلف شکلیں وضع کرنے کی کوشش کی وہ قدیمی روایت سے انحراف اور جدید تحریک میں خاطر خواہ اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے قدیمی روایت کی توسیع کے بجائے نت نئی اور بے معنی عمارتیں مسجد کے نام پر ڈیزائن کیں اور معاشرے کے نام نہاد ترقی پسند طبقہ میں مقبولیت حاصل کی۔

پاکستان کا قیام اسلام کے نام پر ہوا تھا لہٰذا جب نئے دارالخلافے کی تعمیر کا وقت آیا تو نہ صرف دارالخلافہ کا نام اسلام آباد رکھا گیا بلکہ ماسٹر پلان میں ایک بڑی قومی مسجد کی تعمیر کے لیے خصوصی طور پر 144 ایکڑ کا رقبہ مخصوص کیا گیا تاہم اس کا وقوع خلاف روایت مرکزی علاقے میں رکھنے کے بجائے شہر سے باہر رکھا گیا جہاں شہر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ 1966ء میں جب سعودی عرب کے شاہ فیصل نے پاکستان کا دورہ کیا اور مسجد کی تعمیر کے تمام اخراجات اپنے ذمہ لیے تو مسجد کا نام ''فیصل مسجد'' رکھ دیا گیا۔

1968ء میں مسجد کے ڈیزائن کے لیے انٹرنیشنل یونین آف آرکیٹکٹس (IAU) کے تعاون سے ایک بین الاقوامی مقابلہ کا اہتمام کیا گیا جس میں صرف مسلمان ماہرفن تعمیرات ہی حصہ لے سکتے تھے مقابلے میں ترکی کے ماہرفن تعمیرات ویدات ڈلوکے (Vedat Dalokay) کے ڈیزائن کواولین قرار دیا گیا۔

1957ء میں ویدات ڈلوکے (Vedat Dalokay) نے انقرہ میں جامع مسجد کے ڈیزائن کا مقابلہ جیتا تھا' اور جب اس مسجد کی بنیادیں تعمیر ہوگئیں تو مقامی سطح پر سخت احتجاج کے باعث حکومت وقت کو ویدات کے اس ماڈرن ڈیزائن کو مسترد کرنا پڑااوراس کی جگہ روایتی انداز تعمیر لیے ہوئے مسجد کی تعمیر ہوئی۔1968ء کے مقابلے میں ویدات ڈلوکے نے اسی ڈیزائن میں جزوی تبدیلیاں کر کے اسلام آباد کے لیے فیصل مسجد کا ڈیزائن کیا۔ابتدائی ڈیزائن میں ایوان گنبد نما کنکریٹ کا شیل (Shell) تھا جس کے چاروں کونوں پر چار مینار ایستادہ تھے۔ویدات نے شیل (Shell) کی گول ڈاٹوں کو نوکدار کر دیا اور ایوان کے مرکزی حصے کو اونچا کر کے ایک نئی شکل حاصل کی جو دیکھنے میں بظاہر ٹینٹ نما تھی اوراس کی مشابہت پیچھے نظر آنے والی مرگلہ کی پہاڑیوں سے بھی تھی۔

فیصل مسجد کا ایوان '200x'200 کا مربع ہے' جس کے اندر کوئی ستون نہیں ہے اوراس کے میناروں کی بلند 300 فٹ تک پہنچتی ہے۔ایوان کے مربع ہونے کی بدولت ہم سطحی نقشہ کو قدیمی روایت کا حصہ قرار دے سکتے ہیں اس لیے کہ وسطی ایشیاء سے مسجد کے ایوان کی جو شکل پاکستان میں پہنچی وہ تین پانچ یا سات مربعوں کو ایک لائن میں اکٹھا کرنے سے ہی حاصل ہوتی ہے مگر جہاں تک ایوان کی عمارتی شکل کا تعلق ہے تو یہ بھی محض کنکریٹ اور سٹیل کے استعمال کے امکانات کی دریافت سے کچھ زیادہ نہ ہے۔

آٹھویں دہائی کے آخری سالوں میں جب محکمہ اوقاف پنجاب وفاقی حکومت کے زیرانتظام تھا' حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزار سے ملحقہ ایک بڑی جامع مسجد کی تعمیر کا منصوبہ زیرغور آیا۔یوں تو آٹھویں دہائی کے آغاز سے ہی محکمہ اوقاف نے درگاہ پر زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد کو

مدنظر رکھتے ہوئے ایک بڑی جامعہ مسجد کی تعمیر پر غور شروع کر دیا تھا مگر زمین کی عدم دستیابی کی بدولت یہ منصوبہ التوا کا شکار ہوتا رہا۔ جنرل محمد ضیاء الحق کے دور اقتدار میں زمین کی توسیع کا مسئلہ حل ہوا تو وفاقی وزارت مذہبی امور نے مسجد کے ڈیزائن کے لیے مقابلہ کا انعقاد کیا جس میں صرف پاکستانی ماہرین فن تعمیرات ہی حصہ لے سکتے تھے۔ اول آنے والے ڈیزائن کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے چیئرمین خود جنرل محمد ضیاء الحق تھے۔ 26 اکتوبر 1978ء کو کمیٹی کے اجلاس میں جنرل محمد ضیاء الحق نے ماہرین فن تعمیرات سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ مسجد حضرت داتا گنج بخش کے ڈیزائن میں بادشاہی مسجد جیسا تعمیراتی حسن، مسجد وزیر خان جیسی جمالیاتی تزئین و آرائش اور شاہجہانی مسجد ٹھٹھہ جیسی شان و شوکت اور جمال ہونا چاہیے جنرل محمد ضیاء الحق نے مزید ماہرین فن تعمیرات کو ہدایات جاری کیں کہ وہ درگاہ پر جائیں، کچھ وقت گزاریں، وہاں کی فضا سے مانوس ہوں اور پھر اس ذہنی کیفیت کے ساتھ عقیدت و محبت شامل کر کے مسجد حضرت داتا گنج بخش کا ڈیزائن تیار کریں۔

19 فروری 1980ء کو جب جنرل محمد ضیاء الحق نے نقوی اینڈ صدیقی کے تیار کردہ مسجد کے ڈیزائن کی حتمی منظوری دی تو درج ذیل ہدایات بھی جاری کیں۔

1- میناروں کا انداز تعمیر ترکی کی مساجد جیسا ہونا چاہیے۔

2- برآمدوں کی چھتیں گنبد والی ہونی چاہیے۔

3- مسجد کے داخلی دروازوں کا ڈیزائن اسلامی فن تعمیرات کا شاہکار ہونا چاہیے۔

مسجد داتا دربار کا مستطیل ایوان رو کار میں ایک بڑی کمان ہی نظر آتا ہے یہاں بھی ایک اسٹرکچر ڈیزائن کا تجربہ کیا گیا۔ مستطیلی ایوان کی شمالی اور جنوبی ہر دو جانب سے ستون اوپر اٹھتے ہیں اور پھر اندر کی جانب جھکتے ہوئے بیم (Beam) کی شکل اختیار کرتے ہوئے ایوان کی چھت بناتے ہیں۔ یہ بیم (Beam) مرکزی حصے میں باہم مل جاتے ہیں اور یوں بیرل والٹ (Barrel Vault) اور کمان کی شکل کو باہم ملانے سے ایوان کی تشکیل ہوتی ہے۔ ایوان کی چھت دوہری ہے ایک وہ جو اندر سے نظر آتی ہے اور دوسری وہ جو باہر سے نظر آتی ہے۔ یہاں بھی

دوہرے گنبد کی روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوہری کنڈن دار چھت بنائی گئی ہے۔

محکمہ اوقاف ہی کے زیر اہتمام حضرت بابا بلھے شاہ کے مزار سے ملحقہ مسجد زیر تعمیر ہے۔ ایوان کا ڈیزائن جدید اور قدیم اندازِ تعمیرات کا ایک امتزاج ہے۔ عموماً بڑی مساجد میں برآمدہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جب کہ موسمی اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے برآمدہ کا استعمال بہت مناسب رہتا ہے مسجد بابا بلھے شاہ کے ایوان کے سامنے برآمدہ کو مجموعی بلڈنگ فارم کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ مسجد کے شمالی اور جنوبی میناروں کا انداز تعمیر بھی اسلامی دنیا میں مستعمل ڈیزائن سے مطابقت رکھتا ہے۔ مسجد کے ڈیزائن کو روایتی انداز تعمیر کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے۔

دربار حضرت سخی سیدن شیرازی چواسیدن شاہ سے ملحقہ مسجد کی تعمیر نو بھی محکمہ اوقاف کے زیر اہتمام جاری ہے مسجد کا ایوان قرآن اور رحل کی بنیادی شکل سے حاصل کیا گیا ہے اور یوں ایوان کو معنوی اور علامتی سطح پر ایک مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جدید فن تعمیرات کی تحریک کے زیر اثر مساجد کو بھی عام عمارت کی طرح ڈیزائن کرنے یا کنکریٹ و سٹیل کے استعمال کے امکانات کو دریافت کرنے والے ماہرین فن تعمیرات کے برعکس یہ دونوں مساجد نہ صرف قدیم روایت کی توسیع ہیں بلکہ ان کو اضافہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ نصف صدی گزرنے کے بعد آج ہم اس جگہ پر کھڑے ہیں کہ چودہ صدیوں پر محیط مسجد کے ڈیزائن کو اکیسویں صدی کے آغاز میں ایک ایسی شکل عطا کریں جو نہ صرف گذشتہ روایت کی توسیع ہو بلکہ جدید تر انداز تعمیرات کا نمونہ ہو اور زمان و مکان کے اعتبار سے اس کا اپنا الگ، مختلف اور منفرد تشخص بنتا ہو۔ اب جبکہ فاصلے سمٹ رہے ہیں اور عالمی سطح پر یکساں عمارتی ساز و سامان استعمال کرنے کے باعث ایک بین الاقوامی انداز تعمیرات ابھر کر سامنے آ رہا ہے اس امر کی انتہائی ضرورت ہے کہ مسجد کے ڈیزائن کی شکل بھی ایسی بنائی جائے کہ وہ نہ صرف اسلامی دنیا کی ایک الگ تھلگ اور منفرد عمارت ہو بلکہ دنیا بھر میں اس کا ایک ہی تشخص بنے۔

❁

مسجد میں مینار کی علامتی حیثیت

غافر شہزاد

فن تعمیر کی جمالیاتی اساس اس حد تک پختہ ہو چکی ہے کہ عمارت دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر ہونے والی سرگرمیاں کس نوعیت کی ہوں گی۔ ایک ہوٹل کو کیسا نظر آنا چاہیے' ایک آڈیٹوریم کی جمالیات کیا ہوتی ہے' رہائشی عمارتیں کس انداز تعمیر سے مشابہت رکھتی ہیں اور ایک یادگار کو کس طرح ہونا چاہیے؟ مگر اس کے باوجود' مدرسہ' سرائے اور بعض اوقات قصر کی عمارتوں کی باہمی مشابہت کی وجہ سے ان کا تشخص نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتا مگر مسجد کے اندر مینار ایک ایسی عمارتی خوبی سے متصف ہے کہ اس کو دیکھ کر کسی اور عمارت کا شائبہ نہیں ہوتا اور فاصلے سے ہی اس کو پہچان لیا جاتا ہے۔ ویسے بھی بلند ہونے کی وجہ سے بہت فاصلے سے نظر آ جاتا ہے اور اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ آبادی مسلم مذہب سے متعلق لوگوں کی ہے۔

علامتی اعتبار سے مینار کا مفہوم و مراد ترقی و ترویج اور فتح ہے۔ ایوبیوں کے دور کی ایک مسجد کے مینار پر لکھی ہوئی عبارت ''اسلام کے میناروں کی سربلندی کے لیے'' سے مراد فتح اور ترقی و ترویج ہی ہے۔

1918ء میں میکس وین برچم (Max Van Berchem) نے مینار کا تین حوالوں سے تذکرہ کیا۔ پہلا حوالہ اپنے اندر تاریخی شواہد اور مینار کی تعمیر و ترویج اور نشوونما کے مختلف پہلو لیے ہوا تھا۔ دوسرا حوالہ اس کے تعمیراتی حسن اور تزئین و آرائش کی بابت تھا جبکہ تیسرا زاویہ مینار کے عملی استعمال سے متعلق تھا۔ جونیتھن بلوم (Jonathon Bloome) اس بات سے پوری طرح متفق ہے کہ مینار کی حیثیت محض اذان دینے کی جگہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔ الزبتھ ایس مرکنجر

(Elizabeth S. Merkinger) نے اپنی کتاب ''ہندوستانی۔ اسلامی فن تعمیر'' میں مینار کو سمبل آف اسلام (Symbol of Islam) قرار دیا ہے۔ مختلف لوگوں نے اپنی تحقیق سے یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مینار حاجیوں کو مکہ مکرمہ کے راستہ کی سمت نمائی کرتے تھے اور یوں جو قافلے راتوں کو سفر کرتے تھے' میناروں کی چوٹیوں پر روشن چراغ ان کے لیے صحیح راستے کی راہنمائی کا فریضہ بھی ادا کرتے رہے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں مینار کی اولین مثال قطب مینار ہے جو مسجد قوت الاسلام میں اسلام کی فتح کی علامت کے طور پر تعمیر کیا گیا۔

تاریخی اعتبار سے اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں مساجد میں مینار کی تعمیر کے پس پردہ کم و بیش تین طرح کے محرکات رہے ہیں۔

1- اذان کے لیے اونچی جگہ کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا۔

2- محض جمالیاتی توازن اور تسکین کے لیے۔

3- اونچی اور بلند و بالا عمارتوں کی قوسوں کے افقی دباؤ (Thrust) کو زائل کرنے کے لیے۔

سوال یہ ہے کہ کیا مینار کی تعمیر درج بالا تین مقاصد یا ان میں سے کسی ایک مقصد کے حصول کے لیے کی گئی' یہی موضوع زیر غور ہے۔ آج عظیم الشان مساجد کے مینار کی بلند و بالا چوٹیوں سے اذان کی آواز کی پردہ سماعت تک رسائی بغیر اسپیکر کے ممکن نہیں۔ اسی طرح آج مساجد کی کثرت ایسی ہے جہاں مینار کی طرز تعمیر اور جمالیات کا مسجد کے ساتھ تعلق بنتا نظر نہیں آتا۔ جہاں تک تیسرے محرک کی بات ہے' آر سی سی کی موجودگی میں آج ہر بلندی کی ڈاٹ کی تعمیر بغیر کسی اضافی سہارے کے ممکن ہے۔ اگر آج کا مینار درج بالا تینوں محرکات کا رہین احسان نہیں ہے تو پھر اس کی موجودگی کو کس طرح بامعنی قرار دیا جا سکتا ہے' ہمارے تھیسز (Thesis) کا یہی بنیادی سوال ہے۔

آج مینار نے اپنی موجودگی جدید علامتی حیثیت سے منوالی ہے۔ اس کی غیر معمولی بلندی' انتہائی اہم جگہ پر ایستادگی اور قابل ذکر تناسب کی وجہ سے مینار کی حیثیت اپنے لیے الگ مقام کا تعین کر چکی ہے۔ مینار کی عمومی شکل یقینی طور پر علاقائی و مقامی جمالیات' روایتی تزئین کاری اور موجود میسر

عمارتی سازوسامان کے ملاپ سے جنم لیتی ہے' اگر چہ اس کی کئی اشکال ہیں۔ کہیں یہ اسپرنگ نما (Spiral) ہے' کہیں گول ہے' کہیں مربع شکل میں ہے اور ہمہ اوقات اس کا سطحی نقشہ ہشت پہلو ہے۔ اسلامی مینار کی بنیادی شکل جو کریسویل (Creswell) نے بیان کی ہے وہ یوں ہے' زیریں حصہ مربع سطحی نقشہ لیے ہوتا ہے' جو کہ مثمن میں تبدیل ہوتا ہے اور یہ مثمن آخر کار گول شکل اختیار کر لیتی ہے جس کی چوٹی پر ایک گنبد نما یا پسلی دار ہیلمٹ نما اسٹرکچر بنا ہوتا ہے۔ گویا مینار کی مجموعی شکل جیومیٹری کی تین اشکال کے باہمی ملاپ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مربع شکل مثمن میں تبدیل ہوتی ہے اور مثمن شکل دائرے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ مثمن اور گول اشکال دراصل بنیادی مربع شکل کو کسی ایک نقطہ پر گھمانے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس گول گردش نے مربع کی سختی (Rigidity) کو بہت کم کر دیا ہے۔

الف: مربع ب: مثمن پ: دائرہ
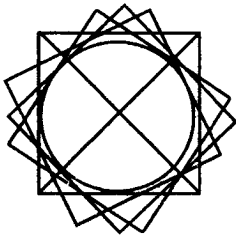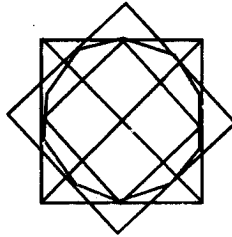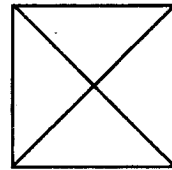
مینار کی علامتی حیثیت کا تعین

جیومیٹری کی علامتی اشکال میں مربع کو ایک ایسی بنیادی شکل قرار دیا گیا ہے جو علامتی معنویت میں زمین کو ظاہر کرتی ہے۔ مربع کی چار اطراف چار موسموں کو ظاہر کرتی ہیں' سردی' گرمی' بہار اور خزاں' اسی طرح چار بنیادی عناصر پانی' مٹی' آگ' ہوا اور جن سے مل کر یہ کائنات بنتی ہے اور اطراف مشرق' مغرب' شمال' جنوب...... لہٰذا مربع کی شکل دراصل اپنے اندر علامتی سطح پر زمین کو ظاہر کرتی ہے۔ جب مختلف مربع اشکال کو باہمی ایک نقطہ پر گھما دیا جاتا ہے تو دراصل ہم درج بالا علامتی خصوصیات کو ضرب دے کر مربع کی علامتی حیثیت کو مضبوط تر کرتے ہیں۔ اور اس

گھماؤ سے جو جادوئی دائرہ تشکیل پاتا ہے' علامتی سطح پر اس کو جنت' ابد' دائم' وغیرہ جیسی خصوصیات کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔

جب ہم ایک مربع شکل کو گھما کر ایک مثمن اور پھر دائروی شکل حاصل کرتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہم دراصل زمین سے جنت اور دائم آباد کی طرف سفر کر رہے ہیں جو کائنات کا ابدی سچ ہے۔ مینار کی چوٹی پر ایستادہ چھتری دار حصہ جو کہ عام طور پر آدھے دائرے پر مشتمل ہوتا ہے اور جس کے مرکزی بالائی حصے پر کلس آویزاں ہوتا ہے' خدا کی جانب سمت نمائی کرتا ہے۔ اور یوں خدائے وحدہ لاشریک کا وجود آخری اور حقیقی منزل کے طور پر ابھرتا ہے۔ محمد الاسد نے اپنے ایک مضمون ''جیومیٹری'' کا انطباق'' (Application of Geometry) میں دائرے کی شکل کو اسلامی اصول توحید اور خدا کی وحدانیت کا مظہر قرار دیا ہے۔

گول دائرہ جس کا ایک غیر مرئی مرکز ہوتا ہے' دیگر جیومیٹری کی اشکال کے مقابلے میں مختلف معانی لیے ہوئے ہے۔ اس کے چار یا آٹھ اضلاع نہ ہونے کی وجہ سے یہ بطور خاص کسی جانب اشارہ نہیں کرتا بلکہ تمام اطراف کی مساوی سطح پر نمائندگی کرتا ہے جو کہ خدا کی خصوصیات میں شامل ہے۔

مینار کی وہ عمومی شکل جس کو اسلامی دنیا میں علامتی حیثیت دی جاسکتی ہے اور جسے کریسویل (Creswell) نے بھی بنیادی شکل قرار دیا ہے' تین حصوں پر مشتمل ہے۔ زیریں مربع نما حصہ' درمیانی مثمن اور بالائی دائرہ کے سطحی نقشے جیسا اور پھر سب سے اوپر منجرہ یا گنبد والا حصہ۔ مینار کی یہ شکل بہت بامعنی اور علامت کی سطح پر بہت گہری اور تہہ دار ہے اور اس کی جڑیں اسلامی تعلیمات اور مذہبی اعتقادات کے اندر بہت گہری حد تک اتری ہوئی ہیں۔ مینار کی زیریں مربع شکل جو کہ زمین سے اگتی ہوئی دکھائی دیتی ہے' اپنی ربعیت (Cubic) کی وجہ سے خانہ کعبہ کے مکعب سے گہری مماثلت رکھتی ہے جس کے گرد ہر سال لاکھوں مسلمان فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے طواف کرتے ہیں اور خدا کی وحدانیت کے مظہر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جیومیٹری کی اشکال کے باہمی موازنے میں مربع شکل ایک مضبوط' متوازن اور متناسب

شکل ہے۔ تمام چار اطراف اپنے سائز میں ایک جیسی اور ہر دو اطراف ایک دوسرے کے سامنے برابری کی سطح پر کھڑی ہو کر ایک توازن کا تاثر دیتی ہیں۔ اس کے چاروں کونوں پر زاویہ قائمہ بنتا ہے اور یوں دو اضلاع کے درمیان ربط باہمی کی سطح برابری کی بنتی ہے اور یہی مساوات کا درس ہے۔ یہ مساوات اسلام کی تعلیمات کی بنیادی روح ہے۔ مینار کا یہ زیریں حصہ نقشہ میں مربع ہے۔ عالم اسلام کے تقریباً تمام میناروں کا یہ حصہ ٹھوس' مضبوطی کے ساتھ زمین سے جڑا ہوا اور اپنے اندر ایک استقامت رکھتا ہے اور بلند و بالا میناروں کی ایستادگی اور تحفظ کا ضامن ہوتا ہے۔

مغلوں کا عظیم الشان فن تعمیر اپنی جیومٹری میں مربع شکل کا ہی ایک حاصل ہے۔ مینار کی یہ زیریں مربع شکل مثمن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مینار کا یہ حصہ وہ ہے جو عام طور پر دیکھنے والے کی بینائی کی حدود میں براہ راست آتا ہے۔ تزئین و آرائش اور نقاشی کا زیادہ تر کام اسی حصہ پر کیا جاتا ہے۔ مثمن شکل اپنے تاثر میں مربع کی نسبت کم Rigid ہوتی ہے یہ دراصل مربع کی شکل کو ایک نقطہ پر گھمانے سے ہی حاصل ہوتی ہے اس کے آٹھ اضلاع' آٹھ سمتوں کا تعین کرتے ہیں اور یوں ایک وسعت کا تاثر ملتا ہے۔ اس سے اسلام کے پھیلاؤ اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ آٹھ اطراف میں برابر کی طاقت اور قوت کے ساتھ اسلامی تعلیمات کا پھیلاؤ ہوا۔ یہ مثمن آخر کار ایک دائرہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سطحی نقشہ میں مینار کا دائرہ نما حصہ اسلام کی تعلیمات کے فلسفہ وحدانیت و توحید الٰہی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ علامتی سطح پر یہ جنت' دائم آباد ابد کو ظاہر کرتا ہے۔

مینار کی گنبد نما چوٹی جسے منجرہ بھی کہا جاتا ہے' مینار کا یہ حصہ رات کے وقت بہر صورت منور رکھا جاتا ہے۔ خلیفہ الحکیم اپنی مسجد کے مینار کے اس حصہ میں خوشبو کے لیے لوبان سلگاتے تھے اسی مناسبت سے کریسویل (Creswell) نے اس حصے کا نام منجرہ رکھا ہے۔ جس کا مفہوم ہے ''وہ حصہ یا برتن جہاں خوشبو سلگائی جاتی ہے۔'' ہدایت کی روشنی مینار کے اس حصے سے پھوٹتی ہے۔ گنبد نما حصہ دراصل اسی تحفظ اور سلامتی کو علامتی سطح پر ظاہر کرتا ہے جو اسلام نے مسلمانوں کو دنیائے عالم میں عطا فرمائی۔ مینار کی جمالیاتی سطح پر تشکیل پانے والے اجزائے ترکیبی میں مقرنس ایک ایسا حصہ ہے جو ہمیشہ سے ہی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اپنی تشکیل کے اعتبار سے یہ حصہ اکائی (Unit) کی

کثیر تعداد میں ضرب سے حاصل ہوتا ہے۔ ہر دو اکائیوں کو پہلو بہ پہلو جوڑ کر تیسری اکائی کو اس کے اوپر سہارا دیا جاتا ہے اور یوں ان اکائیوں کے باہمی ملاپ سے شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح ایک شکل حاصل ہوتی ہے جو اپنے اندر تیسری سمت یعنی بصارتی گہرائی (Visual Depth) رکھتی ہے جہاں مختلف انداز کی تزئین و آرائش کی بے پناہ گنجائش نکلتی ہے۔ پہلے پہل گنبد کی تعمیر کے لیے اندرونی حصے پر مقرنہ بنائی گئیں جہاں مربع مثمن میں اور پھر مثمن گول دائرے میں تبدیل ہو کر گنبد کو سہارا دیتی تھی۔ میناروں میں بیرونی اطراف میں مقرنس تعمیری ضرورت کا حصہ نہ تھی بلکہ خوبصورتی اور تزئین و آرائش میں تنوع کے لیے اس کا استعمال ایک خوبصورت عنصر کے طور پر اختیار کیا گیا۔ اس کا مجموعی تاثر یوں دکھائی دیتا ہے جیسے بہت سی اکائیوں سے سفر کرتے ہوئے ہم ایک اکائی کی جانب بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور یہی محسوسات ہمیں اسلامی عبادات میں ملتی ہیں۔ جوں جوں ہم اپنی عبادت میں محویت اور استغراق لاتے چلے جاتے ہیں' قرب الٰہی نصیب ہوتا چلا جاتا ہے۔

مینار کی چوٹی پر جانے کے لیے سیڑھی ہی واحد اور آخری راستہ ہے۔ چند میناروں میں سیڑھیاں مینار کے بیرونی اطراف بھی بنائی گئیں جس کا بنیادی مقصد خوبصورتی اور جمالیاتی قدر میں اضافہ تھا مگر زیادہ تر میناروں میں یہ سیڑھیاں مینار کے اندرونی حصہ میں بنائی گئیں اور ان کا آغاز زیادہ تر مسجد کی چھت کی سطح سے ہوتا ہے کیونکہ مینار کا زیریں حصہ استقامت اور مضبوطی کے لیے ٹھوس رکھا جاتا تھا لہٰذا ایک سے زائد سیڑھیاں پہلے مسجد کے برآمدہ جات کی چھت پر رسائی دیتی ہیں جہاں سے پھر مینار کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔

سیڑھیوں کے اس انداز تعمیر میں بھی ایک علامت پنہاں ہے۔ جب ہم زمین پر انبوہ میں کھڑے ہوتے ہیں تو زمین پر بسنے والی عام سی مخلوق میں شامل ہوتے ہیں مگر حلقہ اسلام میں آنے کے بعد عمومی سطح سے بلند ہو کر مسلمان اپنی امتیازی حیثیت کا اعلان کرتا ہے۔ عبادات' تقویٰ اور قربِ الٰہی کے لیے جو جتنی منزلیں طے کرتا ہے اتنا ہی خدا کے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ مسجد کے صحن سے ایک سے زائد سیڑھیاں...... دراصل ایک سے زائد راستے ہیں جو بلندی کی طرف لے جاتے

ہیں اور یوں چھت پر پہنچ کر مینار کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں جہاں سے دراصل مینار کے اندر ہی اندر وحدانیت کی طرف سفر آغاز ہوتا ہے۔ میناروں میں بیرونی اطراف کھلنے والی کھڑکیاں نسبتاً کم اور چھوٹی رکھی جاتی ہیں۔ دراصل دنیاوی خواہشات اور مادی آسائشوں سے بھری زندگی سے رابطہ منقطع کرنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے تاکہ زیادہ یکسوئی اور توجہ کے ساتھ مینار کی چوٹی...... یعنی خدا کی سمت سفر کی منازل طے ہوں۔ راستے میں مختلف بلندیوں پر بالکونیوں کی موجودگی دراصل لمحہ آرام کے لیے ہے جب دَم پھول جائے' کچھ دیر استراحت دوبارہ بلندی کی طرف سفر کے لیے لازم ہوتو یہ بالکونیاں مددگار ہوتی ہیں۔

مختصر یہ کہ مینار نے مسجد کے اندر اپنی علامتی حیثیت کا تعین کر لیا ہے اور یہ جزو ایک بامعنی علامت کے طور پر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور اس کا مقام محض جمالیاتی تقاضوں سے کہیں بالاتر ہے' آج یہ بات عالم اسلام میں ایک مسلمہ حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

❁

سامراجی جنگیں اور امن تحریکیں

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ میں جنگوں کا تذکرہ تفصیل سے ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ ایک ڈرامہ ہوتی ہے کہ جس میں دو فریق باہم متصادم ہوتے ہیں' شکست و فتح اس ڈرامہ کا المیہ اور طربیہ انجام ہوتا ہے۔ اگر ایک جانب خوشی و مسرت ہوتی ہے تو دوسری جانب دکھ اور صدمہ۔ لیکن دونوں جانب سے اپنے جنرلوں اور فوجیوں کی بہادری کی تعریف و توصیف ہوتی ہے کہ جنہوں نے مذہب' وطن یا عزت کی خاطر جان قربان کر دی۔ یہ ایک ایسا تذکرہ ہوتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والا اس کے اثر اور جذبہ سے مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان جنگوں کا تذکرہ جب منظوم ہو کر سامنے آتا ہے یا کسی ادیب کے قلم سے اس میں نئے نئے رنگ دیئے جاتے ہیں تو یہ ایک ایسے رزمیہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں کہ جن کے ذریعہ آنے والی نسلوں کو ابھارا جاتا ہے۔

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنگ معاشرے کے لیے ضروری ہے؟ ایسے مفکرین اور راہنما ہیں کہ جو اسے قوموں کی زندگی اور ان کے عمل کے لیے اسے لازمی خیال کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کیونکہ جنگ فطرت میں ہر وقت اور ہر دم جاری و ساری ہے اس لیے ایہ ایک فطری عمل ہے کہ جس سے گریز ممکن نہیں ہے۔ کسی قوم کو اپنی طاقت' قوت اور صلاحیتوں کا احساس اسی وقت ہوتا ہے کہ جب وہ حالت جنگ میں ہوتی ہے۔ اس موقع پر بکھرے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے گروہ اور جماعتیں متحد ہو جاتی ہیں۔ اپنے اختلافات کو ختم کر دیتی ہیں اور قومی مفاد کے تحت آپس میں مل جاتی ہیں۔ جنگ ان میں نہ صرف بہادری اور جرات پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ حق گوئی کو بھی اختیار کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ان مفکرین کے نزدیک جو قومیں طویل عرصہ حالت امن میں

رہتی ہیں وہ جسمانی طور پر کمزوری کا شکار ہو کر زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ خوف زدہ اور سہمے ہوئے لوگ پیدا کرتا ہے۔ جنگ ایسے کمزور اور اداس لوگوں کا خاتمہ کر دیتی ہے اور ایسے افراد کی تربیت کرتی ہے کہ جو فطرت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

جنگ کو جب اس انداز سے دیکھا جائے تو اس صورت میں ان افراد کی عزت ہوتی ہے کہ جو جنگی سرگرمیوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ ان کو بہادر، نڈر، شجاع اور جری کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جو لوگ اپنی عزت، خاندانی وقار اور ملک و قوم کے لیے جان دیتے ہیں۔ معاشرہ ان کو ہیروز کا درجہ دے کر ان کے لیے قصیدے لکھتا ہے۔ ان کے مجسمے نصب کرتا ہے، انہیں القابات و خطابات سے نوازا جاتا ہے اور تاریخ میں ان کے کارناموں کا ذکر کر کے انہیں اعلیٰ و اونچا مقام دیا جاتا ہے۔ میدانِ جنگ سے فرار ہونا اور پیٹھ موڑنا سب سے زیادہ بے عزتی کی بات ہوتی ہے۔

اس سلسلہ اور دوسری قوموں کی طرح ہندوستان میں راجپوتوں کی بہادری ضرب المثل ہے کہ جو میدان جنگ سے فرار ہونے کے بجائے اس کو ترجیح دیتے تھے کہ جوہر کی رسم ادا کریں، اپنے اہل و عیاں کو قتل کر دیں یا زندہ جلا دیں اور خود زعفرانی لباس پہن کر لڑتے ہوئے جان دے دیں۔ اگر کوئی راجپوت میدان جنگ سے فرار ہوتا تھا تو اس کے اہل خاندان اس کا بائیکاٹ کر کے اس سے بات نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ابوالفضل کی مثال دی جاسکتی ہے جو اکبر کا قریبی دوست اور مصاحب تھا، دکن سے واپسی پر اسے اطلاع دی گئی کہ جہاں گیر کے اشارہ پر بندیلہ راجہ اس کی گھات میں بیٹھا ہے، اس لیے دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ راستہ تبدیل کر کے آگرہ چلا جائے، مگر وقت کی روایات کے مطابق اس کی غیرت و نے یہ گوارا نہیں کیا کہ وہ دشمن کا سامنا نہ کرے، وہ اس راستہ سے گیا اور میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ روایات کا اتنا زبردست اثر ہوتا ہے کہ لوگ جان دینا گوارا کر لیتے ہیں مگر بزدلی کے طعنے برداشت نہیں کرتے ہیں۔

جنگ کے اس تقدس اور عظمت کا اثر ہے کہ تاریخ فاتحین کو عظیم بناتی ہے۔ ان کی عظمت کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے کتنے لوگوں کو قتل کیا۔ جیسا کہ کسی دانشور کا کہنا ہے کہ اگر کوئی ایک آدمی قتل کرتا ہے تو وہ قاتل ہوتا ہے، مگر جو ہزاروں کو مارتا ہے وہ فاتح ہو جاتا ہے۔ بڑائی کا پیمانہ یہ

ہے کہ کتنے لوگوں کی جان لی۔ اس پیمانہ پر سکندر، اعظم ہے اور سائرس، عظیم۔ دیکھا جائے تو یہ سارے فاتحین بڑے لٹیرے تھے، اس لیے ایک بحری قزاق نے سکندر سے کہا تھا۔ تیرا پیشہ بھی قزاقی میرا پیشہ بھی قزاقی۔ فرق صرف کمی بیشی کا تھا۔

خاص طور سے فتوحات اور جنگوں میں کامیابیاں اس وقت بڑی درخشاں اور تابناک بن کر ابھرتی ہیں کہ جب قومیں زوال پذیر ہو کر کمزور و نحیف ہو جاتی ہیں۔ اس وقت شاعر و ادیب اور مورخ ان جنگوں کے تذکروں سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے ہیں۔ مثلاً ہمارے شاعر مشرق نے ماضی کی ان شاندار فتوحات کا تذکرہ ایسے ہی انداز میں کیا ہے کہ ''دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے'' تو اس میں فخر کے جذبات پوری شدت سے جھلکتے ہیں۔ مزید جب قوم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

تو اس سے غازی و پراسرار بندوں میں جوش و جذبہ کا ایسا سیلاب ابھرتا ہے کہ جو انہیں دنیا کی فتح کی جانب پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم ہمیشہ فاتحین اور جنگ جوؤں کا انتظار کرتی ہے۔ اس کے ہاں مفکرین و دانشوروں کے افکار سے زیادہ تلوار کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے۔

فاتحین اور جنگ جوؤں کی یہ پرستش ہمارے ہاں ہی نہیں دوسرے معاشروں میں بھی رہی ہے اور ہے۔ بقول بورک ہارڈٹ کے کہ جن لوگوں نے قتل و غارتگری اور تباہی کی ہولناک مثالیں قائم کیں۔ جب یہ غلاموں کی طویل قطاروں اور مال غنیمت کے بوجھ سے لدی گاڑیاں اور جانور لاتے تھے اور شان و شوکت کے ساتھ تھیبس اور نینوا میں داخل ہوتے تھے تو لوگ انہیں خدا کا پسندیدہ بندہ کہتے تھے۔

کچھ مفکرین جنگ کی تباہ کاریوں کو نظر انداز کر کے اس کے فوائد پر زیادہ نظر رکھتے ہیں۔ مثلاً بورک ہارڈٹ ان مورخوں میں سے ہے کہ جو جنگ کو پائیدار امن کے لیے ضروری سمجھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ صرف طاقت کے ذریعہ ہی امن قائم کیا جا سکتا ہے اور طاقت کو جنگ کی صورت ہی

میں منوایا جا سکتا ہے۔لہٰذا امن جنگ میں پوشیدہ ہے۔

میکاولی نے ریناساں عہد میں جنگ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ حکمرانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کو جنگوں اور جنگی جنون میں مصروف رکھیں تاکہ وہ ان کے خلاف بغاوتوں اور سازشوں میں ملوث نہ ہوں قوم کو ہمیشہ ایک دشمن کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے ڈر' خوف اور عدم تحفظ کے احساس سے متحد رکھتی ہے۔

جو بات میکاولی نے پندرہویں صدی میں کہی تھی' وہ آج بھی اپنی جگہ صحیح ہے۔اس کا اندازہ ہماری اپنی تاریخ سے ہوتا ہے کہ ہم پاکستان کے قیام سے لے کر آج تک حالت جنگ میں ہیں۔ دشمن کا خوف ہماری رگوں میں سمایا ہوا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے ہمارے معاشرے نے اپنی تمام صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں کو فوج کے حوالے کر کے خود کو ذہنی طور پر مفلوج بنالیا ہے اور اپنے تمام وسائل اور ذرائع دفاع کو دے کر اپنی زندگیوں کو پسماندہ کرلیا ہے۔

اب ہم سوال کی جانب آتے ہیں کہ جنگیں کیوں ہوتی ہیں؟ قدیم زمانے میں جن جنگوں کے بارے میں ہماری معلومات ہیں ان کا مقصد لوٹ مار ہوتا تھا۔اس کا اظہار یونانی مورخ تھیوکی ڈائڈس نے اس طرح سے کیا ہے کہ یونانی اور وحشی اقوام کے مقصد جنگ سے یہ ہوتا تھا کہ اس کے ذریعہ مال و دولت لوٹی جائے اور اس سے خود بھی فائدہ اٹھایا جائے اور اپنے حامیوں کو بھی نوازا جائے۔ابتدائی دور میں علاقوں پر قبضہ کرنا مقصد نہیں ہوتا تھا۔کیونکہ آبادی کم تھی اور زمینیں بہت تھیں۔لیکن جیسے جیسے ریاستوں کی وسعت ہوئی اور آبادی میں اضافہ ہوا تو طاقت کو اور زیادہ مضبوط بنانے کے لیے اب نہ صرف جنگ مال غنیمت کے لیے تھی بلکہ علاقوں پر قبضہ کرنے اور لوگوں کو غلام بنانے کے لیے بھی تھی۔یہ سامراجی جنگوں کی ابتداء تھی۔جس میں اولین طور پر رومی تھے کہ جنہوں نے جنگوں اور فتوحات کے ذریعہ ایک بڑی امپائر کی بنیاد ڈالی۔

بعد میں آنے والوں میں عرب فاتحین تھے کہ جنہوں نے بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں کو ختم کر کے شمالی افریقہ اور اندلس میں اپنی سلطنتوں کو پھیلایا۔یہ سامراجی جنگیں یورپ و ایشیا و افریقہ سب ہی براعظموں میں لڑی گئیں اور ان کی بنیاد پر کارولنجین امپائر کی بنیاد یورپ میں پڑی' تو

مشرق میں چنگیز و ہلاکو سے لے کر ایران میں صفوی، ہندوستان میں مغل اور ایشیا کو چک و بلقان میں عثمانی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ پندرہویں صدی سے یورپی اقوام کی سامراجی جنگوں کی ابتداء ہوئی جس نے امریکہ، ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں اپنی نوآبادیات قائم کر کے سیاسی تسلط کو مستحکم کر لیا۔

قدیم اور جدید سامراجی قوتوں نے جنگ کی تباہ کاریوں کو ہمیشہ اخلاقی جواز دینے کی کوشش کی۔ لوگوں کو جان دینے کے لیے اس وقت تک آمادہ نہیں کیا جا سکتا ہے جب تک ان کے سامنے کوئی اعلیٰ وارفع مقصد نہ ہو۔ اس لیے جنگ کو بامعنی بنانے اور اس کا اعلیٰ وارفع مقاصد ثابت کرنے کا کام دانشور، مفکرین اور مذہبی راہنما کرتے ہیں۔ جنگ کو اخلاقی رنگ دینے کی غرض سے مذہب کے ہتھیار کو استعمال کیا گیا۔ جب کسی قوم کے ذہن میں یہ بٹھا دیا جائے کہ ان کا مذہب سچا ہے اور دوسرے مذہب گمراہ کرنے والے اور خدا کے دشمن ہیں، تو اس صورت میں یہ ان کا مذہبی فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ حق کے لیے لڑیں اور جان دے کر خدا کی خوشنودی حاصل کریں۔ مذہب کی خاطر جان دینے والے ہر مذہب میں شہید کہلاتے ہیں۔ عہدِ وسطیٰ میں اسی مذہبی جذبہ نے ''حق کی جنگ'' (Just War) کے تصور کو پیدا کیا تھا۔ اس حق کی جنگ کو یہودیوں نے اپنے ابتدائی دور میں استعمال کیا اور آج بھی فلسطین کے ساتھ جنگ میں ان کا یہی مذہبی جذبہ کام کر رہا ہے۔ مسلمانوں کی جنگوں میں بھی اس جذبہ کی فراوانی تھی کہ جس کے تحت انہوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ گیارہویں اور بارہویں صدیوں میں صلیبی جنگوں میں یہی مذہبی جوش و جذبہ تھا، اگرچہ اس کے پس منظر میں معاشی و سیاسی مقاصد تھے۔

جب یورپ میں سیکولر افکار و خیالات کے تحت مذہبی اثر کم ہوا، تو اس کی جگہ قوم پرستی اور قومی ریاست نے لے لی، اب جنگوں کا مقصد یہ ہوا کہ اپنی قوم اور ریاست کی عظمت و بڑائی کے لیے لڑا جائے۔ جب یہ نعرہ لگایا جائے کہ میرا ملک صحیح یا غلط مگر میرا ملک ہے، تو اس سے انسانیت و اخلاقی اقدار کو خارج کر دیا گیا۔ سوشل ڈارون ازم نے نسل پرستی کے جذبات کو ابھارا کہ جو طاقتور، برتر اور افضل ہے وہ قوم زندہ رہے گی۔ کمزور نااہل اور معذور قوموں کے لیے موت ہے۔ اس نظریہ کے تحت یورپی اقوام نے خود کو ایشیا و افریقہ کی اقوام سے برتر سمجھا، اور یہ ضروری سمجھا کہ ان کو اپنے زیر

تسلط لایا جائے۔ دلیل یہ تھی کہ یہ اقوام تہذیبی طور پر پسماندہ ہیں' اس لیے یہ ''سفید آدمی کا بوجھ'' ہے کہ وہ انہیں مہذب بنائے۔ اس جذبہ کو ''تہذیبی مشن'' کا بھی نام دیا گیا۔ ایورپی اقوام کا کہنا تھا کہ اہل یورپ نے تہذیب کے اعلیٰ مدارج طے کر لیے ہیں' لہٰذا اب یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ بقیہ دنیا کو مہذب بنائیں۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ ان کے ملکوں پر قبضہ کیا جائے اور ان کے ذرائع کو استعمال کیا جائے۔

تسلط کے ذریعہ قوموں کو مہذب بنانے کا نظریہ قدیم ہے۔ مثلاً یونان میں پیری کلس کا کہنا تھا کہ جو ریاستیں یونان کے زیر تحت آئیں گی یہ ان کے لیے ترقی کا باعث ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ یونان سے تہذیب و تمدن سیکھ کر اپنی پسماندگی کو دور کر سکیں گے۔ جب ہندوستان میں مغلوں نے اپنی امپائر کو وسعت دینی شروع کی تو ابوالفضل نے کہا کہ چھوٹی ریاستوں کا مغل سلطنت میں شامل ہونا باعث برکت ہوگا۔ اس خیال کے تحت بعض مورخوں کا کہنا ہے کہ جب راجپوت مغل سلطنت کا حصہ بن گئے تو انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو مغل سامراج کے لیے استعمال کی اور تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا ورنہ ان کی صلاحیتیں اور توانائیاں آپس کی جنگوں میں صرف ہو رہی تھیں۔

جنگوں کی تباہ کاریوں کے اثرات کو کم کرنے اور عورتوں' بچوں اور مردوں کے قتل عام کو جائز قرار دینے کی غرض سے جس طریقہ کو استعمال کیا گیا وہ یہ تھا کہ مخالف لوگوں کو انسانیت کے درجہ سے گرا دیا جائے اور انہیں ایسے غیر انسانی روپ میں پیش کیا جائے کہ ان کا قتل عام کرنا آسان ہو جائے۔ اسی پالیسی کے تحت اہل یورپ نے امریکہ' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے مقامی باشندوں کا قتل عام کر کے ان کی زمینوں پر قبضہ کیا۔ آگے چل کر ہٹلر نے بھی اسی دلیل کو اپناتے ہوئے آریہ نسل کی برتری کا نظریہ پیش کیا اور سلاؤ (Slav) قوم کو پسماندہ قرار دے کر یہ جواز دیا کہ چونکہ وہ اپنے قدرتی وسائل کو استعمال کرنے میں نااہل ہیں' اس لیے ان کی زمینوں اور علاقوں پر قبضہ کر کے جرمن قوم ان کا بہتر استعمال کر سکتی ہے۔

موجودہ اسرائیل اور فلسطین کے تنازعہ میں یہی مذہبی و نسلی برتری کا جذبہ کام کر رہا ہے کہ

جس کے تحت اسرائیل ریاست وہ فلسطینیوں کا قتل عام کر رہی ہے اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر کے وہاں اپنا تسلط قائم کر رہی ہے۔

اس پس منظر کے بعد امریکہ کے موجودہ جنگ جوئی ذہن کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سی باتیں واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ اول اسے اپنی اس قوت و طاقت کا احساس ہے جو اسے سائنس' ٹکنالوجی' ذرائع ابلاغ عامہ اور معاشی ذرائع کی وجہ سے حاصل ہے۔ اس کی توسیع پسندی کا آغاز انیسویں صدی سے شروع ہو چکا تھا' اس کی یہ خواہشات تقدیر کے اظہار (Manifest Destiny) کے نظریہ میں ہوئیں تھیں' یعنی قدرت کو منظور ہے کہ وہ دوسرے ملکوں پر تسلط قائم کرے۔ امریکہ کے ایک صدر تھیوڈر روزویلٹ نے کہا تھا کہ: ''میں ہر جنگ کو خوش آمدید کہتا ہوں' کیونکہ اس کی ہمیں ضرورت ہے'' جب فلپائن پر قبضہ کیا گیا تو یہ کہا گیا کہ یہ امریکہ سے بہت دور ہے تو اس کا جواب دیا گیا کہ ''ہماری بحریہ اسے ہمارے قریب لے آئے گی''

ان جنگوں کے ذریعہ جب امریکی صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کو منافع ملا تو انہوں نے ان سامراجی جنگوں کی پرزور حمایت کی۔ کیونکہ مفتوح اور زیر تسلط ملکوں کی منڈیاں اور ان کے خام مال سے ان کو فائدہ ہوا۔ یہی وہ وجوہات ہیں کہ امریکہ واحد سپر پاور کی حیثیت سے اپنے سیاسی' معاشی اور ثقافتی تسلط کو دنیا میں قائم کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس کی سامراجی عزائم کی بنیاد عہد وسطیٰ کے نظریات سے لے کر موجودہ دور کے افکار سب شامل ہیں۔ وہ اپنی جنگوں کو حق کی جنگیں قرار دیتا ہے کہ جن میں خدا ان کے ساتھ ہے۔ وہ جنگیں اس لیے لڑ رہا ہے تاکہ مغرب کی اس تہذیب کا دفاع کیا جائے کہ جس کی تشکیل میں اہل یورپ نے صدیوں سے حصہ لیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ اقوام اس تہذیب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ملکوں سے آمرانہ حکومتوں کو ختم کریں' جمہوریت کو قائم کریں۔ دہشت گردی کا خاتمہ کریں' حق خودارادی اور حقوق انسانی کا تحفظ کریں۔ یہ اقوام اس وقت مہذب ہوں گی کہ جب یہ امریکہ کے زیر تسلط آ کر اس سے سیکھیں گی۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ اقوام چونکہ نااہل اور پسماندہ ہیں اس لیے اپنے قدرتی ذرائع کو

استعمال کرنے کے لائق نہیں۔ اس لیے امریکہ کا بطور ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ پر حق ہے کہ ان ذرائع پر قبضہ کر کے انہیں تہذیب و تمدن کی ترقی کے لیے استعمال کرے جس سے پوری انسانیت کو فائدہ ہوگا۔

امریکی اس پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ صدی ''امریکی صدی'' ہے لہٰذا ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دنیا کو اپنے زیر تسلط لا کر پائیدار امن قائم کریں۔ اس کی بنیاد "Pax Romana" پاکس روماناپر ہے کہ جس کے تحت رومیوں نے جنگ کر کے اپنی امپائر سے تمام بغاوتوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ امریکی حکمراں بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ جنگ کے ذریعہ دوسرے ملکوں کے اسلحہ اور فوجی طاقت کو ختم کر دیں اور اس کے بعد دنیا میں ایک ایسی پائیدار امن قائم کریں کہ جس کے نگراں وہ ہوں اور دوسرے تمام ممالک ان کی شرائط کے تحت رہنا قبول کریں۔

یہ درست ہے کہ ایک طرف سامراجی جنگیں ہوتی رہی ہیں' مگر اس کے ساتھ ساتھ جنگ سے مزاحمت کے جذبات بھی ابھرتے رہے ہیں اور ایسے افراد' گروہ اور جماعتیں ہیں کہ جو امن کی کوششوں میں سرگرم عمل رہی ہیں۔

دنیا میں جنگ کے بارے میں مخالفانہ جذبات اس وقت ابھرنا شروع ہوئے کہ جب جنگ کی تباہ کاریاں اور ہولناکیاں لوگوں کے سامنے آئیں۔ جب تک جنگ محدود ہوتی تھی' اس وقت تک اس کے بارے مین زیادہ مخالفانہ جذبات نہیں تھے لیکن جیسے جیسے یہ جنگیں پھیلتی گئیں۔ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے متاثر ہوتے رہے' اسی طرح سے لوگوں میں یہ خیال تقویت پکڑتا گیا کہ دنیا کو ان جنگوں سے کیسے محفوظ رکھا جائے' اور کیسے امن کو قائم کیا جائے؟ پندرہویں صدی میں یورپ میں جو خوں ریز جنگیں ہوئیں' اس کے نتیجہ میں یہ خواہش بھی ابھری کہ ایسے اقدامات کیے جائیں کہ جو امن کو پائیدار بنیادوں پر قائم کرسکیں۔ اس سلسلہ میں جرمن فلسفی کانٹ نے ایک منصوبہ پیش کیا کہ کوشش کی جائے کہ قوموں کے درمیان نفرت اور دشمنی کے جو جذبات ہیں انہیں ختم کیا جائے۔ جب وہ امن کی حالت میں ہوں تو انہیں خفیہ ڈپلومیسی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ مستقل فوجوں کے ادارے کو ختم کر دیں۔ اس کے برعکس وہ ان تجارتی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دیں کہ

جو قومی سرحدوں کو دور کر دیں اور لوگوں کو آپس میں قریب لائیں۔

انیسویں صدی یورپ میں نپولین کی جنگوں نے اور انیسویں صدی کے آخر میں جب امریکہ نے کیوبا' پیورتو ریکو اور فلپائن پر قبضہ کیا تو جنگ کے خلاف تحریکوں کی ابتداء ہوئی' لوگ نہ صرف جنگ کی تباہ کاریوں بلکہ اس کے اثرات سے تھک گئے تھے اور امن کے خواہشمند تھے۔ 1899 میں امریکہ میں اینٹی امپیریلسٹ کا قیام عمل میں آیا جس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ مشہور امریکی ادیب مارک ٹون اس کا سرگرم رکن بن گیا اور اس نے اپنی تحریروں کے ذریعہ جنگ کی مخالفت اور امن کی حمایت بھی لکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ حالت جنگ میں قوم دو حصوں میں بٹ جاتی ہے: آدھے محبت وطن اور آدھے غدار ہو جاتے ہیں۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں کہا کہ "میرا ایمان ہے کہ لوگوں کو یہ یقین دلاؤں کہ وہ آزاد ہیں۔ ان کو یہ حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنے گھر کے معاملات کا تصفیہ خود کریں۔ میں سامراج مخالف ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ شاہین پنجے سے دوسروں کی سرزمین کو گرفت میں لایا جائے۔"

امن پسند تحریکوں نے جن خیالات کو ابھارا ان میں یہ زور دیا گیا کہ یہ کہنا کہ انسان میں نفرت اور دشمنی اور دہشت گردی کے احساسات گہرے ہوتے ہیں۔ غلط ہے۔ اس کے برعکس انسان امن کا خواہش مند رہتا ہے اس میں محبت اور اخوت کے جذبات زیادہ ہوتے ہیں' اس لیے جنگ کو روکنے کے لیے ان جذبات کو ابھارنا چاہیے۔ صدیوں کی جنگوں کے بعد انسان ان سے بیزار ہو گیا ہے' ان کی تباہیوں سے سبق سیکھ کر امن کے فروغ کے لیے متحرک ہونا چاہیے۔ ان خیالات کو تعلیم کے ذریعہ پھیلایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جنگ کی وجوہات جن میں معاشی' تجارتی' مفادات' قوم پرستی و نسل پرستی کے جذبات اور اسلحہ کی دوڑ شامل ہیں انہیں دور کرنے کی ضرورت ہے۔

امن کی ان کوششوں کے نتیجہ میں انیسویں صدی میں جو تحریکیں ابھریں' ان میں 1815 میں نیویارک پیس سوسائٹی (New York Peace Society)' 1816 میں برٹش پیس سوسائٹی (British Peace Society)' 1828 میں امریکن پیس

سوسائٹی (American Peace Society)‘ 1905 میں نیشنل پیس کونسل (National Peace Council) اوران کے علاوہ بین الاقوامی امن جماعتیں قائم ہوئیں۔ 1848 سے 1851 تک ان جماعتوں کی جانب سے عالمی امن کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ ان میں جو تجاویز زیرِغور آئیں ان میں کہا گیا کہ امن کے قیام کے لیے باہمی صلاح ومشورے اور گفت وشنید ضروری ہے۔ تنازعات کو دور کرنے کے لیے ڈپلومیسی کو اختیار کیا جائے‘ اور اسلحہ کی دوڑ کو ختم کر کے اسے ختم کیا جائے۔

لیکن امن کی یہ کوششیں 1914 میں پہلی عالمی جنگ کو نہیں روک سکیں۔ اس جنگ میں تقریباً 9 ملیون لوگ مارے گئے۔ یہ سب انسان تھے جو ایک دوسرے کی مخالفت میں لڑے۔ یہ سب ان جذبہ سے لڑے کہ وطن کی حفاظت کی جائے‘ مگر جنگ کے خاتمہ پر سب لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر انہوں نے کسی غلط مقصد کے لیے جان دے دی تو پھر کیا ان کی یہ قربانی بیکار جائے گی؟ اس قربانی کو جائز اور صحیح قرار دینے کے لیے تاریخ‘ ادب اور آرٹ کا سہارا لیا گیا اور ان لوگوں کو شہید اور ہیرو کا درجہ دیا گیا۔ جنگ کے بعد‘ ان ملکوں نے جنہوں نے اس میں حصہ لیا انہوں نے یادگاریں بنانا شروع کر دیں تا کہ ان کے ذریعہ قومی فخر کو ابھارا جائے۔ جنگ کو مقدس درجہ دینے کی غرض سے جنگی میوزیم قائم کیے گئے تا کہ لوگوں میں طاقت وقوت کا احساس ہو۔

لیکن امن پسند لوگ بھی متحرک تھے۔ 1924 میں ارنسٹ فریڈرک (Ernst Fredrick) نے برلن میں ایک میوزیم قائم کیا کہ جس میں جنگ کی تباہ کاریوں کو دکھایا گیا تھا۔ یہ حکومت کے خلاف ایک مہم تھی جنگ کے خلاف یورپ کے دانشوروں میں کہ جن میں آرٹسٹ‘ مجسمہ ساز‘ ادیب‘ شاعر اور مفکر سب ہی شامل تھے انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اس کا بھرپور اظہار کیا۔ کارل کراؤس (Karl Krous) نے ’’انسانیت کے آخری دن‘‘ لکھی۔ اس میں وہ جنگ میں مرنے والوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

تم جنہوں نے قربانی کی آخر تم ان کے منصوبوں کے خلاف کیوں
اٹھ کھڑے نہیں ہوئے؟ آخر تم اپنی شان وشوکت کو ان کے منہ پر کیوں

نہیں تھوک دیا؟ آخر تم نے اس مقدس جنگ سے غداری کیوں نہیں کی؟
کہ جس کے بارے میں ہم سے جھوٹ بولا گیا کہ یہ ہماری آزادی کے
لیے ہے۔ تم مردہ لوگو! آخر تم انہیں خندقوں سے نکل کر ان زہریلے سانپوں
سے حساب کیوں طلب نہیں کرتے ہو؟ آخر تم کیوں موت کے وقت کے
اذیت ناک چہروں اور بے نور آنکھوں کے ساتھ ان کے خوابوں میں نہیں
آتے ہو؟ آخر تم کیوں اپنی نوجوانی کی شگفتگی کے ساتھ سامنے نہیں آتے ہو
کہ جسے ان کی دیوانگی اور حیوانیت نے مرجھا کر رکھ دیا؟...... اسلحہ سے لیس
لاشو اٹھو اور ان سے اپنے کٹے ہوئے سر مانگو۔ تمہاری موت سے زیادہ وہ
لمحات اذیت ناک تھے کہ جن میں تم زندہ تھے اور موت کا انتظار کر رہے
تھے۔ میں ان لمحات کی اذیت کا انتقام چاہتا ہوں۔

جنگ کے خلاف انہیں جذبات کا اظہار برنارڈ شاء نے اپنی تحریروں میں کیا۔ اس نے ہارٹ بریک ہاؤس (Heart Break House) میں لکھا کہ جب لوگ جنگ میں مر رہے تھے تو ''اس وقت انہیں نہیں بتایا گیا کہ وہ احمقوں کی غلطیوں' سرمایہ داروں کی لالچ' فاتحین کی خواہشات' انتخابات جیتنے والوں کی تقریروں' محب الوطن کے نام ہواؤں' جھوٹ اور طمع اور خوں ریزی کے متوالوں کے نام پر قربان کیے گئے ہیں۔ کیونکہ جنگ انہیں طاقت اور مقبولیت کے تخت پر بٹھائے گی۔''

پہلی جنگ عظیم نے اہل یورپ کو دہشت زدہ کر دیا۔ اس کے بعد سے یہ کوششیں ہوئیں کہ مستقبل میں جنگوں کو کیسے روکا جائے' اس مقصد کے تحت جہاں لیگ آف نیشنز کا قیام عمل میں آیا وہاں 1930 کی دہائی میں ہیگ اور جنیوا میں امن کی کانفرنسیں ہوئیں۔ ایک ایسی ہی کانفرنس میں جب آئن اسٹائن نے شرکت کی تو اسے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ یورپ کی ریاستوں کے نمائندے اس پر بحث کر رہے ہیں کہ کون سے ہتھیار استعمال کرنا چاہئیں اور کون سے نہیں اور یہ کہ جنگ ضرور ہو' مگر اسے انسانی قدروں کے مطابق لڑا جائے۔ اس پر آئن اسٹائن نے علیحدہ سے پریس کانفرنس کر کے کہا کہ جنگ میں کوئی انسانیت نہیں ہوتی ہے' اس لیے جنگ کا خاتمہ ضروری ہے۔

لیکن آنے والے واقعات نے دوسری جنگ عظیم میں پہلی سے زیادہ تباہ کاریاں کیں۔اس میں ایٹم بم کا استعمال بھی ہوا۔امریکہ نے خصوصی طور پر اس کا خیال رکھا کہ ایٹم بم کی تباہی کی تفصیلات دنیا تک نہ پہنچیں۔جنگ کے خاتمہ پر امن کی تحریکیں بہت مدھم آواز کے ساتھ اٹھیں۔ ان تحریکوں میں جان اس وقت پڑی جب امریکہ ویت نام کی جنگوں میں الجھا' اس پر پوری دنیا میں امن کے مظاہرے ہوئے ان مظاہروں کے نتیجہ میں اور ویت نامیوں کی مزاحمت کی وجہ سے امریکہ کو شکست کھا کر واپس آنا پڑا۔

مگر ایک طاقتور سامراجی طاقت کے لیے شکست کا صدمہ بڑا گہرا ہوتا ہے' اس لیے 1991 کی خلیج کی جنگ میں عراق سے فتح پا کر بش سینیر نے یہ اعلان کیا کہ امریکہ پر سے ویت نام کی شکست کا دھبہ مٹ گیا ہے۔

موجودہ صورت حال میں جنگ کی مخالفت میں جو مظاہرے ہو رہے ہیں' اس نے امریکہ اور برطانیہ کے حکمرانوں کو پریشان کر دیا ہے کیونکہ جمہوری معاشروں میں عوام کی آواز کی اہمیت ہوتی ہے۔اگرچہ یہ دلیل دی جا رہی ہے کہ جمہوریت میں اہم فیصلے پارلیمنٹ یا کانگرس میں ہوتے ہیں کہ جہاں عوام کے منتخب نمائندے ہوتے ہیں۔یہ فیصلے عوام کی سطح پر سڑکوں پر نہیں ہوتے۔مگر اس دلیل کے باوجود یہ عوامی آوازیں سامراجی جنگ کی راہ میں حائل ہیں۔امن و جنگ کی اس کشمکش میں' طاقت' اقتدار اور ذرائع جنگ کے حامیوں کے پاس ہیں۔جب کہ امن پسندوں کے پاس مدھم آوازیں ہیں۔کیا ان کی آوازوں کو کبھی سنا جائے گا؟ یا ان کی یہ آوازیں جنگی طیاروں اور ٹنکوں و میزائلوں کے شور میں گم ہو جائیں گی؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس کا جواب ڈھونڈنے کی ہمیں سب کو ضرورت ہے۔

❁

فن حرب

سن زو/ ترجمہ: ظفر علی خاں

تعارف

ظفر علی خاں

''فن حرب'' کے مصنف سن زو سے متعلق دو روائتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چینی تاریخ میں ''دورِ بہار و خزاں'' کے آخری ایام یعنی تقریباً 500 قبل مسیح میں زندہ تھا۔ اور اس نے ''فن حرب'' کے تیرہ باب اسی دور میں لکھے۔ لیکن کتاب کے متن میں دیئے گئے اصول اس دور کے جنگی عمل سے لگا نہیں کھاتے۔ اور نہ ہی اس دور کے حربی ادب میں اس کے حوالے ملتے ہیں۔ اب غالب قیاس یہ ہے کہ یہ کتاب ''جنگی ریاستوں'' کے دور یعنی (221-403) قبل مسیح میں لکھی گئی۔ چینی تاریخ میں جنگی ریاستوں کا دور تقریباً ڈھائی صدیاں جاری رہا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس دور میں سات بڑی اور طاقتور جبکہ پندرہ چھوٹی اور کمزور ریاستیں تھیں جو ایک دوسرے سے نبرد آزما رہتی تھیں۔ بڑی اور طاقتور ریاستیں چھوٹی اور کمزور ریاستوں پر غلبے اور انہیں ہڑپ کرنے کے درپے رہتیں اور چھوٹی ریاستیں اتحاد بنا کر ان میں سے کسی سے بچنے کے لیے کسی دوسرے کی پناہ چاہتیں۔ لہٰذا ان کی تاریخ مسلسل جنگ، اتحاد، متبادل اتحاد، معاہدے کرنے اور معاہدے توڑنے کی تاریخ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جنگ کی فطرت بدلتی گئی مشکل اور صبر آزما ہوتی گئی۔ پتہ چل گیا کہ فتح آسانی سے نہیں ہوسکتی کیوں کہ یہ ماضی کی طرح مہم جوئی نہ رہ گئی تھی بلکہ مہلک حد تک سنجیدہ مسئلہ بن گئی تھی۔ فوجوں کا حجم بڑھ گیا۔ مہمیں زیادہ لمبی ہوگئیں ریاست کو حالت جنگ میں قائم و جاری رکھنا مشکل ہوگیا اس اثناء میں پیشہ ور جنگجو افسران کا ایسا طبقہ وجود میں آیا جنہوں نے اپنی زندگیاں جنگی عمل میں کامیابی کے لیے وقف کردیں۔ ''فنِ حرب'' کے پہلے جملے میں اسی حقیقت کی عکاسی ہے کہ یہ واقعی ریاست کے لیے سنجیدہ مسئلہ بن گئی۔ زندہ بچنے یا تباہ ہونے کا ذریعہ۔ زندہ بچنے کی شرط اول تھی کہ ریاست کے پاس ایک مستعد فوج ہو جس کی کمان ماہر ہاتھوں میں ہو

اور غالباً ''فن حرب'' کا مصنف اسی پیشہ ور جنگجوؤں کے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔

سنہ 100 قبل مسیح میں سن زو کا ایک وقائع نگار ''سوما چیئن'' اس کے بارے میں بیان کرتا ہے ''سن زو جس کا ذاتی نام ''وو'' تھا ریاست قی کا باسی تھا۔ اس کی کتاب ''فن حرب'' کی بنا پر ''وو'' کے بادشاہ ''ہولُو'' نے اسے بلوایا اور کہا ''میں نے بڑے غور سے تمہارے تیرہ باب پڑھے ہیں کیا میں تمہاری سپاہیوں کے بندوبست والی تھیوری کو عملی تجربے میں لاسکتا ہوں؟'' سن زو نے جواب دیا ''جی ہاں''۔ بادشاہ نے پوچھا ''کیا یہ تجربہ عورتوں پر کیا جا سکتا ہے؟'' سن زو نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ لہٰذا محل سے 180 عورتوں کو لانے کا انتظام کیا گیا۔ سن زو نے انہیں دو کمپنیوں میں تقسیم کر دیا اور ان میں سے ہر ایک کی قیادت بادشاہ کی محبوب کنیزوں کو دی۔ پھر اس نے ان سب کے ہاتھوں میں نیزے تھما دیئے اور ان سے یوں مخاطب ہوا۔ ''میں فرض کرتا ہوں کہ تم سامنے اور پیچھے دائیں اور بائیں ہاتھ میں فرق جانتی ہو۔'' عورتوں نے جواب دیا ''ہاں''۔

سن زو نے کہا ''جب میں کہوں ''سامنے دیکھ'' تو آپ کو سامنے دیکھنا ہوگا۔ جب میں کہوں ''بائیں مڑ'' تو آپکو بائیں طرف رخ کرنا ہوگا۔ جب میں کہوں ''دائیں مڑ'' تو آپ کو دائیں طرف رخ کرنا ہوگا۔ جب میں کہوں ''الٹا پھر'' تو آپ کو دائیں طرف سے الٹی طرف رخ کرنا ہوگا۔''

عورتوں نے پھر کہا کہ وہ سمجھ گئیں۔

یوں قوائد اور ڈسپلن کے ضابطوں کی بار بار تشریح کرنے کے بعد سن زو نے جلّاد کے کلہاڑوں کی طرف ان کی توجہ دلائی یہ بتانے کے لیے کہ وہ سنجیدہ ہے۔ پھر اس نے حکم دیا۔ ''دائیں مڑ'' لیکن عورتیں محض کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

سن زو نے کہا ''اگر آپ ضوابط کے بارے میں واضح نہیں ہیں اور احکامات سے واقف نہیں ہیں تو پھر یہ کماندار کی غلطی ہے۔'' پھر تین دفعہ احکامات کی تکرار اور پانچ دفعہ انکی تشریح کرنے کے بعد اس نے حکم دیا۔ ''بائیں مڑ'' عورتیں پھر ٹھٹھا مار کے ہنس پڑیں۔ سن زو نے پھر کہا ''اگر ہدایات صاف نہیں اور احکامات واضح نہیں تو پھر کماندار کی غلطی ہے۔ لیکن جب وہ پہلے ہی صاف طور پر بتائے گئے ہوں اور اس کے باوجود ان پر عمل نہ ہو تو پھر غلطی افسروں کی ہے۔'' پھر اس نے دستوں کے دائیں اور بائیں کمانداروں کا سر قلم کرنے کا فیصلہ کیا۔

وو کے بادشاہ نے جو عرشے سے یہ کارگزاری دیکھ رہا تھا' جان لیا کہ اب اس کی دو محبوب

کنیزیں قتل ہونے والی ہیں وہ خوفزدہ ہو گیا اور فوری ایک ملازم کو سن زو کی طرف یہ پیغام دے کر دوڑایا ''میں جرنیل کی فوجی اہلیت کا پہلے ہی قائل ہو چکا ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ یہ دو کنیزیں قتل نہ کی جائیں کیونکہ ان کے بغیر میری بھوک مر جائے گی۔''

سن زو نے جواب دیا ''آپ کا خادم پہلے ہی کماندار ہونے کا باضابطہ حکم موصول کر چکا ہے اور جب کماندار میدان میں فوجیوں کو احکامات دے رہا ہو تو اس وقت وہ بادشاہ کے احکامات کا پابند نہیں ہے۔''

اس کے بعد اس نے دستوں کے دونوں کمانداروں کے قتل کا حکم دیا تا کہ سب متنبہ ہو جائیں اور انکے بعد والی دو عورتوں کو کماندار بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے احکامات دیئے اور عورتیں بائیں دائیں سامنے اور پیچھے رخ کرنے لگیں۔ قوائد کے ضابطوں کے عین مطابق اور کسی کی جرأت نہ تھی کہ ہلکی سی آواز بھی نکالے۔

سن زو نے پھر بادشاہ وو کو پیغام بھیجا ''کہ اب سپاہ قوائد و ضوابط کی پابند ہو گئی ہے عالیجاہ نیچے آ کر انکا معائنہ کر سکتے ہیں۔ اب بادشاہ کی مرضی کے مطابق ان سے کام لیا جا سکتا ہے چاہے انہیں آگ اور پانی سے بھی کیوں نہ گزرنا پڑے۔''

وو کے بادشاہ نے کہا ''کماندار اپنی اقامت گاہ میں جا کر آرام کرے۔ مجھے ان کا معائنہ کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔''

سن زو نے کہا ''بادشاہ صرف فن حرب سے متعلق باتیں کرنا چاہتا ہے وہ اس کے عملی اطلاق میں دلچسپی نہیں رکھتا۔''

بعد ازاں بادشاہ نے سن زو کو اپنا جرنیل مقرر کر لیا اور تقریباً دو دہائیوں تک سن زو کی کمان میں وو کی فوجیں فتح و شادمانی کے جھنڈے گاڑتی رہیں۔ سن زو کی وفات کے بعد اس کی ''فن حرب'' جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں مقبول ہوئی اور آج پوری دنیا میں فن حرب کی پہلی مستند دستاویز کے طور پر مانی جاتی ہے۔ یقیناً یہ چینی ذہنی ثقافت کے درخشاں شاہکاروں میں سے ایک ہے۔

تہذیبی ارتقاء یک جہتی نہیں ہوتا ہمہ جہتی ہوتا ہے۔ زندگی کے صرف مادی وسائل ہی نہیں بلکہ تنظیمِ معاشرہ، نظامِ ریاست، فنونِ لطیفہ، پیداواری استعداد کی مناسبت سے ساز و سامان حرب عسکری تنظیم و فن حرب وغیرہ سب تقریباً یکساں ترقی کرتے ہیں۔ اور ہر شعبہ زندگی اپنے اندر

دوسرے شعبوں کی سطح سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ زمان و مکان کا مختلف اور محدود ہونا اور تقسیم کار کا جبر ہر شعبے کو مخصوص ہیئت دینے کا باعث تو ہوتے ہیں لیکن چونکہ زندگی ایک نامیاتی کل ہے اور انسانی معاشرہ اسکی پیچیدہ ترین شکل ہے اس لیے ہر شعبے میں دوسرے شعبوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ کسی معاشرے کے خاص دور کے بنیادی اعتقادات' فلسفیانہ نظریات و معاشرتی اقدار اس دور کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں منعکس ہوتے ہیں۔

سن زو کی ''فن حرب'' کا موضوع ہر چند جنگ اور جنگی اصول ہیں لیکن بنظرِ غائر دیکھیں تو تاؤمتی فلسفہ حیات کا مرقع ہے۔ تاؤمتی جدلیاتی منطق کا عملی اطلاق ہے کیونکہ چینی ثقافت کے تارو پود میں تاؤمتی فلسفہ جاگزیں رہا ہے۔

تاؤمتی نظریہ عالم کے مطابق دنیا ایک وحدت ہے جو انسانوں کے لیے متخالف جوڑوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ مسلسل تبدیلی کی دنیا ہے اگرچہ جتنی زیادہ تبدیلی ہوتی ہے یہ اُتنی ویسی ہی رہتی ہے کیونکہ تبدیلی دائروی ہے۔ دنیا میں انسانی فہم کو دیکھنے والے کے تناظر سے اضافی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی نقطۂ نظر حتمی رائے نہیں ہوسکتی اور خاص حالات کی تجرباتی تحقیق سے ہی ان حالات کی فہم حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی فہم آدمی کو اس خاص حالت میں جس میں کہ وہ ہوتا ہے موزوں قدم اٹھانے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن ان خیالات کو تفصیل میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

تاؤمت کے نقطۂ نظر سے دنیا ایک وحدت ہے۔ نیدھم لکھتا ہے ''نامیاتی نقطۂ نظر جس میں ہر مظہر دوسرے تمام مظاہر سے درجہ بند طور پر منسلک تھا تمام چینی مفکروں میں پایا جاتا تھا۔''(1) چینی کبھی بھی روح اور مادے کو علیحدہ نہیں کرتے تھے اس لیے انہوں نے کوئی ایسی تھیوری پیدا نہیں جس کے مطابق کوئی ایک پہلو ذہن یا مادہ مقدم ہو' نیدھم وحدت کے اس نقطۂ نظر کی اہمیت پر خاص طور سے زور دیتا ہے۔ ''اگر کوئی ایک خیال تھا جس پر تاؤمت کے مفکرین زیادہ زور دیتے تھے تو وہ وحدتِ فطرت کا نظریہ تھا۔''(2)

عمومی طور پر وحدت کا یہ خیال چینی کلچر میں وسیع طور پر جاری و ساری رہا ہے اور تاؤمت میں یہ کبھی ناپید نہیں ہوتا۔ شاید یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس نے چینی فکر کو علیحدہ وجود رکھنے والی قطبیتوں (Substantive Polarities) (مثلاً فاعل بہ مخالف مفعول بالائی ڈھانچہ بخالف بنیاد وغیرہ) کے بے ثمر تجزیوں سے محفوظ رکھا۔ چینی جب کسی خاص دائرے میں اعمال یا اشیاء میں تفریق

کرتے ہیں مثلاً ین اور یانگ یا زمین، ہوا، آگ، پانی، دھات وغیرہ میں تو وہ انہیں کائناتی کل کے جزوی مراحل کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ جو مسلسل تبدیل ہو رہے ہیں۔(3)

دوسرے وحدت کا مطلب یہ بھی تھا کہ عالم صغیر (روزمرہ زندگی) کے اصول لازماً وہی تھے جو عالم کبیر کے تھے۔ اس لیے اول الذکر کے لیے دروں بینی حاصل کرنا آخرالذکر کی ماہیت جاننے کے مترادف ہے۔ تاؤمتی ادب کے اندر محنت کش افراد (کسائی چھکڑے بان یا حتیٰ کہ چور) ان اصولوں کو اپنی حرفت و مہارت کے ذریعے سیکھتے ہیں۔

تیسرے وحدت کا تاؤمتی تصور ایک وحدت اُولیٰ تجویز کرتا ہے جس سے کہ یہ رنگارنگ دنیا اخذ ہوئی ہے۔ مابعدالطبیعاتی طور پر یہ تاؤمتی کوششوں کو مراقباتی ترکیبوں اور ''دس ہزار اشیاء والی دنیا'' کے ترک کے ذریعے اس قدیمی وحدت کو دوبارہ پانے کی طرف لے گیا جبکہ سیاسی طور پر یہ تاؤمت کو سماجی درجہ بند تقسیم کی کنفیوشسی حمایت کو غلط قرار دینے کی کوششوں کی طرف لے گیا۔ تاؤمتی یوٹوپیا ایک متحد سوسائٹی کا تصور پیش کرتا ہے نیدھم ہوئی فان ذی کے حوالے سے بتاتا ہے ''دنیا ایک بے تفریقی وحدت تھی۔ خالص اجتماعیت جو توڑی اور منتشر نہیں کی گئی تھی۔ مختلف قسم کے لوگ ایک وحدت کی تشکیل کرتے تھے اور تمام مخلوق خوب نشوونما پاتی تھی۔''(4)

چینی کلچر میں ین اور یانگ کے ذریعے ظاہر کیے جانے والے اضداد کے تصور سے آج دنیا واقف ہے اس ضمن میں جے سی کوپر بہت سے نکات سامنے لاتا ہے۔

''ین یانگ تمام جوڑے دار موجودیت کا علامتی اظہار ہے۔ یہ فطرت کے تکمیلی قطبین ہیں لیکن دونوں کو مادہ یا ذات نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ ایسی خاصیتیں ہیں جو تمام اشیاء میں مخفی ہیں۔ ان کے درمیان ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ عمل و ردعمل ایک دوسرے پر انحصار و تغیر و تبدل اور موجود تضادات کا ادغام ہوتا رہتا ہے۔(5)

اس تاؤمتی منطق میں کسی کو ین نہ کسی کو یانگ کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ ہر چیز کا اپنا ین پہلو اور یانگ پہلو ہوتا ہے جو بہت ین لگتا ہے اس میں یانگ جھلکتا ہے جو یانگ لگتا ہے اس میں ین۔ تضادات کی تکمیلیت پر منطقی اصرار تاؤمتی عالمی نقطۂ نظر میں جاری و ساری ہے۔ رائموںڈ وان اوور کہتا ہے ''یہ یقینی بات ہے کہ حقیقی طور پر تمام تاؤمتی مشاغل، فلسفیانہ، صوفیانہ اور باطنیانہ منطق۔ متضادات کی مفاہمت نو کے تجربے پر مبنی ہیں۔ بظاہر جو مختلفات و متفرقات ہیں ان کی شعوری

وحدت پر وجود اور عدم وجود عمل اور رد عمل کی مماثلت کی بلا واسطہ فہم پر مبنی ہیں۔" (6)

تاؤ مت میں تضاد کا خیال بلا واسطہ طور پر ہونے "ہوتے رہنے" یعنی نہ رکنے والی تبدیلی کی طرف لے جاتا ہے۔ ہیلمٹ ولہلم لکھتا ہے "تبدیلی کا الٹ نہ ہی سکون اور نہ ہی عدم حرکت ہے۔ بلکہ واپسی کا عمل ہے۔ قدیم چینی کے لیے دنیا حرکت کی دنیا تھی ایک مسلسل بہاؤ۔ تمام چیزیں اپنی اضداد میں بدل رہی تھیں۔ ین یانگ میں اور یانگ ین میں" (7)۔ ہم اسے ذوانگ ذی کی تاؤ متی کتاب میں دیکھتے ہیں "رسالوں کو موخر نہیں کیا جا سکتا وقت کو روکا نہیں جا سکتا۔ بوسیدگی افزائش بربریت اور خالی ہونا' ختم ہونا اور پھر شروع ہونا۔ چیزوں کی زندگی ایک سرپٹ دوڑ ہے۔ ایک اندھادھند تگ وتاز ہے۔ ہر لمحے کے ساتھ وہ تبدیل ہوتی ہیں اور ہر لمحے وہ رخ بدلتی ہیں۔" (8)

رچرڈ ولہلم تبدیلیوں کی کتاب (پی چنگ) کہ 1150 قبل مسیح میں لکھی گئی سے متعلق لکھتا ہے کہ اس میں کنفیوشس کے تابعین نے عقیدہ بند اخلاقیاتی سماجی تبصرہ وتوضیح شامل کر دیئے اور اسے کنفیوشسی کلاسیکی کتاب کی شکل دے دی۔ حالانکہ تبدیلیوں کی کتاب (پی چنگ) کا اساسی تصور کچھ یوں ہے کہ آٹھ (Trigram) ٹرائی گرام (مدورسہ سطرے) وہ علامتیں ہیں جو بدلتی ہوئی گزراں حالتوں کو ظاہر کرتی ہیں یہ وہ تمثال ہیں جو مسلسل تبدیل ہورہے ہیں۔ توجہ چیزوں پر ان کی حالت وجود پر مرکوز نہیں ہوتی جیسا کہ زیادہ تر مغرب میں ہوتی ہے بلکہ تبدیلی میں ان کی حرکات پر ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ آٹھ مدورسہ سطرے اشیاء کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ حرکت میں ان کے رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔" (9)

مدوریت کا عنصر تاؤ مت کے اس خیال کی رمزی علامت ہے کہ اس تبدیلی مسلسل کا منطق "یک سمتی یا سیدھا نہیں بلکہ دائروی ہے۔" (10) دائروی تبدیلی کا یہ خیال انیسویں صدی کے مغربی جدلیاتی فکر سے کہ آگے بڑھنے والی اور پیچ دار فطرت والی تبدیلی سے متعلق ہے مختلف ہے۔ ہیلمٹ ولہلم کہتا ہے "یوں سوچی گئی تبدیلی کی حرکت اپنی سمت میں کبھی یک بعدی نہیں ہوتی۔ اگر ہم کوئی تمثال ذہن میں لائیں تو دائروی حرکت اس کے لیے بہترین اصطلاح ہے۔ ترقی کا خیال جو ہم نے دائروی حرکت کے حلقے میں مرغولے کے تصور سے شامل کر لیا ہے قدیم تصور تبدیلی سے اجنبی ہے۔" (11)

کوپر بھی اس بات پر زور دیتا ہے کہ تاؤ متی فلکیات دائروی ہے' ارتقائی نہیں۔" (12) اور

نیدھم بتاتا ہے کہ اس کی اصل کیا ہے'' وہ خاص طور سے دائروی حرکت سے متاثر تھے نہ صرف موسموں، زندگی اور موت بلکہ تمام قسم کی قابل مشاہدہ آفاقی اور حیاتیاتی مظاہر کی تبدیلیوں سے متاثر تھے۔''(13)

تاؤمتی عالمی نقطۂ نظر کے یہ چار عناصر وحدت۔ تضاد۔ ہوتے رہنا اور دائرویت جب اکٹھے لیے جائیں تو یہ جدلیاتی فلسفہ وجودیات (Dilectical Ontology) پیش کرتے ہیں۔ یہ روایتی چینی جدلیات مغربی جدلیات کے وحدت (کلیت) اختلاف (تضاد) ہوتے رہنے (نفی کی نفی) کے تصورات کے متوازی ہے۔ جبکہ یہ اپنے دائروی تصور میں مغربی مرغولائی تصور تبدیلی یا ترقیاتی تبدیلی کے تصور سے مختلف ہے۔

ان چاروں اصولوں کو ''تائے جی'' یا عظیم بنیادی حقیقت کی مشہور علامت میں بصری نمائندگی دی گئی ہے۔ اس کی دائرویت وحدت کی نمائندگی کرتی ہے اس کی ین اور یانگ میں تکمیلیت اختلاف کی نمائندگی کرتی ہے ین کا یانگ میں اظہار اور یانگ کا ین میں اظہار ایک کے دوسرے میں نہ ختم ہونے والی تبدیلی یا ہوتے رہنے کی نمائندگی کرتی ہے اور ساتھ یہ دکھاتی ہے کہ تضاد اپنی اصل میں اندرونی ہوتا ہے۔ ان متخالفات کی ایک دوسرے میں نہ ختم ہونے والی تبدیلی کسی طرح بھی علامت کی وحدت کو تبدیل نہیں کرتی جو سارے عمل کے دائروی اعادے کی نمائندگی کرتی ہے۔

جس طرح تاؤمت ایک جدلیاتی علم وجودیات پیش کرتا ہے اسی طرح یہ ایک (Dilectical Epistemology) جدلیاتی علمیات بھی تجویز کرتا ہے۔ یہ خاص طور سے علم کی تجرباتی اساس پر اصرار سے اور کنفیوشسی تعلیمات جو کتابوں سے سیکھنے پر مشتمل تھیں کو بلاواسطہ ہدف تنقید بنانے سے واضح ہوتا ہے۔ ''چان'' بیان کرتا ہے ''نوکنفیوشنی لوگ کتابوں سے سیکھنے کے عمل کی اہمیت اور ناگزیری پر زور دیتے تھے تاکہ وہ وجہ دانائی حاصل کریں۔ وہ یہ واضح کرتے تھے کہ کنفیوشس اور مینشیس پیدائشی طور پر دانا نہ تھے۔ انہوں نے مطالعے میں انہماک کے ذریعے دانائی حاصل کی۔''(14)

لیکن تاؤمتی علمیات میں بار بار اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ عالم نہیں بلکہ ماہر کاریگر دانا

آدمی ہوتا ہے۔ یوں تجرباتی علم کا اس علم سے موازنہ کیا جاتا ہے جو محض نظریاتی ہو۔ مثال کے طور پر ''زوانگ زی'' ہمیں بتاتا ہے کہ ایک پہیے بنانے والے نے شاہنشاہ کو یہ کہنے کی جرات کی کہ چونکہ وہ خود بڑھئی کا کام پڑھنے کے ذریعے کبھی نہ سیکھ سکتا تھا اس لیے شاہنشاہ کو کنفیوشس کی کتابیں جو وہ پڑھ رہا تھا نیچے رکھ دینی چاہئیں اور جا کر اپنی سلطنت کی حقیقتوں کا عملی تجربہ کرنا چاہیے۔'' (15) زوانگ ذی بالکل واضح کر دیتا ہے کہ'' تاؤمتی لوگ کتاب سے علم حاصل کرنے کی مخالفت نہیں کرتے لیکن وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نظریاتی علم کو صرف عملی تجربے سے درست کر کے ہی علم کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔'' (16)

تاؤمتی علمیات کا دوسرا عنصر اضافیت سے متعلق ہے۔ تمام علم دیکھنے والے کے تناظر سے اضافی سمجھا جاتا ہے۔ ہومز ویلچھ نے تاؤمت کو ''مکمل اضافیت'' قرار دیا ہے'' تاؤمت کا پہلا بڑا اصول تمام صفات کی اضافیت ہے'' (17) کنفیوشنی عالمی نقطہ نظر میں علم حتمی ہے۔ تاؤمتی اس کے برعکس دیکھنے والے کے تعصبات کی اپنے موضوع کے فہم میں مداخلت پر مسلسل توجہ دیتے ہیں۔

نیدھم کہتا ہے ''سمجھا جاتا تھا کہ حقیقت جزوی طور پر دیکھنے والے کے زاویہ نگاہ کا سوال ہے۔'' لیوشیہ چھن کہتا ہے ''اگر ایک آدمی پہاڑ پر چڑھ جاتا ہے تو اسے نیچے بیل بھیڑوں جیسے نظر آتے ہیں۔ اور بھیڑیں خارپشت (سیہ) جیسی حالانکہ ان کی اصلی شکل بہت مختلف ہوتی ہے۔ یہ مشاہدہ کرنے والے کے مقام نظارہ (زاویہ نگاہ) کا سوال ہے۔'' (18)

اضافیت کا عنصر حتمی آراء قائم کرنے میں مانع ہوتا ہے۔ آدمی علم کی اضافیت کی حساس تفہیم سے ہی بدلتے ہوئے حالات سے عہدہ برا ہونے کے لیے آزاد رہ سکتا ہے۔ لائی ذی میں لکھا ہے ''کسی بھی حالت میں کوئی ایسا اصول نہیں ہے جو تمام حالات میں ٹھیک ہو یا کوئی عمل جو تمام حالات مین غلط ہو۔'' (19)

تاؤمتی عالمی نقطۂ نظر کے یہ چھ عناصر علم وجودیات اور علمیات کی تعمیر کے لیے جدلیاتی منطق استعمال کرتے ہیں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ تاؤمتی جدلیاتی منطق اور مغربی روایت کا جدلیاتی منطق ایک ہی ہیں۔ لیکن دونوں منطق بنیادی طور پر مساوی عناصر کے حامل ہیں۔

چینی کلچر میں تاؤمتی جدلیات مشاغل اور کھیلوں میں بھی سموئی ہوئی تھی۔ وی قی ایک بورڈ پر گوٹیوں سے کھیلی جانے والی کھیل ہے جو ہان خاندان کے دور 200 ق۔م سے چلی آ رہی ہے۔ اس کھیل کا جاپانی نام ''گو'' ہے سکاٹ بورمین کہتا ہے ''وی قی فن جدلیات کی ایک شاخ ہے۔ غیر مسلسل رشتوں مرتکز پھیلاؤ جوابی گھیرے والے گھیرے لچکدار عدم لچک کی جدلیات ہے۔'' (20)

قدیم چینی باکسنگ (مکے بازی) تائے جی چوان یا عظیم حتمی مکے بازی فن حرب کی خاص قسم ہے جو تاؤمتیوں نے ایجاد کی تھی جو نرم کو سخت پر آہستہ کو تیز پر ین کو یانگ پر قابو پانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ تائے جی چوان جدلیاتی فکر سے اٹی پڑی ہے۔

''جب آپ اوپر بڑھ رہے ہوں تو آپ کو نیچے کو نہیں بھولنا چاہیے۔ جب آپ دائیں طرف جا رہے ہوں تو آپ کو بائیں طرف توجہ دینی چاہیے اور جب آپ آگے بڑھ رہے ہوں تو آپ کو پیچھے ہٹنے کا خیال رکھنا چاہیے۔'' (21)

سن زو ''جنگ کے عوامل'' کی فہرست دیتے ہوئے کہتا ہے پہلا اصول ہے تاؤ کی مطابقت میں ہونا۔ وہ لکھتا ہے ''جو جنگ میں مہارت رکھتے ہیں ان کے لیے تاؤ کو جاننا اور قوانین کو محفوظ کرنا ضروری ہے اسی بنا پر وہ فتح مندانہ پالیسیاں بنانے کے قابل ہوتے ہیں۔'' (22) سب سے اہم بات یہ ہے کہ ساری کتاب کی منطق تاؤمتی عالمی نقطۂ نظر سے موافقت رکھتی ہے۔ چینی سماج میں بکھرے ہوئے خیالات کو لاؤزی نے مربوط کیا اور اپنی کتاب تاؤتے چنگ میں تاؤمتی عالمی نقطۂ نظر پیش کیا۔ سن زو اکثر لاؤزی کی طرح بولتا محسوس ہوتا ہے۔

سن زو کہتا ہے ''ایک فوج کو پانی کی طرح کہا جا سکتا ہے کیونکہ جس طرح پانی بلندیوں سے احتراز کرتا ہے اور پستیوں کی طرف تیزی سے جاتا ہے اسی طرح ایک فوج مضبوطی سے احتراز کرتی ہے اور کمزوری پر وار کرتی ہے۔'' لاؤزی کہتا ہے ''آسمان تلے پانی سے زیادہ کوئی نرم اور اطاعت گزار (لچکدار) نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ٹھوس اور مضبوط پر حملہ کرنے کے لیے اس سے کوئی بہتر نہیں ہے۔ کوئی اس کے برابر نہیں ہے۔'' (23)

سن زو کہتا ہے ''جنگ ریاست کے لیے نہایت اہم سوال ہے۔ زندگی اور موت کا سوال بقایا

تباہی کے راستے کا سوال۔ لہٰذا یہ ایسا موضوع ہے جو سنجیدہ مطالعے کا متقاضی ہے'' (باب 1)
''عام طور پر جنگ میں پورے دشمن کو صحیح سالم قبضے میں لینا بہترین پالیسی ہوتی ہے۔ اسے تباہ کرنا نہیں۔ دشمن کی پوری کی پوری فوج سے ہتھیار ڈالوانا بہتر ہوتا ہے نہ کہ اسے کچل دینا۔ اسی طرح ایک بٹالین' ایک کمپنی یا پانچ آدمیوں کے جتھے کو صحیح سالم قابو کرنا بہتر ہے نہ کہ اسے تباہ کرنا۔ اس لیے سو لڑائیاں لڑنا اور ہر ایک کو جیتنا زیادہ عقلمندی نہیں ہے۔ دشمن کی قوت مزاحمت کو بغیر لڑے ہوئے توڑنا یقیناً قابل تعریف ہے۔ اس لیے جنگ میں بہترین پالیسی دشمن کی حربی تزویر کو ناکام بنانا ہے۔ دوسری بہترین سفارتی ذرائع سے اس کے اتحاد کو توڑنا ہے۔ تیسری بہترین اس کی فوج پر میدان میں حملہ کرنا ہے۔ سب سے بدترین پالیسی فصیلی شہروں پر حملہ کرنا ہے'' (تیسرا باب)

لاؤزی کہتا ہے:

''برائی کے ہتھیار''

''تمام اشیاء میں سے (ہتھیار بند) فوجی برائی کا ذریعہ ہیں جن سے لوگ نفرت کرتے ہیں اس لیے تاؤمتی دانا ان سے گریز کرتا ہے۔
ایک شریف آدمی سولین زندگی میں بائیں کو پسند کرتا ہے۔
لیکن فوجی موقعوں پر دائیں کو پسند کرتا ہے
(بائیاں اور دایاں چینی کلچر میں تقریباتی انتظام ہیں۔ بایاں تخلیقی اور اچھے شگون کی علامت ہے اور دایاں تباہ کن اور برے شگون کی)
فوجی برائی کے ہتھیار ہیں
وہ کسی شریف آدمی کے ہتھیار نہیں ہیں
جب فوجیوں کا استعمال ناگزیر ہو جائے
تو بہترین پالیسی پُرسکون ضبط ہے
(جنگی) فتح میں بھی کوئی خوبصورتی نہیں
اور اسے کون خوبصورت کہتا ہے

وہی جو قتل وغارت میں خوش ہوتا ہے
اور وہ جو قتل وغارت میں خوش ہوتا ہے
دنیا پر حکومت کرنے کے مقصد میں کامیاب نہیں ہوگا'' (24)

(The Wisdom of China) p. 4

سن زو کے ہاں فتح وسیع تر مقصد کا حصول ہے محض جنگی نہیں۔ وہ ''کل'' کو پیش نظر رکھتا ہے اس میں اس کے دشمنوں اور اتحادیوں دونوں کے نقطۂ نظر کی گنجائش ہے۔ وہ فوری نفع ونقصان سے پرے دیکھتا ہے اور اختلاف وتضاد کی تہ تک پہنچتا ہے۔ اس کے لیے فتح اپنے ہونے کا اثبات زیادہ اور ایک آخری منزل کم ہے یہ وہ بنیاد ہے جس کی بنا پر ہم تنازع میں زیادہ موثر طریقے پر شامل ہو سکتے ہیں۔

اس کے لیے فتح جنگ اور امن کی دوجزویت سے پرے ہے۔ بعض اوقات جنگ ضروری ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بہت کچھ جو اچھا ہوتا ہے اسے بھی تباہ کر دیتی ہے۔ انسانی سماج میں مکمل امن ناممکن ہے۔ لہٰذا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کسطرح تنازعے سے احتراز کیا جائے اور نہ ہی یہ کہ اپنے آپ کو بہتر طور پر مسلح کیا جائے لیکن یہ کہ اس میں کس طرح دانائی ورحمدلی سے موثر انداز میں شمولیت کی جائے۔

سن زو کہتا ہے کہ اگر کارگر ہونا ہے تو تمام فوج کے جاری عمل میں وحدت ہونی ضروری ہے ''وہ جس کے سپاہی مقصد میں متحد ہیں فتح مند ہوگا''۔ وہ یہ بھی زور دیتا ہے کہ یہ وحدت بادشاہ کو بھی نہیں توڑنی چاہیے۔ ''اگر صورت حال فتح مندی کی ہے لیکن بادشاہ نے حکم جاری کر دیا ہے کہ جنگ نہ کی جائے۔ تو بھی جرنیل جنگ کرنے کا فیصلہ کر سکتا ہے'' اور اسی طرح اس کے برعکس۔ (25) -

اپنے تزویراتی منطق میں سن زو تضادات کی تکمیلت کا بہت استعمال کرتا ہے وہ جدلیاتی جوڑوں کی ''تخلیق باہم'' کا ذکر کرتا ہے۔ ''انکا آپس کا تعامل اتنا بے حدوحساب ہے جتنا ایک دوسرے میں الجھے ہوئے دائروں کا۔ کون اس بات کا تعین کر سکتا ہے کہ کہاں ایک ختم ہوتا ہے اور دوسرا شروع ہوتا ہے۔'' دوسری صدی قبل مسیح میں ٹساؤ ٹساؤ نے کہا ''سن زو خطرات میں نہاں فائدوں اور فائدوں میں نہاں خطرات پر غور کرتا ہے۔'' سن زو اس تضاد والے منطق کا بہت سے

دائروں پر اطلاق کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ''ظاہری بدنظمی اچھے نظم کی پیداوار ہے۔ ظاہر بزدلی جرات کی اور ظاہری کمزوری طاقت کی۔''

''اس لیے جب عمل کے قابل ہوتو ظاہر کرو کہ نا قابل ہو۔ جب متحرک ہوتو غیر متحرک جب نزدیک ہوتو ظاہر کرو کہ تم دور ہو اور جب دور ہوتو ظاہر کرو کہ قریب ہو۔''(26)

سن زو لکھتا ہے ''اچھے نظم میں ہوتے ہوئے وہ ایک بدنظمی کے شکار دشمن کا انتظار کرتے ہیں۔ خاموشی وسکون سے وہ ایک شور وغوغے والی فوج کا انتظار کرتے ہیں۔''(27)

سن زو نے ایک دلکش جدلیاتی جوڑے زنگ قوتوں (بلاواسطہ/ عام) اور قی قوتوں (غیر معمولی۔ اچنبھے والی حیران کن) کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ ان میں صرف فرق ہی نہیں بیان کرتا بلکہ بڑے واضح طور پر ''ہوتے رہنے'' کے عنصر کو انکی ''باہمی باز تخلیقیت'' کے لیے استعمال کرتا ہے۔ گرفتھ نے سن زو کا اس موضوع پر تجزیہ یوں کیا ہے ''معمول کی زنگ قوتیں دشمن کو پابند کرتی یا بھٹکاتی ہیں اور غیر معمولی (قی) قوتیں اس وقت اور وہاں عمل کرتی ہیں جہاں ان کے حملوں کی توقع نہیں کی جاتی۔ اگر دشمن قی تدبیر کو بھانپ لے اور یوں عمل کرے کہ یہ تدبیر بے اثر ہو جائے تو پھر یہ تدبیر خود بخود زنگ ہو جائے گی۔''(28)

سن زو کے لیے ایک جدلیاتی جوڑے کے عناصر کے درمیان رشتہ صرف تجزیاتی فرق کا ہی نہیں بلکہ دو متخالف لیکن تکمیلی پہلوؤں کے درمیان مسلسل جاری تعامل باہمی کا تجزیہ ہے۔ کئی صدیوں بعد قدیم چینی جدلیاتی روایت کو جدید مغربی جدلیات سے ہم آہنگ کرنے والا ماؤزے تنگ اسی منطق کو استعمال کرتا ہے بلکہ اسکی اہمیت پر زیادہ زور دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے ''لڑائی کی دونوں شکلیں جارحانہ اور دفاعی استعمال کی جاتی ہیں۔ چین کی خانہ جنگی کی خاص حالت میں لمبے عرصے تک یہ دونوں شکلیں بار بار ادل بدل ہوتی رہیں گی۔''(29)

ان متخالفات کی ایک دوسرے میں تقلیب کا منطق اور زیادہ واضح انداز میں ماؤ کی ''طویل جنگ'' میں بیان کیا گیا ہے ''حملہ دفاع اور دفاع حملے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ پیش قدمی پسپائی میں اور پسپائی پیش قدمی میں بدلی جا سکتی ہے۔ روکنے والی افواج حملہ کرنے والی افواج میں اور حملہ کرنے والی افواج روکنے والی افواج میں بدل سکتی ہیں۔''(30)

اسی منطق کا سن زو دشمن کی سپاہ پر بھی اطلاق کرتا ہے ''قیدیوں سے اچھا سلوک کرو اور ان کا

خیال رکھو۔(31) دوسرے لفظوں میں دشمن کی سپاہ اچھے سلوک اور نرمی والے برتاؤ کی بنا پر آپ کی سپاہ بن سکتی ہے۔

دائرویت کا عنصر سن زو کے ہاں محدود طور پر پایا جاتا ہے۔ مثلاً ''فوجی چالوں میں صرف دو طرح کا عمل ہے ژی اور ژنگ اس کے باوجود انکی گونا گونیاں لامحدود ہیں۔ وہ مسلسل ایک دوسرے میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں جیسے دائرے میں حرکت کر رہی ہوں نہ ہی کسی آغاز اور نہ ہی کسی اختتام کے ساتھ۔ ان کے امکانات کو کون ختم کرسکتا ہے۔'' (باب 5)

اکثر بدلتے ہوئے عملی حالات سے عہدہ برا ہونے کے لیے منصوبوں اور نظریات کار کے بغیر جائزہ لیتے رہنے کا علمیاتی تقاضہ ''اضافیت'' (تخصیص) کا عنصر متعارف کراتا ہے۔ یہ عنصر سن زو کی تحریر کا اہم حصہ ہے۔ وہ زور دیتا ہے کہ ''آدمی کو بدلتے ہوئے حالات کے تحت عمل کرنا چاہیے'' کیونکہ تدابیر اگر ایک حالت میں کارگر ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دوبارہ استعمال کی جائیں۔ ''جب میں ایک فتح حاصل کر لیتا ہوں تو اپنی تدابیر کا اعادہ نہیں کرتا۔ بلکہ حالات کا جواب لامحدود طور پر گونا گوں طریقوں سے دیتا ہوں۔'' شاید کامیاب تدابیر کا تجزیہ کرنا ناکام تدابیر کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے سن زو لکھتا ہے۔ ''یوں وہ جو دشمن کی حالت کے مطابق اپنی تدابیر میں تبدیلی کر کے فتح حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے اسے صاحب کمال کہا جاسکتا ہے۔''

اضافیت کا یہ عنصر چینیوں کے ہاں ڈِ (درستی) کے تاؤمتی عنصر سے ناقابل علیحدگی ہے۔ صورت حال کے عین مطابق عمل کرنے کے باوجود نتیجہ دو فوجوں کے اتفاقیہ تدبیراتی تعامل سے برآمد نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک فوج دوسری کو لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی اس کی تزویر کو شکست دے کر اس پر فتح حاصل کر چکی ہوتی ہے۔ جیسا کہ سن زو کہتا ہے ''یوں ایک فتح مند فوج لڑائی سے پہلے اپنی فتوحات حاصل کرتی ہے۔ وہ جس کا مقدر شکست ہوتا ہے وہ جیتنے کی امید میں لڑتی ہے۔'' آدمی بدلتے ہوئے حالات کے بارے میں کیسے جان سکتا ہے؟ ٹھوس تحقیقات سے۔ سن زو کہتا ہے کہ فتح کی چابیاں تو ہیں لیکن ''ان پر پہلے سے بحث نہیں ہوسکتی'' اسی موضوع پر سنگ خاندان کا دانشور می پاؤ چن کہتا ہے ''جب دشمن سے سامنا ہو تو بدلتے ہوئے حالات سے نپٹو اور حسب موقع اختراع کرو۔ اس پر پہلے بحث کس طرح کی جاسکتی ہے؟'' (32)

اسی موضوع پر سن زو کہتا ہے ''اب فوجی کارروائیوں پر لاگو ہونے والا قانون اسی طرح ہے جس طرح کہ بہتے ہوئے پانی پر لاگو ہونے والا جو ہمیشہ اونچی جگہوں سے گریز کرتا ہے۔ انکی بجائے نیچی جگہیں چنتا ہے۔ فوج کو کامیابی سے استعمال کرنے کے لیے ہمیں دشمن کے مضبوط پہلوؤں سے بچنا چاہیے اور اس کے کمزور پہلو تلاش کرنا چاہئیں۔ جس طرح پانی اپنا راستہ زمین کے خدوخال کے مطابق بدلتا ہے اسی طرح ایک جنگجو اپنی چالیں دشمن کی بدلتی ہوئی حالتوں کی مطابقت میں بدلتا ہے۔ جنگ میں کوئی غیر مبدّل چال نہیں ہوتی۔ جس طرح پانی کے بہاؤ میں کوئی مستقل راستہ نہیں ہوتا۔ وہ جو فتح مند ہوتا ہے اپنی چالوں کو دشمن کی بدلتی ہوئی حالت کے مطابق بدلتا ہے اور اس سے معجزے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔'' (باب 6)

سن زو کے ہاں فن حرب ایک لامتناہی تخلیقیت ہے جس میں اعادے اور تکرار کو کوئی دخل نہیں۔ ''دشمن وہ چالیں جان سکتا ہے جن سے ہم فتح حاصل کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ ہم ان چالوں کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ ہر فتح کے بعد ہم ان چالوں کو استعمال نہیں کرتے۔ ہم انہیں بدلتے ہوئے حالات سے موافقت کے لیے مسلسل بدلتے ہیں۔'' (باب 6)

اس مسلسل تخلیقیت کی بنیاد بدلتے ہوئے حالات کا معروضی جائزہ اور اس کی روشنی میں موزوں ردعمل ہے۔ اس لیے کہتا ہے ''اپنے دشمن کو جانو اور اپنے آپ کو جانو اور تم بلاخطر سینکڑوں جنگیں لڑ سکتے ہو۔ اگر تم دشمن سے ناواقف ہو اور صرف اپنے آپ کو جانتے ہو تو تمہاری فتح اور شکست کے امکانات برابر ہوں گے۔ اگر تم نہ دشمن کو اور نہ اپنے آپ کو جانتے ہو تو پھر لازمی طور پر ہر جنگ میں شکست کھاؤ گے۔'' (باب 3)

دشمن کو جاننے کے لیے جاسوسوں کے استعمال سے متعلق کہتا ہے ''روشن دماغ حکمران اور قابل کماندار ہر چال پر دشمن کو فتح کرتے ہیں اور ایسی کامیابی حاصل کرتے ہیں جو عام لوگوں کی کامیابیوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ان کے پاس ''پیش بینی'' ہوتی ہے۔ یہ ''پیش بینی'' آسیبوں اور روحوں سے حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی ماضی کے واقعات کی تشبیہات سے اور نہ ہی نجومی حساب کتاب سے۔ یہ صرف ان لوگوں سے آ سکتی ہے جو دشمن کی حالت جانتے ہیں۔'' جتنا

دشمن کواور اپنے آپ کو جاننا ضروری ہے۔ اتنا ہی دشمن سے اخفا ضروری ہے۔ (باب 13)

کیونکہ سن زو کے مطابق ''جنگ دھوکے کا کھیل ہے' اس لیے'' جب عسکری اہلیت رکھتے ہو تو ظاہر کرو کہ نا اہل ہو۔ جب حملے کے لیے تیار ہو تو ظاہر کرو کہ نہیں ہو۔ ظاہر کرو کہ تم دور ہو جبکہ درحقیقت قریب ہو اور اسی طرح اس کے برعکس'' (باب 1) دشمن کو اپنے منصوبوں کی ہوا نہ لگنے دینا نہایت اہم ہے۔ یوں دھوکے میں آنے کے بعد اسے سمجھ نہیں آتی کہ وہ کہاں حملہ یا دفاع کرے اور یوں اسے تمام محاذوں پر تیاری کرنی پڑتی ہے'' حملے کے ماہر کے خلاف دشمن کو سمجھ نہیں آتی کہ وہ کہاں دفاع کرے اور دفاع کے ماہر کے خلاف دشمن کو سمجھ نہیں آتی کہ کہاں حملہ کرے۔'' (باب 6) میدان جنگ کے انتخاب اور لڑائی کی تاریخ سے دشمن کی ناواقفی کے نتیجے میں ''اس کا بایاں بازو اس کے دائیں بازو کو نہ بچا سکے گا اور نہ ہی دایاں بائیں کو۔ اسی طرح اس کا ہراول اس کے عقب کو بچا سکے گا اور نہ ہی عقب ہراول کو۔'' (باب 6)

تاؤمتی عالمی نقطۂ نظر صرف ''فن حرب'' میں درج قوانین جنگ میں ہی مدون نہیں ہیں بلکہ کماندار کی شخصیت اور اس کے اوصاف بھی عام جنگی کماندار سے مختلف ہیں۔ وہ نہ صرف سن زو کے بتائے ہوئے قوانین جنگ میں طاق ہے بلکہ وہ پرسکون اور ناقابل فہم ہوتا ہے۔'' کماندار کا یہ فرض ہے کہ وہ پرسکون اور ناقابل فہم رہے۔ غیر جانبدار رہے اور نظم وضبط لاگو کرنے میں سخت گیر ہو۔ اپنے افسروں اور جوانوں کو اپنے جنگی منصوبوں سے بے خبر رکھنے کے لیے اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ ان کے کان بند اور آنکھوں کو اندھا کر سکے۔ وہ اپنے انتظامات میں ترمیم اور منصوبوں کو بدلتا ہے تاکہ اپنے ارادوں کو چھپا سکے'' (باب 11) یہ وہ خواص ہیں جو تاؤمتی دانائی کی منزل پا جانے والے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اور ''فن حرب'' میں مثالی کماندار اتنا'' عیار اور سبک ہوتا ہے کہ وہ کوئی نشان نہیں چھوڑتا۔ اتنا پراسرار ہوتا ہے کہ کوئی آواز پیدا نہیں کرتا۔ یوں وہ اپنے دشمن کی قسمت کا ثالث بن جاتا ہے'' (باب 6) یہ خواص تاؤمتی عالمی نقطۂ نظر اور اس پر عمل کے تناظر میں واضح ہوتے ہیں۔ تاؤمتی دانا ''شینگ'' اس حتمی حقیقت سے مکمل ہم آہنگی حاصل کر چکا ہوتا ہے جو روزمرہ زندگی جس سے ہم واقف ہیں کے پیچھے کارفرما ہے۔ ایسا فرد خود پسندانہ ارادے اور مقاصد ترک کر دیتا ہے ان معانی میں جن میں کہ ایک ایسا آدمی جو روشن دماغ نہیں ہے یہ

ارادے اور مقاصد رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ مکمل طور پر اور بلا ارادہ حقیقت کے بہاؤ کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

اور وہ جو تاؤ سے موافقت رکھتا ہے یعنی کائنات میں کارفرما اصول یا حقیقت مطلق سے موافقت رکھتا ہے اشیاء کے پورے نظام کی قوت اور اس کے رخ سے مستفیذ ہوتا ہے۔ اسے روکا نہیں جا سکتا۔ یوں ''ایک ماہر کماندار فتح صورتحال سے حاصل کرتا ہے اور اپنے ماتحتوں سے نہیں'' (باب 5) ''صورت حال'' اشیاء کے نظام کے رخ کا مظہر ہوتی ہے جس کا جواب (تاؤمتی دانا) کمانڈر مکمل مہارت اور حتمی غیر ارادیت سے دیتا ہے۔ ایسے دانا کماندار کو اپنے ماتحتوں کے عملی منصوبوں پر انحصار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

مختصراً یہ کہ مثالی کماندار میں ایک تاؤمتی دانا کی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ صرف ایسا آدمی ہی ایسی صورت حالات کا جن کے بارے میں پیش گوئی نہ کی جا سکتی ہو اور جو لامتناہی طور پر گونا گوں ہوں موزوں جواب دے سکتا ہے۔ کیونکہ ہر جنگ مختلف ہوتی ہے اس لیے صرف لچکدار رویے والا حالات سے موافقت رکھنے والا اور صاحب ایجاد و اختراع ہی جیتے گا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ سن زو جنگ کی تباہ کاریوں سے پوری طرح واقف ہے۔ اس لیے کہتا ہے ''فوری فتح جنگ کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔'' اور یہ کہ کبھی کسی لمبی جنگ نے کسی ملک کو فائدہ نہیں پہنچایا'' (باب 9) مغربی ماہر حرب کلازوٹز فتح کو آگ اور خون کا کھیل سمجھتا ہے۔ وہ ''شبنمی آنکھوں والے خواب پسندوں'' کو جو سوچتے ہیں کہ یہ کم خونریزی سے حاصل ہو سکتی ہے یا ہونی چاہیے نشانہ تضحیک بناتا ہے۔ لیکن سن زو کے ہاں وہ تباہی جو کلازوٹز کے ہاں روا اور لازمی ہے اس سے ممکنہ حد تک گریز ضروری ہے۔ کیونکہ جنگ کا مقصد دشمن کی وسیع پیمانے پر تباہی نہیں ہے۔ ''عام طور پر جنگ میں پورے ملک کو صحیح سالم قبضے میں لینا بہترین پالیسی ہوتی ہے اسے تباہ کرنا نہیں۔ دشمن کی پوری کی پوری فوج سے ہتھیار ڈلوانا بہتر ہوتا ہے نہ کہ اسے کچل دینا۔ اسی طرح ایک بٹالین ایک کمپنی یا پانچ آدمیوں کے جتھے کو صحیح سالم قابو کرنا بہتر ہے نہ کہ اسے تباہ کرنا۔ اس۔ لیے سو لڑائیاں لڑنا اور ہر ایک کو جیتنا زیادہ عقلمندی نہیں ہے۔ دشمن کی قوت مزاحمت کو بغیر لڑے ہوئے توڑنا یقیناً ہے (باب 3)

انسانی تاریخ ایک سطح پر لڑی جانے والی جنگوں کی تاریخ ہے۔ ان جنگوں میں فتح پانے والے یا شکست کھانے والے جرنیلوں اور کمانداروں کی تاریخ ہے۔ ''لیکن ایک ماہر جنگ کی جیتی ہوئی جنگ نہ تو اس کی عقلمندی کے لیے شہرت فراہم کرتی ہے اور نہ ہی اس کی بہادری کے لیے انعام کیونکہ اس نے لازمی طور پر جیتنا ہوتا ہے کیونکہ اس کی چالیں فتح کے یقینی ہونے پر مبنی ہوتی ہیں۔'' (باب 4)

تاؤمتی جدلیات کے اس شاہکار سے متعلق لڈل ہارٹ انگریز ماہر تزویرات لکھتا ہے ''سن زو کے ''فنِ حرب'' پر مضامین اس موضوع پر سب سے پہلے علمی مقالے ہیں۔ لیکن موضوع کے تمام پہلوؤں کے احاطے اور فہم کی گہرائیوں میں آج تک اس پر کوئی سبقت نہیں لے جا سکا۔ انہیں عمل حرب پر دانائی کا مرتکز خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ ماضی کے تمام عسکری مفکروں میں سے صرف کلازوٹز قابل مقابلہ ہے۔ لیکن وہ بھی سن زو کے مقابلے میں ''پرانا'' ہے سن زو زیادہ صاف مدبرانہ بصیرت زیادہ گہری دروں بینی اور ہمیشہ رہنے والی تازگی سے مالا مال ہے۔'' (33)

جیمز کلاویل کے ''فن حرب'' کے دیباچے کے اختتامیے پر ہم اس مقدمے کو ختم کرتے ہیں جو کچھ یوں ہے ''میں چاہوں گا کہ سن زو کی فن حرب کا مطالعہ ہمارے حاضر سروس جوانوں اور افسران کے لیے لازمی قرار دیا جائے نہ صرف فوجیوں کے لیے بلکہ تمام سیاستدانوں حکومتی عمال تمام ہائی سکولوں اور یونیورسٹیوں میں ضروری قرار دیا جائے۔ اگر میں کوئی سپہ سالار یا صدر یا وزیراعظم ہوتا تو میں اور آگے جاتا۔ میں قانون میں تحریر کر دیتا کہ تمام افسر خاص طور سے تمام جرنیلوں پر پابندی ہو کہ وہ ان تیرہ بابوں پر مشتمل نصاب کا زبانی اور تحریری سالانہ امتحان دیں۔ اور 95 فیصدی نمبر پاس ہونے کے لیے ضروری ہوں۔ اور کوئی جرنیل اگر 95 فیصدی سے کم نمبر حاصل کرتے تو اسے فوری طور پر بلا کسی ضابطے کی کارروائی کے برطرف کر دیا جائے۔ اس برطرفی پر کوئی اپیل نہ سنی جائے اور دیگر تمام ناکام ہونے والے افسران کی خودکار تنزلی کر دی جائے۔'' (34)

(سن زو: ''فن حرب'' کا زیرِنظر اردو ترجمہ پیپلز پبلشنگ ہاؤس بیجنگ کی طرف سے 1995 میں شائع ہونے والے انگریزی ترجمے سے کیا گیا) (مترجم)

Reference

1. Joseph Needham, *The Grand Tradition* London: George Allen Unwin, (1969) p.21.
2. Joseph Needham, *Science and Civilization in China (vol.2)* Cambridge University Press, 1956.
3- ان ”پانچ مراحل“ اور یونانی ”چار عناصر“ (آگ، زمین، ہوا، پانی) کا موازنہ اس نکتے کی وضاحت کر دیتا ہے۔ موخر الذکر ”عناصر“ کائنات کی تعمیری اکائیاں سمجھے جاتے تھے۔
4. Needham, 1956. p. 107.
5. J. C. Cooper, *Taoism: The way of the Mystic* (New York: Harper & Row, 1972) p. 28.
6. Raymond Van Oner , *Taoist Tales* (New York: Mentor, 1963) p. 1963.
7. Hellmut Wilhelm, *Eight lectures on the I Ching* (New York: 1963), p. 114.
8. Burton Watson, *The Complete works of chung Tzn* (New York: Ballentine Books, 1968)
9. Richard Wilhelm, *The I Ching* (New York: Bollinger Foundation, 1950)
10. Max Kaltenmark, *Lao Tzn and Taoism*. (Stanford: Stanford University Press, 1969) p. 26.
11. Wilhelm, op.cit., p. 20.
12. J. C. Cooper, op.cit., p. 46.
13. Needham, 1956. p. 75.
14. Chan Wing-tsit, op.cit., p. 62.
15. Needham, 1956. p. 122.
16. Watson, op.cit., p. 152.
17. Holmes Welch, *Taoism: The Parting of the way* (Boston: Beacon, 1957). P. 23.
18. Needham, 1956. p. 82.
19. A. C. Graham. *The Book of Lieh-Tzn* (New York: Paragon Books, 1960) p. 163.

20. Scott Boorman, *The Protracted Game. A Wei-Qi Interpretation of Maoist Revolutionary Strategy* (London: Oxford University Press, 1969) p. 4.
21. T. T. Liang, *Tai Chi Chuan* (Boston: Redwing Book Company, 1974) p. 11.
22. Samuel B. Griffith, *Sun Tzn: The Art of war* (London: Oxford University Press. p. 63, 88.
23. Feng Gia-fu and Jane English, *Tao Te-ching of Lao Tzn* (New York: Random House, 1972) ch.78.
24. *The Wisdom of China Lin yutang* , 1956 (Love and Malcomson Ltd.) London.
25. Griffith, op.cit., pp. 83.128.
26. Griffith, op.cit., pp 92, 113, 92. 66.
27. Griffith, p. 108.
28. Griffith, op.cit., p. 91.
29. Mao, 1966. p 31.
30. Mao, *on Protracted war* (Peking : Foreign Language Press, 1938. p. 102.
31. Griffith, op.cit., pp. 141.100.
32. Griffith, p. 70.
33. Griffith. *Sun Tzn The Art of war* (London, Oxford University Press)
34. James Clanell: *The Art of War by Sun Tzn Gnhine* Primtirs Lahore Pakistan.

❁

پہلا باب

اندازے لگانا

سن زو نے کہا: جنگ ریاست کے لیے نہایت اہم سوال ہے۔ زندگی اور موت کا سوال بقا یا تباہی کے راستے کا سوال۔ لہٰذا یہ ایسا موضوع ہے جو سنجیدہ مطالعے کا متقاضی ہے۔

جنگ کے نتیجے کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں متحارب پارٹیوں کا معائنہ کرنا ہوگا اور پانچ بنیادی اصولوں کے تحت ان کا موازنہ کرنا ہوگا۔

پہلا ہے۔ (تاؤ) یا قاعدہ دوسرا آسمان' تیسرا زمین' چوتھا حکم' اور پانچواں قواعد وضوابط۔ قاعدے سے میری مراد ہے اخلاقی اثر۔ یا وہ جو لوگوں کو اپنے بادشاہ سے مطابقت میں سوچنے کا باعث ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ ہر اونچ نیچ میں زندگی یا موت میں بلاخوف خطر اس کی اتباع کریں۔

''آسمان'' سے میری مراد ہے رات اور دن کے اثرات اچھے اور برے موسم کے اثرات سردیوں کی ٹھنڈ اور گرمیوں کی تمازت مختصر یہ کہ قدرتی طاقتوں کی تبدیلیوں کے مطابق فوجی کاروائیاں کرنا۔

''زمین'' سے میری مراد فاصلہ ہے چاہے وہ زیادہ ہو یا کم' سطح زمین چاہے وہ دھوکہ دینے والی ہو یا محفوظ' زمین چاہے کھلی ہو یا تنگ اور جگہ چاہے حیات بخش ہو یا مرگ آفریں زندگی کی پیش آگاہی والی ہو یا موت والی۔

''حکم'' سے میری مراد ہے قابل اعتماد ہونا' مہربانی' جرات اور کمانڈر کی استقامت۔

''قواعد وضوابط'' سے میری مراد ہے۔ وہ اصول جو فوجی یونٹوں کی تنظیم کی راہنمائی کرتے ہیں افسروں کی تقرری اور انتظام اور فوجی ساز وسامان مہیا کرنا اور اخراجات۔

کوئی ایسا جرنیل نہیں ہے جس نے ان پانچ عوامل کے بارے میں نہ سنا ہو۔ جو ان کا ماہر ہو جیتتا ہے اور جو نہیں ہوتا وہ ہارتا ہے۔ اس لیے کسی جنگ کے نتیجے کا اندازہ لگاتے ہوئے دونوں فریقوں کا ان عوامل کے حوالے سے موازنہ کرو اور اس کے مطابق حالات کا جائزہ لو۔

پتہ کرو کون سا بادشاہ زیادہ اخلاقی اثر رکھتا ہے' کون سا جرنیل زیادہ قابل ہے کون سے فریق

کو ’’آسمان‘‘ اور ’’زمین‘‘ کی برتری حاصل ہے کونسی فوج بہتر نظم وضبط رکھتی ہے‘ کس کے فوجی بہتر ہتھیار اور تربیت رکھتے ہیں‘ کونسی کمانڈ انعامات اور سزائیں دینے میں زیادہ غیر جانبدار ہے۔ اور میں پیش گوئی کر سکوں گا کہ کونسا فریق فتح مند ہوگا۔

وہ جرنیل جو میرے اندازوں کے طریقے استعمال کرے وہ لازمی طور پر جیتے گا۔ لہٰذا میں اس کے ساتھ رہوں گا۔ وہ جرنیل جو میرے الفاظ پر کان نہیں دھرے گا لازمی طور پر شکست کھائے گا میں اسے چھوڑ دوں گا۔

متعلقہ فائدوں اور نقصانات کے اندازوں پر توجہ دینے کے بعد جرنیل کو ایک موافق تزویراتی صورت حال پیدا کرنی ہوگی جو فتح کو یقینی بنائے۔ اس سے میری مراد ہے لچکدار ہونا اور جنگ میں پہل قدمی حاصل کرنے کے لیے فائدوں کا بھرپور استعمال کرنا۔

جنگ دھوکے کا کھیل ہے۔ لہٰذا جب عسکری اہلیت رکھتے ہو تو ظاہر کرو کہ نااہل ہو۔ جب حملے کے لیے تیار ہو تو ظاہر کرو کہ نہیں ہو‘ ظاہر کرو کہ تم دور ہو جبکہ درحقیقت قریب ہو‘ اور اسی طرح اس کے برعکس۔

جب دشمن کچھ حاصل کرنے کے لالچ میں ہو اسے لبھانے کے لیے طمع دو جب وہ غیر منظم ہو اس پر حملہ کرو اور غالب ہو جاؤ۔ جب وہ معقول طاقت کی بڑ مارے تو اس کے خلاف دوہری تیاری کرو۔ اور جب وہ ہیبت ناک ہو اس کا سامنا نہ کرو۔ اگر وہ غصیل ہے تو اسے انگیخت کرو اگر وہ ڈرپوک اور محتاط ہے تو اس کی گستاخی کی حوصلہ افزائی کرو۔ اگر اس کی افواج نے آرام کیا ہے تو اسے تھکا دو۔ اگر وہ متحد ہے تو اسے تقسیم کرو۔ وہاں حملہ کرو جہاں وہ کم سے کم تیار ہے۔ اس وقت کارروائی کرو جب وہ بالکل توقع نہیں رکھتا۔

ایک ماہر تزویرات کی کمانڈ کی فنکاری ان عوامل میں مضمر ہے جنہیں پہلے سے لگے بندھے اصولوں میں منضبط کرنا ناممکن ہے۔

جو جنگ سے پیشتر عبادت گاہ میں ہونے والی کونسل میٹنگ (ایک قدیم چینی روایت) میں حالات کا بھرپور جائزہ لیتا ہے جیتنے کے زیادہ امکانات رکھتا ہے۔ جو اس میٹنگ میں حالت کا ناکافی اندازہ لگاتا ہے فتح کا کم امکان رکھتا ہے۔ جب بات یوں ہو تو اُس کے جیتنے کا کیا امکان ہے جو بالکل کوئی اندازہ نہیں لگاتا۔ اپنے اندازہ لگانے کے طریقے سے میں پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ کس کے فتح مند ہونے کا امکان ہے۔

دوسرا باب

عمل جنگ

سن زو نے کہا: عام طور پر ایک جنگی عمل کے لیے ایک ہزار ہلکے رتھ چاہئیں اتنی ہی بھاری رتھیں اور ایک سو ہزار زرہ بند سپاہی بمع اتنے سامان خورد و نوش کے کہ وہ انہیں ایک ہزار لی تک لے جا سکے۔ ملک کے داخلی اور میدان جنگ کے اخراجات کیا ہوں گے؟ سرکاری مہمانوں اور سفارتی وفود کی تواضع کے لیے وظائف' ایسے مواد کی قیمت جیسے گوند اور لاکھ روغن (سازوسامان کی بحالی کے لیے) اور وہ رقوم جو رتھوں اور زرہ بکتروں کو محفوظ رکھنے پر خرچ ہوں' یوں کل خرچ ایک ہزار سونے کے ٹکڑے فی یوم ہوگا۔ جب یہ سارا پیسہ ہاتھ میں ہو تو پھر ہی ایک سو ہزار آدمیوں کی فوج کھڑی کی جا سکتی ہے۔

ایسی جنگ جس میں اتنی بڑی فوج استعمال ہو تو اس میں بنیادی مقصد فوری فتح ہونا چاہیے۔ اگر جنگ لمبی ہو جائے تو ہتھیار کند ہو جائیں گے اور آدمیوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ جب وہ شہروں پر حملہ آور ہوں گے تو ان کی طاقت ختم ہو جائے گی۔ طویل جنگی کارروائیاں خزانے پر سنجیدہ بوجھ ہوں گی۔ اب جب آپ کے ہتھیار کند ہو چکے ہیں آپ کا حوصلہ پست ہو چکا ہے۔ آپ کی طاقت ختم ہو چکی ہے اور آپ کا خزانہ خرچ ہو چکا ہے تو پڑوسی ریاستیں حملے کے لیے آپ کی بدحالی کا فائدہ اٹھائیں گی ایسی صورت میں چاہے کوئی کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو تباہ کن نتائج سے بچ نہیں سکتا۔

یوں' جبکہ ہم نے جنگ میں جلدی فیصلے حاصل کرنے کی تلاش کی غلطیوں کے بارے میں تو سنا ہے لیکن لمبے عرصے تک گھسٹنے والی پُرکار کارگزاری ابھی تک نہیں دیکھی۔ اس لیے کہ کبھی کوئی ایسی لمبی جنگ نہیں ہوئی جس سے کسی ملک نے فائدہ اٹھایا ہو۔ جو جنگ لڑنے کے نقصانات سے پوری طرح واقف نہیں وہ سود مند طریقے سے جنگ لڑنے کے طریقوں سے بھی واقف نہیں ہوتے۔

جو جنگ لڑنے کے ماہر ہیں انہیں اپنے گھریلو ملک سے دوبارہ جبری بھرتی یا سامان خوردونوش کے ازسرنو ذخیرے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنا عسکری سازوسامان اپنے ملک سے لیتے ہیں لیکن سامان خوردونوش دشمن زمین سے جبری چھین لیتے ہیں۔ یوں ان کی فوج ہمیشہ سامان خوردونوش میں فراواں ہوگی۔ جب کوئی ملک فوجی کارروائیوں سے غریب ہوجاتا ہے وہ اس لیے کہ ان میں لمبے فاصلوں کی مواصلات درپیش ہوتی ہے۔ لمبے فاصلوں پر سازوسامان کی ترسیل لوگوں کو کنگال کردیتی ہے۔ کسی فوج کی نزدیکی قیمتوں میں زیادتی کا باعث بنتی ہے اور اونچی قیمتیں لوگوں کے ذرائع کو نچوڑ لیتی ہیں۔ جب ذرائع ختم ہوجاتے ہیں تو پھر لازمی طور پر جبری وصولیاں اور محصولات بڑھیں گے۔ فوجی طاقت میں یوں کمی ہونے' دولت کے ختم ہونے سے لوگوں کے گھر خالی کردیئے جائیں گے۔ لوگوں کی ستر فیصد آمدنی برباد ہوجاتی ہے اور حکومت کے محصولات کا ساٹھ فیصد حصہ ٹوٹی ہوئی رتھوں کی مرمت تھکے ماندے گھوڑوں زرہوں اور خودوں' تیروں اور کمانوں' گنڈاسوں اور سپروں نیزوں اور ڈھالوں اور بوجھ کھینچنے والے بیلوں اور بوجھل چھکڑوں پر خرچ ہوتا ہے۔

اس لیے ایک عقلمند جرنیل اپنی فوج کو دشمن کا غلہ کھلاتا ہے کیونکہ ایک ''زونگ'' (لٹرز 1,000) غلہ جو دشمن کی سرزمین سے لیا جائے وہ اپنے وطن سے لیے گئے 20 زونگ کے برابر ہے اور ایک ''ڈان'' (کلوز 60) چارہ جو دشمن سرزمین سے لیا جائے وہ اپنے وطن کے 20 ''ڈان'' کے برابر ہے۔

اپنے آدمیوں کو جرات دلانے کے لیے تاکہ وہ دشمن کو ملیامیٹ کردیں آپ کو ان کا حوصلہ بڑھانا ہوگا۔ اپنے آدمیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے تاکہ وہ دشمن کا سازوسامان چھینیں آپ کو انہیں مادی انعامات دینے ہوں گے۔ اس لیے رتھوں کی ایک لڑائی میں جب دس سے زیادہ دشمن رتھیں پکڑی جائیں تو جنہوں نے سب سے پہلے پکڑی ہیں انہیں انعام دینا چاہیے۔ دشمن کے علم اور جھنڈوں کو اپنے جھنڈوں اور علموں سے بدل دینا چاہیے اور پکڑی ہوئی رتھیں اپنی رتھوں کے ساتھ استعمال کرنی چاہئیں۔ یہ ہے جسے کہتے ہیں دشمن پر قابو پاتے ہوئے اپنی قوت بڑھانا۔

جنگ میں جو اہم ہے وہ ہے فوری فتح نہ کہ لمبی کارروائیاں۔ وہ سالار جو جانتا ہے کہ جنگ کیسے لڑی جاتی ہے وہ عوام کی قسمت کا ثالث ہے وہ جس پر قوم کی سلامتی کا انحصار ہے۔

تیسرا باب

حربی تزویر کے ذریعہ حملہ کرنا

سن زو نے کہا: عام طور پر جنگ میں پورے دشمن ملک کو صحیح سالم قبضے میں لینا بہترین پالیسی ہوتی ہے اسے تباہ کرنا نہیں۔ دشمن کی پوری کی پوری فوج سے ہتھیار ڈالونا بہتر ہوتا ہے نہ کہ اسے کچل دینا۔ اسی طرح ایک بٹالین، ایک کمپنی یا پانچ آدمیوں کے جتھے کو صحیح سالم قابو کرنا بہتر ہے نہ کہ اسے تباہ کرنا۔ اس لیے سو لڑائیاں لڑنا اور ہر ایک کو جیتنا زیادہ عقلمندی نہیں ہے۔ دشمن کی قوت مزاحمت کو بغیر لڑے ہوئے توڑنا یقیناً ہے۔

اس لیے جنگ میں بہترین پالیسی دشمن کی حربی تزویر کو ناکام بنانا ہے۔ دوسری بہترین سفارتی ذرائع سے اس کے اتحاد کو توڑنا ہے۔ تیسری بہترین اس کی فوج پر میدان میں حملہ کرنا ہے۔ سب سے بدترین پالیسی فصیلی شہروں پر حملہ کرنا ہے۔

اس لیے جو جنگ کا ماہر ہے وہ دشمن کو بغیر لڑے ہوئے زیر کر لیتا ہے۔ وہ دشمن کے شہروں پر حملہ کیے بغیر قابض ہو جاتا ہے۔ وہ دشمن بادشاہت کو میدان جنگ میں لمبی کارروائیوں کے بغیر تہ و بالا کر دیتا ہے۔ اپنی ''پوری اور سالم تزویر'' کے ذریعے وہ سب کچھ جو آسمان تلے ہے لے کر اپنی سپاہ کو تھکائے بغیر مکمل فتح حاصل کرتا ہے۔ یہ تزویر کے ذریعے حملہ کرنے کا طریقہ ہے۔

نتیجتاً سپاہ کے استعمال کا فن: جب آپ دشمن سے دس ایک کی نسبت سے زیادہ ہوں تو اسے گھیر لیں جب پانچ ایک کی نسبت میں ہوں تو اس پر حملہ کریں جب دو ایک کی نسبت میں ہوں تو اسے تقسیم کریں۔ اور اگر تعداد برابر ہو تو اس کا مقابلہ کریں (ایک دوسرے متن میں ہے ''جب دو اور ایک کی نسبت ہو تو اس کا مقابلہ کریں اور اگر تعداد برابر ہو تو اسے تقسیم کریں) اگر آپ دشمن سے تعداد میں کم ہیں تو پیچھے ہٹ جائیں۔ اگر آپ اس کے مقابلے کے نہیں تو اس سے بچ نکلیں۔ کیونکہ چھوٹی طاقت چاہے کتنی ہی جانفشانی سے لڑے لیکن بالآخر اسے بڑی طاقت سے مغلوب ہونا اور اس کا اسیر ہونا پڑتا ہے۔

سالار ملک کی فصیل ہوتا ہے۔ جنگ میں اس کی مہارت ملک کو مضبوط بنا سکتی ہے اور اس کی نا اہلی اسے کمزور کر سکتی ہے۔

تین طریقے ہیں جن کے ذریعے کوئی بادشاہ اپنی فوج پر تباہی لا سکتا ہے:

پہلا، وہ اپنی فوج کو بغیر سوچے سمجھے آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کا حکم دیتا ہے جبکہ حقیقت میں اسے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا نہیں چاہیے اس طرح وہ فوج کی پہل قدمی میں رکاوٹ بنتا ہے۔

دوسرا، وہ فوج کی انتظامیہ میں مداخلت کرتا ہے جبکہ وہ اس کے اندرونی معاملات سے بے خبر ہوتا ہے یوں افسروں اور سپاہیوں میں ذہنی خلفشار کا باعث بنتا ہے۔

تیسرا، وہ افسروں کی سالاری میں مداخلت کرتا ہے اس اصول سے نابلد ہوتے ہوئے کہ ایک فوج کو مختلف حالات کے مطابق مختلف چالیں چلنی ہوتی ہیں۔ اس سے افسروں اور جوانوں کے دماغ میں بدگمانی پیدا ہوگی۔

جب کوئی فوج پراگندہ ذہن ہو اور بدگمانیوں سے پر ہو تو ہمسایہ ریاستیں اس صورت حال کا فائدہ اٹھائیں گی اور حملہ کر دیں گی۔

اس لیے پیش قیاسی کے لیے کہ کون سی پارٹی جیتے گی پانچ عوامل پر غور کرنا ہوگا۔

i) وہ پارٹی جو جانتی ہے کہ کب لڑنا ہے اور کب نہیں لڑنا، جیتے گی۔

ii) وہ پارٹی جو بڑی فوج اور چھوٹی فوج کی سالاری میں فرق جانتی ہے، جیتے گی۔

iii) وہ پارٹی جس کے افسروں اور جوانوں میں مقصد کی یگانگت ہے، جیتے گی۔

iv) وہ پارٹی جو غیر تیار دشمن فوج پر اپنی تیار فوج کے ساتھ حملہ کرتی ہے، جیتے گی۔

v) وہ پارٹی جس کا سالار قابل ہے اور بادشاہ کی مداخلت سے آزاد ہے، جیتے گی۔

ان نکات کو ذہن نشین کر کے آدمی پیش گوئی کر سکتا ہے کہ جنگ میں کون جیتے گا۔

اس لیے میں کہتا ہوں: اپنے دشمن کو جانو اور اپنے آپ کو جانو اور تم بلا خطر سینکڑوں جنگیں لڑ سکتے ہو۔ اگر تم دشمن سے ناواقف ہو اور صرف اپنے آپ کو جانتے ہو تو تمہاری فتح اور شکست کے امکانات برابر ہوں گے۔ اگر تم نہ دشمن کو اور نہ اپنے آپ کو جانتے ہو تو پھر لازمی طور پر ہر جنگ میں شکست کھاؤ گے۔

چوتھا باب

عسکری ترتیب

ماضی کے ہنر مند سالار پہلے اپنے آپ کو نا قابل تسخیر بناتے تھے۔ پھر دشمن کے لمحہ تسخیر پذیری کا انتظار کرتے تھے۔ نا قابل تسخیری کا انحصار اپنی کوششوں پر ہے جبکہ دشمن پر فتح کا انحصار اس کی غفلت پر ہے۔ نتیجتاً جو جنگ کے ماہر ہیں وہ اپنے آپ کو نا قابل تسخیر بنا سکتے ہیں لیکن وہ دشمن پر فتح پر پُر یقین نہیں ہوتے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ فتح کی پیش بینی کی جا سکتی ہے لیکن بزور حاصل نہیں کی جا سکتی۔

نا قابل تسخیری دفاع میں ہے اور فتح کا امکان حملے میں۔ دفاع کوئی اس وقت کرتا ہے جب اس کی طاقت غیر موزوں ہو۔ جب طاقت وافر ہو تو وہ حملہ کرتا ہے۔ وہ جو دفاع میں ماہر ہے وہ ایسی جگہوں میں اپنی فوجیں رکھتا ہے جو اتنی محفوظ اور اتنی ہی نا قابل رسائی ہوں جیسے زمین کی گہرائیوں میں۔ جبکہ وہ جو حملے میں مشاق ہے ایسے جیسے آسمان کی بلند ترین پہنائیوں سے حملہ کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی حفاظت اور مکمل فتح حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

فتح کی پیش بینی جو عام آدمیوں کی فہم میں ہوتی ہے کمال فوقیت نہیں ہے اور نہ ہی یہ کمال فضیلت ہے۔ جب کسی کے ایک وحشیانہ لڑائی جیتنے پر سب نعرہ تحسین بلند کرتے ہیں یہ خزاں میں جانور کے بالوں کی لچھی اٹھانے کے مترادف ہے جو طاقت کی کوئی نشانی نہیں ہے (خزاں میں جانوروں کے بال بڑے نفیس اور ہلکے ہوتے ہیں) یا سورج اور چاند کو دیکھنے کے قابل ہوا جائے جو بصارت کی دلیل نہیں ہے۔ یا بجلی کی کڑک سننا جو سننے کی صلاحیت کا اشارہ نہیں ہے۔ قدماء جسے ماہر جنگ گردانتے تھے وہ تھا آسانی سے شکست کھانے والے دشمن پر قابو پانے والا۔ ایک ماہر جنگ کی جیتی ہوئی جنگ نہ تو اس کی عقلمندی کے لیے شہرت فراہم کرتی ہے اور نہ ہی اس کی بہادری کے لیے انعام کیونکہ اس نے لازمی طور پر جیتنا ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی چالیں فتح کے یقینی ہونے

پر مبنی ہوتی ہیں۔ وہ ایسے دشمن کو شکست دیتا ہے جو پہلے ہی شکست خوردہ ہو۔ یوں ایک ہنرمند جنگجو اپنے آپ کو ایسی حالت میں رکھتا ہے جس میں اسے شکست نہیں دی جا سکتی اور جو اپنے دشمن کو شکست دینے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔

تو یہ ہے کہ ایک فتح مند فوج اس وقت تک دشمن سے نہیں بھڑے گی جب تک کہ وہ فتح کے لیے لازمی شرائط کا یقین نہ کر لے۔ جبکہ ایسی فوج جس کا مقدر شکست ہے اس امید میں جنگ میں کود پڑتی ہے کہ وہ خوش قسمتی کی بنا پر جیتے گی۔ ہنرمند جنگجو ''قائدے'' کی پاسداری کرتے ہوئے اور قوانین وضوابط کو مضبوط بناتے ہوئے دشمن کے مقابلے میں پہل قدمی حاصل کرتا ہے اور فتح مند ہوتا ہے۔

جنگ کے قوانین میں جن پانچ عناصر کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:

1- جگہ کی پیمائش 2- مقدار کا تخمینہ 3- تعداد کا حساب 4- طاقت کا موازنہ اور 5- فتح کے امکانات کا جائزہ۔ جگہ کے تخمینے سے مراد ہے مخالف پارٹیوں کی زمینوں میں فرق اس سے مقدار کا تخمینہ اخذ ہوتا ہے جو ذرائع میں فرق کا حوالہ دیتا ہے اس سے تعداد کا حساب جو ان کی فوجوں کے حجم میں فرق کا حوالہ دیتا ہے اس سے ان کی فوجوں کی اضافی طاقت کا موازنہ اور آخر میں فتح کے امکانات کے لیے مادی بنیاد کا جائزہ۔

یوں ایک فتح مند فوج کو اس کے دشمن پر مکمل برتری ہوتی ہے۔ بالکل جس طرح 500 غلے کے دانوں کو ایک پر۔ شکست جس کا مقدر ہو اس فوج کے لیے اس سے الٹ سچ ہے طاقت میں تفاوت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایک فتح مند فوج جنگ میں تیز بہاؤ والے دھارے کے زور سے جاتی ہے جسے اچانک چھوڑا جائے تو ہزاروں فیدم گہری کھائی میں گرتا ہے۔ یہ ہے جس سے ہماری مراد عسکری ترتیب ہے۔

پانچواں باب

زورِ حرکت

سن زو نے کہا: بہت سے سپاہیوں اور تھوڑے سپاہیوں کے بندوبست میں کوئی فرق نہیں۔ یہ تنظیم کا مسئلہ ہے کنٹرول کی پرتیں قائم کرنا ہے۔ بڑی فوج اور چھوٹی فوج کی کمان میں کوئی فرق نہیں۔ یہ مواصلات کا مسئلہ ہے۔ کمان کے اشاروں کے کارگر نظام کا قیام ہے۔ قی اور زنگ کی مجموعی چالوں کی بدولت فوج دشمن فوجوں کی یلغار کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ دشمن کے مضبوط پہلوؤں سے بچتے ہوئے اس کے کمزور پہلوؤں پر حملے کرتے ہوئے یہ دشمن پر یوں یورش کرنے کے قابل ہوتا ہے جیسے انڈے کو توڑنے کے لیے پتھری استعمال کی جائے۔

عام طور پر جنگ میں دشمن سے مڈبھیڑ میں زنگ استعمال کرو اور فتح حاصل کرنے کے لیے قی۔ ان کی خوش تدبیری جو قی کے استعمال میں ماہر ہیں اتنی ہی ناقابل اختتام ہے جتنی کہ زمین اور آسمان اور اتنی ہی لامتناہی ہے جتنا کہ دریاؤں کا بہاؤ یہ سورج اور چاند کی طرح ہے جو اپنا سفر ختم کرتے ہیں محض ایک دفعہ پھر شروع کرنے کے لیے۔ چار موسموں کی طرح جو گزر جاتے ہیں صرف پھر آنے کے لیے۔ موسیقی میں پانچ سے زیادہ سُر نہیں ہیں لیکن ان کے جوڑ لاتعداد نغموں کو جنم دیتے ہیں۔ پانچ سے زیادہ بنیادی رنگ نہیں ہیں لیکن جوڑ میں وہ لاتعداد جھلکیں پیدا کرتے ہیں۔ پانچ سے زیادہ ذائقے نہیں ہیں لیکن امتزاج میں لاتعداد متنوعات پیدا کرتے ہیں۔ فوجی چالوں میں صرف دو طرح کا عمل ہے۔ قی اور زنگ اس کے باوجود ان کی گوناگونیاں لامحدود ہیں۔ وہ مسلسل ایک سے دوسرے میں تبدیل ہوتی رہتی ہیں جیسے دائرے میں حرکت کر رہی ہوں نہ ہی کسی آغاز اور نہ ہی اختتام کے ساتھ۔ ان کے امکانات کو کون ختم کر سکتا ہے؟

جب تندی و تیزی سے بہتا ہوا پانی بڑی آب زدہ چٹانوں کو اکھاڑتا ہے تو یہ اس کے زورِ حرکت کی بنا پر ہے۔ جب عقاب اپنے شکار سے ٹکراتے اور اسے تباہ کرتے ہیں تو یہ درست تعین رفتار و وقوع کی بنا پر ہے۔ یوں حملے کا آغاز کرتے ہوئے ایک اچھا کماندار ایک اچھی ترتیب و تخلیق

کرتا ہے جو اسے نا قابل مزاحمت زور حرکت فراہم کرتی ہے اور جب وہ حملہ کرتا ہے تو یہ برق رفتاری سے ہوتا ہے۔ زور حرکت پوری کھنچی ہوئی کمان کی طرح ہے اور رفتار کمان سے نکلتے ہوئے تیر کی طرح۔

لہراتے ہوئے علموں تلے جنگ میں جتے ہوئے آدمیوں اور گھوڑوں کی افراتفری کے درمیان کمان میں کوئی بدنظمی نہیں ہونی چاہیے۔ سپاہی ادھر ادھر دائروں کی شکل میں متحرک نظر آتے ہوں لیکن ان کی صف آرائی اس طرح ہونی چاہیے جو شکست کے خلاف ضمانت ہو۔ بناوٹی طور پر بدنظمی کا روپ دھارنے کے لیے بڑی سخت تنظیم ہونی چاہیے خوف کے بہروپ کے لیے عظیم جرات ہونی چاہیے۔ کمزوری کا تاثر دینا ہو تو طاقت ہونی چاہیے۔ نظم تنظیم سے آتا ہے حوصلہ زور رفتار سے اور طاقت عسکری ترتیب سے۔

اس لیے جو دشمن کو حرکت میں رکھنے کے ماہر ہیں اسے دھوکے والے دکھلاوں سے حیران کر دیتے ہیں جن کے مطابق وہ ردعمل کرتا ہے۔ وہ ایسی طمع سے دشمن کو لبھاتے ہیں جنہیں وہ یقینی طور پر لیتا ہے۔ ایسا کرنے سے وہ دشمن کو حرکت میں رکھتے ہیں اور درست لمحے پر اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔

اس لیے جو جنگ کو رخ دینے میں ماہر ہوتا ہے وہ حالت جنگ کو اپنے فائدے میں بدلنے کی کوشش کرتا ہے نہ کہ اپنے ماتحتوں سے ضرورت سے زیادہ کا تقاضا کرے۔

وہ جو حالت جنگ کو اپنے مفاد میں بدلنے کا ماہر ہے اپنے آدمیوں کو جنگ میں بھیج سکتا ہے جیسے وہ لکڑی کے کندوں یا چٹانوں کو لڑھکا رہا ہو۔ لکڑی کے کندے اور چٹانیں جب سطح زمین پر ہوں تو بے حرکت رہتے ہیں لیکن جب سیدھی ڈھلوان پر ہوں آگے کی طرف لڑھک جاتے ہیں وہ جو چوکور ہوتے ہیں حرکت میں نہیں آتے۔ جو گول ہوتے ہیں وہ تیزی سے لڑھکتے ہیں۔ اس لیے جنگ میں تزویراتی فوقیت سے کمان کی جانے والی سپاہ کا موازنہ گول آب زدہ چٹانوں کے زور رفتار سے کیا جا سکتا ہے جو پہاڑ کی بلندی سے نیچے لڑھک رہے ہوں۔

قی اور زنگ فوجی اصطلاحات کے طور پر قدیم چین میں مستعمل تھے۔ یہ متخالفات کا جوڑا ہے۔ عام طور پر قی سے مراد ہے غیر معمولی اور غیر متوقع طریقے۔ اچانک غیر متوقع حملے۔ فوجی کارروائیوں میں میمنہ اور میسرہ کی حرکتیں۔ جبکہ زنگ سے مراد ہے عام اور باقاعدہ طریقے۔ سامنے سے حملے اور فوجی عمل میں دفاعی کارروائیاں۔

چھٹا باب

کمزوریاں اور طاقتیں

(XU)زو اور (SHI) شی

عام طور پر وہ جو میدان جنگ پر پہلے قابض ہوتا ہے اور اپنے دشمن کا انتظار کرتا ہے آرام کر چکا اور تیار ہوتا ہے۔ اور وہ جو منظر پر دیر سے آتا ہے اور جلدی سے جنگ میں جت جاتا ہے تھکا ہوا اور سست ہوتا ہے۔ اس لیے وہ جو جنگ میں ماہر ہوتے ہیں خود کو دشمن سے ہلوانے کے بجائے دشمن کو ہلاتے ہیں۔

وہ جو دشمن کو اس کی مرضی سے مخصوص کی گئی جگہ پر لانے کے اہل ہوتے ہیں وہ اسے کوئی فائدہ پیش کر کے ایسا کرتے ہیں۔ اور وہ جو اسے آنے سے روکنے کے قابل ہوتے ہیں اس کے لیے رکاوٹیں پیدا کر کے اور اسے نقصان پہنچا کر ایسا کرتے ہیں۔ لہٰذا جب دشمن نے آرام کیا ہوا ہو تو اسے تھکاؤ' جب اچھی طرح کھائے پیئے ہو تو اسے بھوکا مارو اور جب وہ قیام کرے تو اسے حرکت پر مجبور کر دو۔ یہ سب اس لیے ممکن ہے کہ آپ ایسی جگہوں پر ظاہر ہوتے ہیں جنہیں دشمن بچانے کے لیے نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی آپ سے توقع رکھتا ہے۔ اپنے آپ کو تھکائے بغیر آپ ایک ہزار لی مارچ کر سکتے ہیں اس لیے کہ آپ کو روکنے کے لیے وہاں دشمن نہیں ہے۔ جس پر آپ حملہ آور ہوتے ہیں اس پر قابض ہونا یقینی ہوتا ہے اس لیے کہ آپ ایسی جگہ حملہ کرتے ہیں کہ دشمن اس

نوٹ: زو(XU) اور Shi قدیم چین میں استعمال ہونے والی فوجی اصطلاحیں ہیں یہ متخالفات کا جوڑا ہے (زو)XU سے مراد کمزوری بکھراؤ اور عددی کمتری ہے جبکہ شی سے مراد قوت' ارتکاز اور عددی برتری ہے فوجی چالوں میں زو اور شی کے اکٹھے استعمال سے مراد ہے دکھاوے اور دھوکے والی چالیں جن سے دشمن پر غلبہ پانے کے لیے اسے گمراہ کیا جا سکے۔

کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ جس کا آپ دفاع کرتے ہیں اسے قبضے میں رکھنا یقینی ہے اس لیے کہ آپ ایسی جگہ کا دفاع کرتے ہیں کہ دشمن اسے نا قابل تسخیر پاتا ہے۔

اس لیے حملے کے ماہر کے خلاف دشمن کو سمجھ نہیں آتی کہ وہ کہاں دفاع کرے اور دفاع کے ماہر کے خلاف دشمن کو سمجھ نہیں آتی کہ کہاں حملہ کرے۔ ماہر اتنا عیار ہوتا ہے کہ وہ کوئی نشان نہیں چھوڑتا اتنا پراسرار ہوتا ہے کہ وہ کوئی آواز نہیں پیدا کرتا۔ یوں وہ اپنے دشمن کی قسمت کا ثالث بن جاتا ہے۔ اس کی پیش قدمی نا قابل مزاحمت ہوتی ہے اس لیے کہ وہ دشمن کی کمزور جگہوں پر چھلانگ لگاتا ہے اور اس کے پیچھے ہٹنے کو روکا نہیں جا سکتا اس لیے کہ وہ اتنا تیز رفتار ہے یوں جب ہم لڑائی کرنا چاہتے ہیں تو دشمن چاہے وہ اونچی دیواروں اور گہری خندقوں کے پیچھے محفوظ ہو اپنی جگہ چھوڑ کے ہمارے ساتھ لڑنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ہم ایسی جگہ پر حملہ کرتے ہیں جس کا بچانا اس کے لیے ضروری ہو۔ جب ہم لڑائی سے بچنا چاہتے ہیں تو ہم اپنے دفاع کے لیے زمین پر صرف ایک لکیر کھینچ سکتے ہیں اور دشمن ہمارے ساتھ لڑائی شروع نہیں کر سکتا اس لیے کہ ہم نے اس کی توجہ ایک مختلف نشانے کی طرف مبذول کروادی ہے۔

لہٰذا اگر ہم دشمن کی عسکری ترتیب متعین کرنے کے قابل ہیں جبکہ اپنی چھپانے کے تو پھر ہم اپنی سپاہ مرتکز کر سکتے ہیں جبکہ اس کی بکھری ہوئی ہوں گی۔ اور اگر ہماری فوجیں ایک جگہ پر مرتکز ہیں جبکہ اس کی دس جگہوں پر بٹی ہوئی ہیں تو پھر دس نسبت ایک کے ہوگا جب ہم ایک جگہ پر حملہ کریں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم عددی طور پر برتر ہوں گے۔ اگر ہم ایک منتخب جگہ پر بہت سوں سے تھوڑے لوگوں پر حملہ کرنے کے قابل ہیں تو وہ جن سے ہم نبرد آزما ہوں گے ان کی تعداد بہت کم ہو جائے گی۔ دشمن کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ ہم اسے لڑائی دینا چاہتے ہیں کیونکہ اگر اسے پتہ نہ ہو کہ ہم کہاں لڑنا چاہتے ہیں تو اسے بہت سی جگہوں پر تیاری کرنی ہوگی اور جب وہ یہ کرے گا تو پھر وہ جن سے ہمیں ایک جگہ پر لڑنا ہوگا تعداد میں تھوڑے ہوں گے۔ یوں اگر دشمن اگلے حصے کو تقویت پہنچاتے ہوئے تیاری کرتا ہے تو اس کا پچھلا حصہ کمزور پڑ جائے گا اور اگر وہ پچھلے حصے کو مضبوط کر کے تیاری کرتا ہے تو اس کا اگلا حصہ کمزور ہو جائے گا اور اگر اس کا دایاں تو بایاں کمزور ہو جائے گا۔ ہر جگہ تیار

ہونا ہر جگہ کمزور ہونا ہے۔ وہ جسے دشمن کے خلاف ہر جگہ تیار ہونا پڑے لازمی طور پر کمزور ہوگا۔ وہ جو دشمن کو اپنے خلاف ہر جگہ تیار ہونے پر مجبور کرے گا لازمی طور پر مضبوط ہوگا۔

اس لیے اگر کسی کو پتہ ہو کہ کب اور کہاں ایک لڑائی ہوگی تو پھر اس کی فوج دشمن سے لڑنے کے لیے ایک ہزار لی مارچ کر سکے گی۔ لیکن اگر کسی کو نہ ہی میدان جنگ کا پتہ ہو اور نہ ہی لڑائی کی تاریخ کا تو اس کا بایاں بازو اس کے دائیں بازو کو نہ بچا سکے گا اور نہ ہی دایاں بائیں کو۔ اسی طرح اس کا ہراول اس کے عقب کو بچا سکے گا اور نہ ہی عقب ہراول کو۔ یہ اور بھی کتنا زیادہ ہوگا اگر اس کی کمک بہت سے لی دور ہو جو قریب ترین ہو وہ بھی کئی لی کے فاصلے پر ہو۔ میرے خیال میں جبکہ یور کی فوج (ایک ہمسایہ ریاست یور) متعدد ہو تو صرف تعداد ہی جنگ کا نتیجہ متعین نہیں کرتی۔ اس لیے میں کہتا ہوں فتح تخلیق کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر دشمن عددی طور پر زیادہ مضبوط ہے۔ پھر بھی ہم اسے کمزور بنا سکتے ہیں۔

آدمی کو دشمن کے منصوبے کا تجزیہ کرنا چاہیے تا کہ اس کے مضبوط اور کمزور پہلوؤں کی واضح تفہیم ہو سکے۔ دشمن کو عمل پر اکساؤ تا کہ اس کی حرکت کے انداز کا پتہ چلے۔ اسے لبھا کے کھلے میدان میں لاؤ تا کہ اس کی عسکری ترتیب میں زد پذیر مقاموں کا پتہ چلے۔ ایسے کھوج لگاؤ کہ پتہ چلے اس کی طاقت کہاں زیادہ ہے اور کہاں کم ہے۔ عسکری ترتیب میں آخری بات یہ ہے کہ کوئی نشان نہ چھوڑو جس سے پتہ چلے کہ تمہاری فوج کی ترتیب کیا ہے۔ اس طریقے سے چالاک ترین جاسوس بھی پتہ نہیں چلا سکتے اور نہ ہی بہترین دماغ ہمارے خلاف منصوبہ بندی میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

چاہے ہم لوگوں کو وہ لچکدار چالیں دکھا بھی دیں جو ہم نے دشمن کی بدلتی ہوئی حالت کی مطابقت میں اس پر فتح حاصل کرنے کے لیے استعمال کی تھیں وہ پھر بھی انہیں سمجھ نہیں سکتے۔ دشمن وہ چالیں جان سکتا ہے جن سے ہم فتح حاصل کرتے ہیں لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ ہم ان چالوں کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ ہر فتح کے بعد ہم ان چالوں کو استعمال نہیں کرتے۔ ہم انہیں بدلتے ہوئے حالات سے موافقت کے لیے مسلسل بدلتے ہیں۔

اب فوجی کارروائیوں پر لاگو ہونے والا قانون اسی طرح ہے جس طرح کہ بہتے ہوئے پانی پر لاگو ہونے والا جو ہمیشہ اونچی جگہوں سے گریز کرتا ہے ان کی بجائے نیچی جگہیں چنتا ہے فوج کو کامیابی سے استعمال کرنے کے لیے ہمیں دشمن کے مضبوط پہلوؤں سے بچنا چاہیے اور اس کے کمزور پہلو تلاش کرنے چاہئیں۔ جسطرح پانی اپنا راستہ زمین کے خدوخال کے مطابق بدلتا ہے اسی طرح ایک جنگجو اپنی چالیں اپنے دشمن کی بدلتی ہوئی حالتوں کی مطابقت میں بدلتا ہے۔ جنگ میں کوئی غیر مبدل چال نہیں ہوتی جس طرح پانی کے بہاؤ میں کوئی مستقل راستہ نہیں ہوتا۔ وہ جو فتح مند ہوتا ہے اپنی چالوں کو دشمن کی بدلتی ہوئی حالت کے مطابق بدلتا ہے اور اس سے معجزے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

فطرت کے پانچ عناصر (ووکسنگ) میں سے کوئی بھی ہمیشہ غالب نہیں رہتا اور چار موسموں میں سے کوئی بھی ہمیشہ نہیں رہتا۔ کچھ دن لمبے اور کچھ چھوٹے ہوتے ہیں۔ چاند گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

ووکسنگ: فطرت کے پانچ عناصر کی اصطلاح پہلے پہل ینگ یانگ مکتبہ فکر کے فلسفیوں نے کائنات کی خصوصیت بیان کرنے کے لیے استعمال کی۔ یہ ہیں دھات، لکڑی، پانی، آگ اور زمین۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں تصور ہے کہ کسی دوسرے پر ذرا دیر حاوی ہوتا ہے لیکن صرف مغلوب ہونے کے لیے۔

ساتواں باب

پہل قدمی حاصل کرنے کے لیے مبارزت

سن زو نے کہا: عام طور پر جنگ میں کماندار بادشاہ سے حکم موصول کرتا ہے۔ اپنی فوج کو جمع کرنے کے عمل میں، آبادی کو متحرک کرتے ہوئے دشمن کے خلاف صف بندی کرتا ہے۔ جنگ میں پہل قدمی حاصل کرنے کے لیے فوج کی تدبیراتی نقل و حرکت سے زیادہ مشکل کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں جو ضروری ہے وہ ہے پیچیدہ کو سادہ بنانا۔ اور عدم موافقت کو فائدے میں بدلنا۔ آپ دشمن کا راستہ اسے آسان حاصلات کی ترغیبات سے لبھا کر پیچیدہ بنا دیتے ہیں اور نتیجتاً آپ اس کے بعد روانہ ہو کے بھی متنازع میدان جنگ پر اس سے پہلے پہنچتے ہیں۔ ایسا کرنے کے قابل ہونے کا مطلب ہے کہ آپ پیچیدہ کو سادہ بنانے کا طریقہ سمجھ گئے ہیں۔

فوج کی تدبیراتی نقل و حرکت فائدے اور تباہی دونوں کا منبع ہو سکتی ہے۔ اگر آپ فوج کو اس کے تمام ساز و سامان اور سامان خورد و نوش کے ساتھ کسی فائدے کے لیے مبارزت میں جھونک دیتے ہیں تو آپ وقت پر نہیں پہنچیں گے۔ اگر آپ انہیں چھوڑ دیں تو آپ کا ساز و سامان اور سامان خورد و نوش کھو جائے گا۔ اس وجہ سے اگر کوئی فوج اپنے دفاعی آلات (زرہ بکتر) دور کہیں ذخیرہ کر دیتی ہے اور جلدی میں روانہ ہو جاتی ہے، دنوں اور راتوں کو نہ رکتے ہوئے دوگنی رفتار سے 100 لی تک فائدہ حاصل کرنے کے لیے مارچ کرتی ہے تو پھر اس کے کچھ جرنیل دشمن سے پکڑے جائیں گے۔ اس کے مضبوط ترین آدمی وہاں پہلے پہنچ سکتے ہیں لیکن تھکے ماندے پیچھے رہ جائیں گے اور ایسی صورت میں صرف فوج کا دسواں حصہ منزل پر پہنچے گا۔

پچاس لی کی جبری مارچ میں کسی فائدے کے لیے لڑائی میں آگے والے دستے کا کماندار شکست کھا سکتا ہے اور اصول کے مطابق صرف آدھی فوج اپنی منزل پر پہنچے گی۔ لیکن اگر تیس لی سفر کرے تو اس رفتار پر کسی فائدے کے لیے لڑائی کے نتیجے میں دو تہائی فوج اپنی منزل پر پہنچے گی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایسی فوج جو اپنے ساز وسامان کھانے اور چارے اور مادی محفوظات کے بغیر ہے وہ تباہ ہو جائے گی۔

اس لیے جب تک آپ ہمسایہ ملکوں کے حاکموں کے تزویراتی ارادوں سے باخبر نہ ہوں اس وقت تک آپ ان سے اتحادوں میں شامل نہیں ہو سکتے۔ جب تک آپ زمین کی وضع (بناوٹ) سے واقف نہ ہوں۔ اس کے پہاڑوں اور جنگلوں اس کے فطری خطرات کے امکانات اس کے دریاؤں اور دلدلوں سے واقف نہ ہوں آپ اس پر اپنی فوج کو تدبیراتی نقل وحرکت نہیں کرا سکتے جب تک آپ مقامی راستہ دکھانے والوں سے کام نہ لیں اس وقت تک آپ زمین کو اپنے فائدے کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔

جنگ دھوکے کا کھیل ہے۔ اس وقت حرکت کرو جب یہ فائدہ مند ہو۔ فوجی حالت میں اپنی فوج کے لیے فائدہ مند تبدیلیاں لانے کے لیے ضرورت کے مطابق بکھر جاؤ اور مرتکز ہو جاؤ۔ جب فوج آگے بڑھتی ہے تو اتنی تیز ہوتی ہے جتنی کہ آندھی۔ جو وہ بے حرکت ہوتی ہے تو ایسی ساکن جیسے جنگل۔ جب وہ حملہ کرتی ہے تو اتنی تباہ کن جتنی کہ آگ۔ جب وہ دفاع کرتی ہے تو اتنی حرکت ناپذیر ہوتی ہے جتنا کہ پہاڑ' جب وہ اپنے آپ کو چھپاتی ہے تو ایسے جیسے کہ بادلوں سے ڈھکے ہوئے آسمان کے پیچھے۔ اور جب یہ وار کرتی ہے تو اتنا اچانک جس طرح کہ بادل کی کڑک۔ دیہات کو لوٹتے ہوئے اپنی فوج کو تقسیم کر دو جب اپنی قلمرو بڑھاؤ تو کلیدی جگہیں گرفت میں رکھنے کے لیے اسے تقسیم کرو۔ کسی عسکری عمل میں جانے سے پہلے اچھی طرح نفع نقصان جانچ لو۔ وہ جو ٹیڑھے کو سیدھا کرنے کی چالوں کا ماہر ہے فتح یاب ہوگا۔ یہ مسلح رزم کی روح ہے۔

فوجی نظامت کی کتاب میں ہے" کیونکہ جنگ کے غوغے میں زبانی احکامات سنے نہیں جا سکتے اس لیے ڈرم اور گھنٹیاں استعمال کی جاتی ہیں اور چونکہ سگنل احکامات جنگ میں دیکھے نہیں جا سکتے اس لیے جھنڈے اور علم استعمال کیا جاتے ہیں۔" ڈھول گھنٹیاں جھنڈے اور علم سپاہیوں کے سننے اور دیکھنے کو مربوط کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں تاکہ وہ ایک ہو کر عمل کریں تاکہ بہادروں کو اکیلے آگے نہ بڑھنا پڑے اور نہ ہی بزدل اپنے آپ پیچھے ہٹیں۔ یہ سپاہیوں کی بڑی تعداد کو حکم دینے کا فن ہے۔ اسی لیے رات کی لڑائیوں میں مشعلیں اور ڈھول وسیع طور پر استعمال ہوتے ہیں اور دن کی لڑائیوں میں جھنڈے اور علم۔ ان سگنلوں کا ادل بدل استعمال سپاہیوں کو

معلومات فراہم کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

ایک پوری فوج کا حوصلہ پست کیا جا سکتا ہے اور اس کے جرنیل کو حاضر دماغی سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ کسی مہم کی ابتداء میں فوجیوں کا حوصلہ بلند ہوتا ہے کچھ دیر کے بعد پست ہونے لگتا ہے اور بالآخر جاتا رہتا ہے۔ اس لیے وہ جو جنگ میں ماہر ہے اس وقت دشمن سے گریز کرتا ہے جب اس کا جذبہ بلند ہوتا ہے اور اس وقت حملہ کرتا ہے جب اس کا جذبہ ماند پڑ جاتا ہے۔ اس طرح وہ حوصلے کے مسئلے سے عہدہ براہوتا ہے۔ اچھے نظم (ترتیب) میں وہ ایک بے ترتیب فوج کا منتظر ہوتا ہے۔ خاموشی سے میں وہ ایک شوروغوغے والی فوج کا انتظار کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ پر قابو سے نپٹتا ہے۔ میدان جنگ کے قریب ہونے کی بنا پر وہ دور سے آنے والے دشمن کا انتظار کرتا ہے۔ پوری طرح آرام کیے ہوئے وہ تھکے ہوئے دشمن کا منتظر ہوتا ہے۔ اچھی طرح شکم سیر فوجوں کے ساتھ وہ بھوکے فوجیوں کا منتظر ہوتا ہے۔ اس طرح وہ طاقت کے مسئلے سے نپٹتا ہے۔ وہ ایسے دشمن کو راستے میں نہیں روکتا جس کے جھنڈے مکمل ترتیب میں ہوں۔ اور ایک طاقتور فوج جو پوری تیاری میں ہو اس پر حملہ نہیں کرتا۔ اس طرح وہ بدلتے ہوئے حالات سے نپٹتا ہے۔

اس لیے جب جنگ لڑ رہے ہو تو پہاڑ کی بلندی کی طرف ایسے دشمن کے خلاف جو اونچی جگہ پر قابض ہو حملہ نہ کرو۔ اس دشمن سے نہ لڑو جس کی کمر پہاڑ کی طرف ہو اس دشمن کا پیچھا نہ کرو جو شکست کا دھوکہ دیتا ہے اس کے اعلیٰ فوجیوں پر حملہ نہ کرو' جو دشمن گھر واپس جا رہا ہو اسے راستہ میں نہ روکو۔ دشمن کو گھیرے میں لیتے ہوئے اس کے بچ نکلنے کے لیے ایک راستہ چھوڑ دو۔ کونے میں پھنسے ہوئے دشمن پر دباؤ نہ ڈالو۔ یہ فوجیوں کو استعمال کرنے کا فن ہے۔

آٹھواں باب

چالوں کی رنگارنگی

سن زو نے کہا: عام طور پر جنگ میں کماندار بادشاہ سے فرمانِ اختیار لیتا ہے۔ اپنے فوجی اکٹھے کرتا ہے اور آبادی کو جنگ کے لیے متحرک کرتا ہے۔ روانہ ہونے کے بعد اُسے مشکل جگہوں پر کیمپ نہیں لگانا چاہیے۔ اسے ہمسایہ ریاستوں سے وہاں مدد لینی چاہیے جہاں سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوں۔ اسے تنہا جگہوں میں زیادہ ٹھہرنا نہ چاہیے۔ شب خون کی زد پذیری والی جگہوں سے گزرتے ہوئے اسے غیر یقینی حالات کے لیے منصوبہ سازی کرنی چاہیے۔ جہاں کوئی دوسرا راستہ نہ ہو وہاں دشمن سے نبرد آزما ہونا چاہیے۔ ایسی سڑکیں ہیں جن پر اسے نہ جانا چاہیے فوجیں ہیں جن پر اسے حملہ نہ کرنا چاہیے۔ فصیلی شہر ہیں جن پر اسے حملہ نہ کرنا چاہیے ایسی زمینیں ہیں جن کے لیے اسے نہ لڑنا چاہیے اور بادشاہ کے احکامات ہیں جنہیں اسے نہ ماننا چاہیے۔

یوں وہ کماندار جو چالوں کی رنگارنگی سے پوری طرح واقف ہے جانتا ہے کہ اس نے اپنی سپاہ کس طرح استعمال کرنی ہے جبکہ وہ جو واقف نہیں ہے چاہے وہ زمین کے خدوخال سے واقف ہو اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال نہیں کر سکے گا۔ ایسا کماندار جو چالوں کی رنگارنگی کا فن نہیں جانتا وہ اپنی فوج کا بہتر استعمال نہیں کر سکے گا چاہے وہ پانچ فائدے جانتا ہو۔

اس وجہ سے عقلمند کماندار یا جرنیل اپنے غور وفکر میں دونوں عوامل کو جو حق میں ہیں اور جو حق میں نہیں ہیں نظر میں رکھتا ہے۔ جب اسے مشکلات کا سامنا ہو تو ان عوامل پر غور کرتے ہوئے جو حق میں ہیں وہ عظیم کارنامے سرانجام دے سکے گا۔ جب ہر کام آسانی سے ہو رہا ہو تو وہ ان عوامل کے بارے میں سوچتے ہوئے جو حق میں نہیں ہیں وہ امکانی تباہی سے بچ سکے گا۔

ہمسایہ ریاستوں کو محکوم بنانے کے لیے انہیں وہاں مارو جہاں انہیں تکلیف ہو۔ انہیں مصروف رکھنے کے لیے ان کے لیے مشکلات پیدا کرواور انہیں ادھر ادھر بھگانے کے لیے انہیں

ظاہری فائدے سے للچاؤ۔

لہٰذا جنگ کا ایک قانون ہے کہ دشمن کے نہ آنے پر انحصار نہ کرو بلکہ ہمیشہ اس کے لیے تیار رہو۔ اور یہ کہ دشمن کے حملہ نہ کرنے پر انحصار نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو اتنا مضبوط بناؤ کہ نا قابل تسخیر ہو جاؤ۔

کماندار کے کردار کی پانچ کمزوریاں ہیں۔ اگر وہ سخت گیر اور بے دھڑک ہے تو اسے دھوکہ دیا جا سکتا ہے اور وہ مارا جا سکتا ہے۔ اگر وہ دوسری کسی چیز کے مقابلے میں موت سے زیادہ ڈرتا ہے تو اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ گرم مزاج ہے تو اسے انگیخت کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ دیانتدار ہے اور بہت نفیس احساس احترام رکھتا ہے تو وہ توہین پذیر ہے۔ اگر وہ اپنے لوگوں کے لیے بہت زیادہ ہمدرد ہے تو اسے آسانی سے تکلیف دی جا سکتی ہے اور پریشان کیا جا سکتا ہے۔ یہ پانچ خصلتیں کسی کماندار کے لیے سنجیدہ خامیاں ہیں اور جنگ کے عمل میں آفت آفریں ثابت ہو سکتی ہیں۔ فوج کی تباہی اور اس کے کماندار کی موت بلا استثنا ان کمزوریوں کے نتائج ہیں جن سے کسی صورت صرف نظر نہ کرنا چاہیے۔

نواں باب

فوجیوں کی صف آرائی

سن زو نے کہا: عام طور پر اپنے فوجیوں کو متعین کرنے اور دشمن کا جائزہ لینے میں آپ کو ان باتوں پر توجہ دینی چاہیے۔

جب پہاڑوں سے گزر رہے ہو تو وادیوں کے قریب رہو اور اونچی زمین پر سورج کے سامنے کیمپ لگاؤ اگر دشمن بلند زمین پر ہے تو پہاڑی کی بلندی کی طرف لڑائی سے گریز کرو۔ اتنا کچھ جب پہاڑوں میں ہو تو فوج کی تعیناتی کے بارے میں۔

دریا پار کرنے کے بعد حرکت کر کے اس سے دور ہو جاؤ۔ جب آگے بڑھتا ہوا دشمن دریا پار کر رہا ہو تو اس سے دریا میں مڈبھیڑ نہ کرو۔ آپ کے فائدے میں ہے کہ انتظار کریں تا آنکہ وہ آدھا پار کر لے پھر حملہ کرو۔ اگر تم فیصلہ کن لڑائی کے لیے تیار ہو تو پھر اپنی سپاہ کو اپنے دشمن کا سامنا کرنے کے لیے پانی کے نزدیک نہ متعین کرو۔ جب ایسے علاقے میں کیمپ لگاؤ تو بلند زمین پر سورج کے سامنے۔ ایسی جگہ نہیں جو دشمن سے پانی کے بہاؤ کی طرف ہو۔ اتنا کچھ دریا کے نزدیک فوج کو متعین کرنے کے بارے میں۔

جب نمکینی دلدلیں پار کر رہے ہو تو ان میں سے جلدی جلدی بغیر دیر کیے گزرو۔ اگر دشمن سے آپ کا سامنا دلدلی میدان کے عین وسط میں ہو جائے تو پھر آپ کو جھاڑیوں اور پانی کے قریب صف آراء ہونا چاہیے جہاں درخت آپ کے پیچھے ہوں۔ اتنا کچھ دلدلی علاقے میں فوج کی صف آرائی کے بارے میں۔

ہموار زمین پر کھلی زمین پر صف آرائی کرو ایسے کہ آپ کے بنیادی بازو کے پیچھے اونچی جگہ ہو۔ یوں خطرناک جگہ آپ کے سامنے ہوگی اور محفوظ زمین آپ کے پیچھے۔ اتنا کچھ فوج کے ہموار زمین پر صف آرائی کے بارے میں۔

چار مختلف حالتوں میں ان چار فائدہ مند صف آرائیوں کی بنا پر ہی زردشہنشاہ اپنے چار مخالفوں کو شکست دینے کے قابل ہوا۔

عام بات ہے کہ تدبیراتی نقل وحرکت والی فوج بلند خشک زمین کو نیچی گیلی زمین پر ترجیح دیتی ہے۔ یہ دھوپ والی طرف چھین لیتی ہے اور سائے والی طرف سے احتراز کرتی ہے تاکہ خوراک اور پانی فوری مہیا ہو اور وافر مقدار میں ملتا رہے آدمی اور گھوڑے آرام کرسکیں اور اپنی قوت بحال کرسکیں اور بیماریوں سے آزاد رہیں۔ یہ حالات فتح کو یقینی بنائیں گے۔

جب پہاڑیوں، پشتوں اور خندقوں کا سامنا ہو تو فوج کو دھوپ والی طرف متعین کرنا چاہیے جبکہ بنیادی بازو کے پیچھے ڈھلان ہو۔ یہ اقدامات فائدہ مند ہیں کیونکہ یہ جو بھی زمینی خدوخال مہیا ہیں انہیں استعمال کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

جب پانی کے بہاؤ کے مخالف اوپر والے حصے پر بارش ہو رہی ہو اور تیز وتند (جھاگ والے) پانی نیچے کی طرف بہہ رہے ہوں تو فوری پار کرنے کی کوشش نہ کرو۔ پانی کے تھمنے کا انتظار کرو۔

جب آپ کو دریائی ڈھلوانی گھاٹیوں گہری سرنگوں، صندوقی جوفوں نیچے اگی الجھی ہوئی جھاڑیوں، فریب دہ دلدلوں یا خطرناک دراڑوں کا سامنا ہو تو تیزی سے وہاں سے گزر جاؤ۔ اگر ممکن ہو تو ان تک نہ پہنچو۔ جبکہ خود ان سے دور رہو کوشش کرو کہ دشمن ان کے قریب جائے۔ جبکہ تم ان کے سامنے ہو دشمن کی پشت ان کی طرف ہونے دو۔ اگر فوج عمودی تنگ وادیوں، دلدلوں، سرکنڈوں اور نرسلوں، جنگل والی پہاڑیوں اور گھنی زیرشجری جھاڑیوں کے پار گزر رہی ہو تو حفاظت پر مستعد ہو جاؤ۔ ان جگہوں کی اچھی طرح تلاشی لینی چاہیے کیونکہ یہ وہ جگہیں ہیں جہاں گھاتیں لگائی جاتی ہیں اور جاسوس چھپتے ہیں۔

اگر دشمن بہت قریب ہے اور پھر بھی خاموش ہے تو وہ اپنے محل وقوع کی قدرتی مضبوطی پر انحصار کر رہا ہے۔ اگر وہ دور ہے اور پھر بھی آپ کو انگیخت کر رہا ہے تو وہ آپ کو آگے بڑھنے کے لیے لبھا رہا ہے۔ اگر وہ ہموار زمین پر صف بندی کرتا ہے تو یہ اس لیے کہ اسے کچھ فائدہ ہے۔

اگر درختوں میں کوئی حرکت ہے تو یہ دشمن ہے جو چوری چوری آ رہا ہے۔ اگر جھاڑیوں میں بہت سی رکاوٹیں ہیں تو وہ آپ کو متذبذب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر پرندے اڑنے لگتے ہیں

تو وہاں گھات ہوگی۔ اگر جانور ڈر کر بھاگ رہے ہیں تو دشمن اچانک حملہ کرنے جا رہا ہے۔ اگر گرد اوپر اٹھ رہی ہے تو اس کے رتھ آ رہے ہیں۔ اگر گرد زمین پر نیچے نیچے پھیل رہی ہے تو اس کے پیادہ سپاہی آ رہے ہیں۔ اگر گرد مختلف سمتوں میں اڑ رہی ہے تو اس کے دستے آگ کے لیے لکڑیاں ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر گرد کے کچھ بادل آتے اور جاتے ہیں تو اس کا کیمپ بن رہا ہے۔

اگر اس کے سفارت کار عاجز سنائی دیتے ہیں اور اس کے باوجود وہ جنگ کے لیے اپنی تیاری بڑھاتا ہے تو اس کا آگے بڑھنے کا منصوبہ ہے۔ اگر ان کی زبان جھگڑے والی ہے اور وہ جارح انداز دکھاتے ہیں تو وہ پیچھے ہٹنے کا منصوبہ رکھتا ہے۔ اگر اس کی ہلکی رتھیں پہلے باہر نکلتی ہیں اور بازوؤں پر صف آراء ہوتی ہیں تو وہ صف بندی کر رہا ہے۔ اگر اس نے کوئی رکاوٹ نہیں جھیلی اور اس کے باوجود وہ امن کی خواہش کرتا ہے اس کا مطلب ہے کہ اس کا کوئی خفیہ منصوبہ ہے۔ اگر اس کے فوجی تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور اس کی رتھیں صف آراء ہیں تو وہ ایک فیصلہ کن لڑائی کی پیش بینی کرتا ہے۔ اگر اس کے کچھ سپاہی آگے بڑھتے ہیں اور کچھ پیچھے ہٹتے ہیں تو وہ آپ کو آگے بڑھنے کے لیے لبھا رہا ہے۔ اگر اس کے سپاہی اپنے ہتھیاروں پر جھکے ہوئے ہیں تو وہ بھوکے ہیں اگر وہ جنہیں پانی لینے بھیجا گیا ہے پہلے خود پیتے ہیں تو وہ پیاسے ہیں۔ اگر کوئی فائدہ حاصل ہونے والا ہے اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھتے تو وہ تھکے ہوئے ہیں۔

جہاں دشمن کے کیمپ پر پرندے اکٹھے ہوں یہ خالی ہوگا۔ جہاں رات کے وقت اونچی آوازیں ہوں تو دشمن خوفزدہ ہے۔ جہاں صفوں میں ہلچل ہو تو دشمن کے سپاہی بدنظمی کا شکار ہیں۔ جہاں اس کے آفیسر آسانی سے غصے میں آتے ہیں تو دشمن تھکا ہوا ہے۔ جہاں دشمن اپنے گھوڑوں کو غلہ اور آدمیوں کو گوشت کھلاتا ہو اور اس کے آدمی پکانے والے برتن پرے رکھ دیتے ہیں اور کیمپ میں واپس آنے کا ارادہ ظاہر نہیں کرتے تو دشمن بے دھڑک ہے اور بزور صف شکنی کے لیے تیار ہے۔ جہاں دشمن کماندار اپنے ماتحتوں سے عاجزانہ اور رکتی ہوئی آواز میں بات کرتا ہے۔ وہ ان کا اعتماد کھو بیٹھا ہے۔ جہاں وہ بہت سے انعامات تقسیم کرتا ہے تو وہ شدید مشکل میں ہے جب کماندار اپنے ماتحتوں پر غصے میں پھٹ پڑتا ہے صرف بعد میں ان سے ڈرنے کے لیے تو وہ بالکل بے استعداد ہے۔ جب دشمن کے سفارتکار مفاہمتی الفاظ کے ساتھ آئیں تو وہ جنگ ختم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جب دشمن آپ کا سامنا لمبے عرصے تک لڑائی میں شمولیت اپنی صف بندی (جگہ)

چھوڑے بغیر غصے سے کرتا ہے تو پھر آپ کو اسے نہایت احتیاط سے دیکھنا ہوگا۔

کسی فوج کی قوت محض اس کی تعداد میں نہیں ہوتی۔ عاقبت نااندیشی سے آگے نہ بڑھو۔ جب تک آپ اپنی فوج کو مرتکز کر سکتے ہو تو اس دوران دشمن کی حالت کی واضح تصویر لو اور اپنے آدمیوں کی پوری حمایت حاصل کرو۔ یہ کافی ہے۔ وہ جو دشمن پر یہ محتاط توجہ نہیں دیتا اور دشمن کو سنجیدگی سے نہیں لیتا اس کے ہاتھ گرفتار ہوتا ہے۔

اگر آپ سپاہیوں کو اس لیے سزا دیتے ہیں کہ وہ آپ کے وفادار نہیں تو وہ نافرمان رہیں گے۔ اور اگر وہ نافرمان ہیں تو انہیں استعمال کرنا مشکل ہوگا۔ لیکن جب وہ آپ کے وفادار بھی ہوں اور نظم وضبط نافذ نہ کیا جائے تو آپ پھر بھی انہیں استعمال نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا ان سے انسان دوستی سے پیش آتے ہوئے آپ کو انہیں اپنا حامی بنانا ہے اور انہیں سخت فوجی نظم وضبط کے ساتھ قطار میں رکھنا ہے اس سے ان کی اطاعت یقینی ہوگی۔

اگر سپاہیوں کی تربیت میں احکامات استقامت سے نافذ ہوتے ہیں تو وہ احکامات بجالانا سیکھیں گے۔ اگر تربیت کے دوران احکامات نافذ نہیں ہوتے تو ان کی تعمیل نہیں کریں گے۔ جب کمان (قیادت) کی عمل داری کا بہت زیادہ احترام ہو تو پھر کماندار اور اس کے سپاہیوں میں لازمی طور پر ہم آہنگی کا رشتہ ہوگا۔

دسواں باب

زمینی خدوخال

سن زو نے کہا: مندرجہ ذیل چھ قسم کی زمین ہوتی ہے۔ ''ٹونگ'' جو قابل رسائی ہو''گوا'' جو پھنسانے والی ہو۔ ''زہی'' جو دونوں کے لیے غیر سود مند ہو۔ ''بی'' جو تنگ اور ڈھلوانی ہو ''ایکزیان'' جو خطرناک ہو اور 'یوآن'' جو دور ہو۔

وہ قطعہ زمین جس تک دونوں فوجیں آسانی سے پہنچ سکیں ''ٹونگ'' کہلاتا ہے اس جیسی زمین پر وہ جو پہلے دھوپ والی بلند جگہ پر قابض ہو جاتا ہے اور فراہمی ساز وسامان کے سہل الحصول راستے قائم کر لیتا ہے جنگ میں فائدے میں رہتا ہے۔

وہ قطعہ زمین جو داخل تو ہونے دے لیکن اس سے نکلنا مشکل ہو''گوا'' کہلاتا ہے۔ اس قطعے کی فطرت ایسی ہے کہ اگر دشمن تیار نہ ہو اور آپ اس پر حملہ کرتے ہیں تو آپ اسے شکست دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر دشمن تیار ہو اور پھر آپ اس پر حملہ آور ہوتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ آپ اسے شکست دینے میں ناکام ہوں گے بلکہ آپ کو وہاں سے نکلنے میں بھی مشکل ہوگی۔ نتیجتاً آپ مشکل میں پھنس جائیں گے۔

وہ قطعہ زمین جو ہر ایک فریق کے داخلے کے لیے غیر سود مند ہو''زہی'' کہلاتی ہے۔ اس قسم کی زمین پر چاہے دشمن آپ کو لبھائے (لالچ دے) آپ کو طعمہ نہ لینا چاہیے بلکہ پیچھے ہٹ جانا چاہیے۔۔ دشمن کو لبھا کے آدھا باہر نکلوا کے پھر آپ اپنے فائدے کے لیے اس پر حملہ کر سکتے ہیں۔

''بی'' زمین پر اگر آپ درے پر پہلے قابض ہو سکتے ہیں تو اسے مکمل فوجی حفاظت میں دیں اور دشمن کی آمد کا انتظار کریں۔ لیکن اگر دشمن ایسے درے پر پہلے قابض ہو جائے فوج متعین کر دے تو پھر آپ جنگ نہ لڑیں۔ لیکن اگر وہ فوج کی تعیناتی میں ناکام ہو جاتا ہے تو پھر آپ حملہ کر سکتے ہیں۔

جہاں تک ''ایکزیان'' زمین کا تعلق ہے اگر آپ اس پر پہلے قابض ہو جائیں تو پھر آپ کو دھوپ والی بلند جگہ لینی اور دشمن کا انتظار کرنا چاہیے۔ اگر دشمن اس پر پہلے قابض ہو جائے تو آپ کو یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے اور اس کے تعاقب سے گریز کرنا چاہیے اور ''یوآن'' کی صورت میں یعنی جب دشمن دور کچھ فاصلے پر ہو اور اگر دونوں فوجیں مساوی توازن طاقت رکھتی ہیں تو پھر جنگ پر ابھارنا آسان نہیں ہے اور دشمن تک جنگ لے جانا آپ کے مفاد میں نہیں ہے۔

اب یہ چھ اصول ہیں جو زمین کے استعمال پر حکمران ہیں۔ کماندار کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کا بہت احتیاط سے مطالعہ کرے۔

عمل جنگ میں چھ آفاقی حالات ہیں۔ وہ ہیں فرار، نافرمانی، ابتری، بدنظمی اور بھگدڑ۔ ان کی وجہ فطرت نہیں بلکہ کماندار کی غلطی ہوتی ہے۔

جب دونوں جانب کے تزویراتی فائدے تقریباً ایک سے ہوں تو کسی فوج کے اپنے سے دس گنا بڑی فوج پر حملے کا نتیجہ فرار ہوگا۔ اگر سپاہی مضبوط اور افسر کمزور ہیں تو نتیجہ نافرمانی ہوگا۔ اگر افسر مضبوط اور سپاہی کمزور ہیں تو نتیجہ ابتری ہوگا۔ اگر کوئی اعلیٰ افسر غصے میں آ جاتا اور نافرمان ہو جاتا ہے اور دشمن کا سامنا ہونے پر اپنی خفگی کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اسے بلا اجازت لڑائیوں پر اکسائے۔ اور کماندار کو اس آفیسر کی صلاحیتوں کے بارے میں پتہ نہ ہو تو نتیجہ تباہی ہوگا۔ اگر کماندار کمزور اور نااہل ہے اور اس کی قیادت ڈھیلی ہے اگر افسروں اور جوانوں کی رہنمائی کے لیے یکساں قوانین نہیں ہیں اور اگر اس کی عسکری جتھہ بندیاں بے ترتیب ہیں تو نتیجہ افراتفری ہوگا۔ اگر کماندار دشمن کو جانچنے میں نااہلی سے ایک بڑی فوج سے لڑنے کے لیے چھوٹی فوج بھیجتا ہے' کمزور دستے دشمن کے مضبوط دستوں کے خلاف مامور کرتا ہے۔ اور طوفانی دستوں کے ہراول کے بغیر جنگ کرتا ہے تو نتیجہ شکست ہوگا۔

فائدہ مند قطعہ زمین جنگ میں ایک فطری اتحادی ہو سکتا ہے۔ اعلیٰ فوجی قیادت دشمن کی حالت کو جانچنے اور فتح کے لیے حالات پیدا کرنے قدرتی مشکلات کا تجزیہ کرنے اور فاصلوں کا حساب لگانے کی صلاحیت میں مضمر ہے۔ وہ جوان عوامل کی مکمل فہم کے ساتھ لڑتا ہے یقینی طور پر جیتے گا' وہ جو اس علم کے بغیر لڑتا ہے لازماً ہارے گا۔

یوں اگر جنگ کی تدبیر آپ کے لیے فتح کو یقینی بناتی ہے تو آپ کے لیے درست ہے کہ

آپ جنگ پر اصرار کریں جبکہ بادشاہ نے منع کیا ہوا ہو۔ جہاں جنگ کا منصوبہ فتح کی اجازت نہیں دیتا تو آپ کے لیے درست ہے کہ آپ جنگ لڑنے سے انکار کریں باوجودیکہ بادشاہ کہتا ہو کہ جنگ لڑو۔ اس لیے وہ کماندار جو ذاتی شہرت کے حصول کے خیال کے بغیر آگے بڑھنے کا فیصلہ کرتا ہے اور سزا کے خوف کے بغیر پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کرتا ہے اور جس کا مطمع نظر صرف اپنے عوام کی حفاظت اور اپنے بادشاہ کی خدمت ہو ریاست کے لیے بیش بہا اثاثہ ہے۔

کیونکہ وہ اپنے جوانوں کی ایسے فکر کرتا ہے جیسے کہ وہ بچے ہوں اس لیے بڑے سے بڑے خطرے میں بھی وہ اس کی اطاعت کریں گے۔ (اس کے پیچھے جائیں گے) کیونکہ وہ اپنے سپاہیوں سے ایسے پیار کرتا ہے جیسے وہ اس کے بیٹے ہوں وہ موت کی حد تک بھی اس کا ساتھ دیں گے۔ لیکن اگر کماندار اپنے جوانوں کی اس حد تک ناز برداری کرتا ہے کہ وہ انہیں استعمال نہ کر سکے۔ اگر وہ ان پر اس حد تک فدا ہو کہ ان پر اپنے احکامات نافذ نہ کر سکے' اگر اس کے جوان بدنظمی کا شکار ہیں اور وہ انہیں کنٹرول نہ کر سکے تو وہ بگڑے ہوئے بچوں کی طرح اور بے کار ہوں گے۔

یہ جاننا کہ تمہارے جوان دشمن پر حملہ کرنے کے قابل ہیں اور یہ نہ جاننا کہ وہ حملے سے ناقابل تسخیر ہے آپ کے فتح کے امکانات کو آدھا کر دیتا ہے۔ یہ جاننا کہ دشمن حملے کے لیے زد پذیر ہے اور یہ نہ جاننا کہ آپ کے جوان اس پر حملہ کرنے کے قابل نہیں ہیں آپ کے فتح کے امکانات کو نصف کر دیتا ہے۔ یہ جاننا کہ دشمن حملے کے لیے زد پذیر ہے اور یہ کہ آپ کے جوان حملے کے قابل ہیں لیکن یہ نہ جاننا کہ قطعہ زمین جنگ میں آپ کا معاون نہیں ہے ایک دفعہ پھر آپ کے فتح کے امکانات نصف کر دیتا ہے۔

وہ جو جنگ و جدل میں ماہر ہیں جب عمل کرتے ہیں تو کبھی پریشان نہیں ہوتے اور دشمن پر حاوی ہونے کی ان کی خوش تدبیری لامحدود ہوتی ہے۔

اس لیے کہا جاتا ہے۔ اپنے دشمن کو جانو اور اپنے آپ کو جانو تو فتح خطرے میں نہ رہے گی۔ آسمان اور زمین دونوں کو جانو اور مکمل فتح ہوگی۔

گیارہواں باب

نو علاقے

سن زو نے کہا: فوجیوں کی صف آرائی کے فن میں نو قسم کے علاقوں کا دھیان رکھنا ہوگا۔ 1- پھیلاؤ والے (سان) 2- حاشیائی (قنگ) 3- جھگڑے والے (زھنگ) 4- کھلے (جیاؤ) 5- ماسکی (قو) 6- مخدوش (زہونگ) 7- مشکل (پی) 8- ناکہ بندی والی (ویی) اور جان لیوا (سی)
جب لڑائی آپ کی اپنی ریاست کی سرزمین پر لڑی جائے تو یہ ایسا علاقہ ہے جو اپنے فوجیوں کے پھیلاؤ کا متقاضی ہے۔ جہاں کوئی دشمن کی سرزمین میں صرف تھوڑے فاصلے تک گھس گیا ہو تو یہ حاشیائی علاقہ ہوگا۔ ایسا علاقہ جسے جو بھی پہلے قبضے میں لے لے اسے فائدہ پہنچائے گا جھگڑے والا کہلائے گا۔ ایسا علاقہ جو دونوں کے لیے قابل رسائی ہے کھلا علاقہ ہوگا۔ وہ سرزمین جہاں بہت سی ہمسایہ ریاستوں کی سرحدیں ملتی ہوں ماسکی علاقہ ہے۔ اس پر پہلے پہنچنے والا دوسری ریاستوں کی حمایت حاصل کرے گا۔ جب کوئی فوج دشمن کے علاقے میں گہری گھس جاتی ہے اور بہت سے شہر پیچھے چھوڑ جاتی ہے تو یہ مخدوش علاقہ کہلاتا ہے۔ پہاڑ اور جنگل درے اور فطری خطرات' گیلی زمین' دلدلیں اور ایسی سڑکیں جن پر چلنا دوبھر ہو مشکل علاقہ ہوتے ہیں۔ جہاں داخلے کی سڑک تنگ ہو اور باہر نکلنے والی ٹیڑھی میڑھی اور تھوڑی سی فوج جس کی آسانی سے حفاظت کر سکتی ہو تو یہ ناکہ بندی والا علاقہ ہے۔ ایسی زمین جس پر آپ اپنی تمام طاقت کے ساتھ لڑیں تو ہی بچیں گے اور اگر ایسا کرنے میں ناکام ہوں گے تو تباہ ہو جائیں گے جان لیوا علاقہ کہلاتا ہے۔

پھیلاؤ والے علاقے میں جنگ نہ کریں۔ حاشیائی علاقے میں نہ ٹھہریں جھگڑے والے علاقے میں دشمن پر حملے کے لیے طاقت خرچ نہ کریں۔ کھلے علاقے میں (اپنی مواصلات) سے

کاٹے نہ جاؤ۔ ماسکی علاقے میں ہمسایہ ریاستوں سے اتحادات بناؤ۔ مخدوش علاقے میں دشمن کے ذرائع کو لوٹو۔ مشکل علاقے میں تیزی سے نکل جاؤ۔ ناکہ بندی والے علاقے میں اتفاقی واقعات کے لیے منصوبہ بندی کرو۔ جان لیوا علاقے میں لڑنے کے لیے اپنی تمام قوت اور حوصلے کو مجتمع کرو۔

پرانے وقتوں میں وہ جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ جنگ کے ماہر ہیں۔ دشمن کو ایسی حالت میں گھٹانے کے قابل تھے کہ اس کا ہراول اور عقبی محافظ ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکتے تھے اس کی بنیادی فوج اور خاص دستے ایک دوسرے کی حمایت نہ کر سکتے تھے۔ اس کے افسر اور جوان ایک دوسرے کی مدد کے لیے نہ آ سکتے تھے۔ اعلیٰ افسر اور ان کے ماتحت اپنے اعمال مربوط نہ کر سکتے تھے اور یہ کہ اس کی بکھری ہوئی سپاہ دوبارہ جتھہ بندی نہ کر سکتی تھی اور جب وہ اکٹھے بھی ہوتی تو صف بندی نہ کر پاتی۔

اگر یہ ان ماہر کمانداروں کے مفاد میں ہوتی تو وہ عمل میں آ جاتے اگر نہیں تو وہ عمل کرنے سے باز رہتے۔ ''اگر ایک بڑی اور منظم فوج ہمارے خلاف پیش قدمی کرے تو ہم کیا کریں گے؟'' اس کا جواب ہے۔ ''وہ چھین لو (اس پر قبضہ کر لو) جو دشمن کے لیے سب سے مقدم ہے تو وہ وہ کرے گا جو آپ چاہتے ہیں۔'' جنگ میں رفتار سب سے اہم عامل ہوتی ہے۔ اس کے معنی ہیں دشمن کو بے خبری میں پکڑو اپنی راہ غیر متوقع راستوں کے ذریعے بناؤ اور وہاں حملہ کرو جہاں وہ کم سے کم تیار ہو۔

ایک حملہ کرنے والی فوج کے لیے عسکری عمل کا عام اصول ہے۔ دشمن کے علاقے میں آپ جتنا گہرا جاؤ گے اتنا ہی آپ کی سپاہ میں یکجانیت ہوگی اور اتنا ہی کم امکان ہوگا کہ (میزبان) فوج آپ پر حاوی ہو۔ دشمن کے زرخیز ترین علاقوں کو لوٹو۔ تمہاری فوج کے پاس سامان خورد ونوش وافر ہوگا۔ اپنی فوج کو تھکنے نہ دو ان کا حوصلہ بڑھاؤ اور ان کی طاقت بچاؤ۔ اپنی فوج کی صف آرائی ایسے کرو اور اپنی تزویراتی منصوبہ بندی ایسے کرو کہ دشمن آپ کی حرکات کا پتہ نہ چلا سکے۔ اپنی فوج کو

ایسی حالت میں ڈالو کہ جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو اور وہ پیچھے ہٹنے پر موت کو ترجیح دیں گے۔ جب آپ کے جوان اور افسر مرنے کے لیے تیار ہیں تو آپ ان سے ان کی مکمل جانفشانی سے کم کچھ نہیں پائیں گے۔ جبکہ آپ کے جوان ہولناک ترین کٹھنائیوں میں ہوں گے تو بھی وہ خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ بھاگنے کے لیے کسی جگہ کے بغیر وہ ثابت قدمی سے جمے رہیں گے۔ دشمن کے علاقے میں گہرا گھس جانے کے بعد وہ فرد واحد کی طرح متحد ہوں گے اور اگر ضرورت پڑے تو وہ بے جگری اور مستعدی سے لڑیں گے۔ یوں وہ فوج جوان حالات میں ہو گی بغیر نصیحتوں کے چوکس ہو گی بلا آخر اپنے فرائض پورے کرے گی بغیر بندش کے منہمک ہو گی اور جب قریبی نگہداشت میں نہ بھی ہو گی تو نظم وضبط کی پابندی کرے گی۔ شگونوں کی گفتگو پر پابندی عائد کر دو اور جوانوں کو خدشات سے آزاد کر دو تو وہ اپنے دستوں سے موت تک فرار نہ ہوں گے۔

آپ کے افسران کے پاس دولت کی زیادتی نہیں ہے لیکن اس لیے نہیں کہ وہ دنیاوی اشیاء سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ موت سے نہیں ڈرتے لیکن اس لیے نہیں کہ وہ لمبی عمر سے نفرت کرتے ہیں جنگ کا حکم دیئے جانے پر وہ جو بیٹھے ہوئے ہوں ان کے کپڑے آنسوؤں سے بھیگ سکتے ہیں اور وہ جو لیٹے ہوئے ہوں ان کے منہ آنسوؤں سے تر ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب انہیں ایسی حالت میں دھکیل دیا جائے جہاں کوئی راستہ نہ ہو تو وہ اتنے دلیر ہوں گے جتنے ''ذہوان ذہو'' ''کاؤ گوئی'' اور دوسرے قدیم سورما تھے۔

اس لیے وہ جو جوانوں سے کام لینے کے ماہر ہیں ''چانگ'' پہاڑی پر پائے جانے والے سانپ کی طرح ہیں۔ اگر اس کے سر پر مارو تو اس کی دم مدد کے لیے آئے گی۔ اگر اس کی دم پر مارو تو اس کا سر مدد کے لیے آئے گا۔ اور اگر اس کے درمیانی حصے پر مارو تو اس کا سر اور دم دونوں بچانے کے لیے آئیں گے۔ اگر پوچھا جائے کیا کسی فوج کو چانگ پہاڑی کے سانپ کی طرح عمل کرنے کی تربیت دی جا سکتی ہے؟ تو میں کہتا ہوں ہاں دی جا سکتی ہے۔ ''وو'' اور ''یوء'' کے لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ لیکن اگر انہیں ایک ہی کشتی میں دریا پار کرنا پڑ جائے اور وہ طوفان

میں گھر جائیں تو وہ ایک دوسرے کی مدد اس طرح کریں گے جس طرح دائیں ہاتھ کی بایاں ہاتھ کرتا ہے۔اس لیے گھوڑوں کو باندھنا اور رتھوں کے پہیوں کو دفن کرنا کافی نہیں۔(آخر تک لڑنے کے مصمم ارادے کے اظہار کا اشارہ۔مترجم) ایک فوج کے انتظام کا طریقہ یہ ہے کہ کمزور اور مضبوط سپاہیوں کو ایک ہی سطح کا حوصلہ دلانے کی کوشش کی جائے بالکل اسی طرح جیسے زمین کو موزوں طریقے سے استعمال کرنا اونچی اور نیچی دونوں قسم کی زمینوں کے بہترین استعمال میں ہے۔ ماہر کماندار پھر اپنے دستوں کی قیادت اس طرح کر سکتا ہے جیسے وہ ایک آدمی ہو جو اس کی اطاعت ہی کر سکتا ہے۔

کماندار کا یہ فرض ہے کہ وہ پرسکون اور نا قابل فہم رہے غیر جانبدار رہے اور نظم وضبط لاگو کرنے میں سخت گیر ہو۔اپنے افسروں اور جوانوں کو اپنے جنگی منصوبوں سے بے خبر رکھنے کے لیے اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ ''ان کے کان بند اور آنکھوں کو اندھا کر سکے۔'' وہ اپنے انتظامات میں ترمیم اور منصوبوں کو بدلتا ہے تا کہ اپنے ارادوں کو چھپا سکے۔وہ اپنا کیمپ دوسری جگہ لے جاتا ہے اور چکر والے راستے اختیار کرتا ہے تا کہ لوگ اس کی چالوں کی پیش بینی نہ کر سکیں۔ جس دن وہ اپنی فوجوں کو جنگ میں لے جاتا ہے اسی طرح ہے کہ اونچی دیوار پر چڑھا جائے اور سیڑھی کو لات مار کے پیچھے پھینک دیا جائے تا کہ پیچھے نہ ہٹا جائے۔وہ اپنی سپاہ کو ہمسایہ ریاستوں کے علاقے میں گہرا لے جاتا ہے جس طرح ایک تیر کمان سے چھوڑا جائے جو سیدھا اڑتا ہوا جائے۔جب وہ مستعدی سے جنگ آزما ہونا چاہتا ہے تو وہ اپنی کشتیاں جلا دیتا ہے اور کھانے کے برتن توڑ دیتا ہے۔ایک گڈریے کی طرح جو اپنی بھیڑوں کو ہانکتا ہے وہ اپنے جوانوں کو یہاں وہاں لے جاتا ہے اور کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔وہ اپنی فوجوں کو اکٹھا کرتا ہے اور انہیں خطرے کی گہرائیوں میں دھکیل دیتا ہے۔تو یہ کماندار کے کام ہیں۔نو قسم کے علاقوں کو مختلف طریقوں سے نپٹنا۔حملہ آور ہونے یا دفاعی صورت اختیار کرنے کے فائدے اور نقصانات اور انسانی فطرت کا ڈانواڈول ہونا۔ان سب پر مکمل نظر ہونی چاہیے۔

حملہ کرنے والی فوج سے متعلق ایک عام اصول ہے کہ آپ دشمن کے علاقے میں جتنا گہرا گھس جائیں گے آپ کے سپاہیوں میں اتنی ہی زیادہ یکجانیت ہوگی۔ جتنا سطحی دخول ہوگا آپ کی فوجیں اتنی ہی زیادہ سست اور زیادہ بکھری ہوئی ہو جائیں گی۔ جب اپنا علاقہ چھوڑتے ہیں اور اپنی فوجوں کو سرحد پار لے جاتے ہیں تو آپ ایسے نکتے پر پہنچتے ہیں جہاں سے واپسی نہیں ہے۔ جب آپ ایسے علاقے میں ہیں جو سڑکوں کے جال سے اٹا ہوا ہو تو آپ ماسکی علاقے میں ہیں۔ جب دشمن کی سرزمین میں دور تک گھس گئے ہوں تو آپ مخدوش علاقے میں ہیں۔ جب آپ تھوڑے فاصلے تک گھسے ہیں تو آپ حاشیائی علاقے میں ہیں۔ جب آپ کی پشت بہت زیادہ محفوظ زمین کی طرف ہو اور آپ کو تنگ درے کا سامنا ہو تو آپ ناکہ بندی کے علاقے میں ہیں۔ جب آپ کے پاس لڑنے کا راستہ نہیں تو آپ جان لیوا علاقے میں ہیں-

اس لیے ایسے علاقے میں جہاں سپاہی آسانی سے بکھر سکیں وہاں میں افسروں اور جوانوں کے ذہن کے ایک ہونے کو یقینی بناؤں گا۔ حاشیائی علاقے میں میں دستوں کی صف آرائی اس طرح کروں گا کہ وہ قریبی طور پر مربوط رہیں۔ ایک کھلے علاقے میں دستوں کو تیزی سے چکر لگوا کر دشمن کے پیچھے لے جاؤں گا۔ ایک جھگڑے والے علاقے میں دفاع پر خاص توجہ دوں گا۔ ماسکی علاقے میں ہمسایہ ریاستوں سے اپنے اتحادوں کی پختگی یقینی بناتا ہوں ایک مخدوش علاقے میں سامان خورد و نوش کی فراہمی میں اضافہ کرتا ہوں۔ مشکل علاقے میں جلدی سے گزر جاتا ہوں ایک ناکہ بندی والے علاقے میں اپنی صفوں میں تمام خامیاں دور کرتا ہوں۔ ایک جان لیوا علاقے میں اپنے جوانوں کو تلخ آخر تک لڑنے کے ارادے کا اظہار کرتا ہوں فوجی صورت حال سپاہی سے جب وہ گھیرے میں ہو تو مزاحمت کا جب کوئی متبادل چارہ نہ ہو تو لڑنے کا اور ہرچند کہ ناامیدی کی حالت ہو حکم بجالانے کا تقاضا کرتی ہے۔

جب تک آپ ہمسایہ ریاستوں کے بادشاہوں کے تزویرانی ارادوں کو نہ جانتے ہوں تو آپ کو ان سے اتحادوں میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔ جب تک آپ زمین کی وضع قطع نہ جانیں۔

اس کے پہاڑوں اور جنگلوں اس کے دروں اور فطری خطرات اس کی کیچڑ والی اور دلدلی زمینوں سے واقف نہ ہوں تو آپ کو اس پر اپنی فوج صف آراء نہیں کرنی چاہیے۔ آپ اس وقت تک اس علاقے کو اپنے حق میں استعمال نہیں کر سکتے جب تک آپ مقامی گائیڈوں سے کام نہ لیں۔ ان میں سے کسی نکتے سے متعلق اگر معلومات نہیں رکھتی تو وہ ایک بالادست قائد کی فوج نہیں ہے۔
جب کسی بالادست قائد کی فوج کسی بڑی ریاست پر حملہ آور ہوتی ہے تو وہ اپنے دشمن کو اتنا وقت نہیں دیتا کہ وہ اپنی فوجیں جمع کر لے۔ جب وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتا ہے تو وہ دشمن کو دوسری ریاستوں سے اتحاد قائم کرنے سے روک دیتا ہے۔ اس وجہ سے آپ کو دوسری ریاستوں سے اتحادات بنانے کی یا اپنی فوجوں کو ان ریاستوں میں (رکھ کر) پالنے کی ضرورت نہیں۔ جب آپ اپنے تزویراتی ارادوں کی تکمیل کرتے ہیں اور دشمن پر اپنے اثرات ڈالتے ہیں تو آپ اس کے شہروں پر قابض ہو سکتے اور اس کے دارالسلطنت کو زمین بوس کر سکتے ہیں۔

غیر معمولی انعامات عنایت کرو اور غیر معمولی قوانین نافذ کرو تو آپ پوری فوج کی اس طرح کمان کر سکتے ہو جیسے وہ ایک آدمی ہو۔ سپاہیوں کو ان کا کام دو لیکن اپنے منصوبے ظاہر نہ کرو۔ انہیں فائدے جاننے دو لیکن خطرات ظاہر نہ کرو۔ جب آپ انہیں زندگی و موت کے حالات میں پھینک دیں گے تو صرف اپنی بقا کے لیے وہ لڑیں گے۔ جب آپ انہیں ایسی جگہوں میں دھکیل دیں گے جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو تو صرف وہاں وہ زندہ رہنے کے لیے لڑیں گے۔ جب عام سپاہی اپنے آپ کو خطرناک حالت میں پاتے ہیں تو صرف اس وقت وہ شکست کو فتح میں تبدیل کرتے ہیں۔ اس لیے کماندار کی توجہ دشمن کے منصوبوں کے بغور مطالعے میں اور اپنی فوجوں کو بنیادی حملے پر مرکوز کرنے پر ہو۔ تو پھر وہ دشمن کماندار کو 1000 لی کے فاصلے پر قتل کر سکتا ہے۔ یوں اپنی اختراع پسندی اور مہارت کا استعمال کرتے ہوئے وہ حیران کن کام کر سکتا ہے۔

اس وجہ سے جس دن جنگ کے راستے کا فیصلہ ہو جائے تو درے بند کر دو۔ سرکاری کھاتے تباہ کر دو اور دشمن کے سفارت کاروں کے گزر کی ممانعت کر دو۔ اپنے منصوبوں پر خفیہ بحث کرو اور

اجدادی عبادت گاہ میں اپنی تزویر کو آخری شکل دو۔ایک دفعہ جب دشمن کے دفاع میں دراڑ ظاہر ہو جائے تو آپ کو اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً اپنے سپاہیوں کو اس میں لے جانا چاہیے۔ پہلے تزویراتی اہمیت کی جگہوں پر قبضہ کرو۔لیکن غیر سنجیدگی سے فیصلہ کن لڑائی کی تاریخ پر اتفاق نہ کرو۔ جب اپنی نقل وحرکت کا فیصلہ کرو تو لچکدار رہو۔ ہمیشہ دشمن کے بدلتے ہوئے انداز کے مطابق نظر ثانی کے لیے تیار رہو۔اس لیے لڑائی شروع ہونے سے پہلے ایسے شرمیلے نظر آؤ جس طرح ایک کنواری تو دشمن اپنی چوکسی نرم کر دے گا اور اپنا دروازہ کھلا چھوڑ دے گا۔ایک دفعہ لڑائی شروع ہو جائے تو اتنی تیزی سے حرکت کرو جس طرح کہ خوفزدہ خرگوش بھاگتا ہے اور دشمن کو پتہ چلے گا کہ اتنی دیر ہوگئی ہے کہ مزاحمت نہیں ہوسکتی۔

بارہواں باب

آگ سے حملہ کرنا

سن زو نے کہا: آگ سے حملے کے آٹھ نشانے ہیں۔ 1- آدمی اور گھوڑے 2- غلہ اور چارہ 3- چھکڑے اور ساز وسامان 4- گودام۔ اور 5- فراہمی رسد کے راستے۔ آگ کا حملہ کرنے کے لیے کچھ خاص شرائط درکار ہیں۔ آگ لگانے کے لیے مواد ہمیشہ پاس ہونا چاہیے۔ آگ لگانے کے لیے موزوں موسم اور موزوں دن ہوتے ہیں۔ آگ کے حملے کے استعمال کے لیے خشک موسم اور وہ دن بہترین ہیں جب چاند (Winnowing Basket) (غلہ صاف کرنے والی ٹوکری چھاج) کے جھرمٹ سے گزرتا ہے۔ آگ کا حملہ کرنے کے لیے ''دیوار'' ''بازو'' اور ''رتھوں کا چبوترہ'' بہترین ہیں کیونکہ عام طور پر وہی دن ہوتے ہیں جب تیز ہوائیں چلتی ہیں۔

آگ سے حملہ کرتے وقت آپ کو بدلتے ہوئے حالات کا جواب لچک سے دینا چاہیے اور اپنے سپاہیوں کو اس کی مطابقت میں صف آرا کرنا چاہیے۔ جب دشمن کیمپ کے اندر آگ بھڑک اٹھے تو فوری طور پر باہر سے حملہ کر دو۔ اگر آگ بھڑک اٹھنے کے باوجود دشمن کی فوج پرسکون رہے تو اپنے وقت کا انتظار کرو اور حملہ نہ کرو۔ آگ کو اپنی بلندی تک پہنچنے دو پھر اگر آپ حملے سے گھس سکتے ہو تو ایسا کرو اگر نہیں تو پھر وہیں رہو جہاں ہو۔ اگر آگ دشمن کے کیمپ کے باہر سے شروع ہوئی ہو تو اپنے ایجنٹوں کے اندر سے عمل کا انتظار نہ کرو۔ صحیح وقت پر آگ لگا دو۔ اگر آگ ہوا کے مخالف لگی ہو تو ہوا کے موافق رخ کی طرف سے حملہ نہ کرو۔ اگر تمام دن لگاتار ہوا چلتی رہے تو غالباً وہ رات کو ختم ہو جائے گی۔ تمام حالات میں فوج کو جاننا چاہیے کہ پانچ قسم کے آتشیں حملوں میں سے مختلف حالات کے مطابق کون سا استعمال کرنا ہے اور حملے کے لیے درست وقت کا انتظار کرنا ہے۔

حملوں میں مدد کے لیے آگ کا استعمال غیر معمولی نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ غرقاب کرنے کا

طریقہ حملوں کو زیادہ طاقتور بنا سکتا ہے۔ لیکن غرقابی دشمن کو کاٹ تو سکتی ہے اسے سازوسامان اور رسد سے محروم نہیں کرسکتی۔

لڑائیاں جیتنا، اراضی اور شہروں پر قابض ہونا اور اس کے باوجود ان حاصلات کو مربوط و مستحکم نہ کرسکنا خطرات سے پر ہے کیونکہ اس سے سپاہیوں کا حوصلہ پست ہو جائے گا۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک دانش مند بادشاہ جنگ شروع کرنے سے پہلے محتاط غوروفکر کرتا ہے اور ایک اچھا کماندار احتیاط برتتا ہے۔ جنگ میں مت جاؤ اگر وہ ریاست کے مفاد میں نہیں ہے۔ فوجیں صف آراء نہ کرو اگر آپ کی فتح یقینی نہیں ہے۔ انہیں جنگ میں نہ بھیجو اگر آپ خطرے میں نہیں ہو۔ ایک حکمران کو جنگ اس لیے شروع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ غصے میں ہے ایک کماندار یا جنرل کو جنگ صرف اس لیے نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ناراض ہے۔ صرف اس وقت عمل جنگ کرو جب وہ آپ کے مفاد میں ہو ورنہ مت کرو۔ کیونکہ غصے میں بھرا ہوا آدمی دوبارہ پرسکون ہو سکتا ہے اور ناراض آدمی دوبارہ خوشی حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن ایک ریاست اگر تباہ ہو جائے تو دوبارہ بحال نہیں ہو سکتی اور نہ ہی مرے ہوؤں کو دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے۔

اس لیے روشن دماغ حکمران جنگ کے سوال کو انتہائی احتیاط سے لیتا ہے اور اچھا کماندار اپنے آپ کو ناعاقبت اندیشانہ عمل کے خلاف خبردار کرتا ہے۔ یہ طریقہ ریاست کو محفوظ اور فوج کو صحیح سلامت رکھنے کا ہے۔

تیرہواں باب

جاسوسوں کا استعمال

سن زو نے کہا: اب جب 100,000 نفری کی فوج کھڑی کر لی جائے اور کسی دور کی مہم پر بھیجی جائے تو وہ خرچ جو لوگ برداشت کریں گے۔ بمع خزانے سے تقسیم ہونے والی رقوم کے تو ایک ہزار سونے کے ٹکڑے یومیہ خرچ ہوگا۔ گھر کے اندر اور باہر ایک مسلسل ہنگامہ ہوگا۔ تقریباً 700,000 گھرانے اپنے کھیتوں کا کام نہ کر سکیں گے۔ کیونکہ سڑکوں پر محنت کی بنا پر وہ تھکے ہوئے ہوں گے۔ دونوں فوجیں سالوں تک ایک دوسرے کے مقابل رہ سکتی ہیں بیشتر اس کے کہ وہ دن آئے جب فیصلہ کن جنگ ہو۔ اس لیے وہ کمانڈر اپنے لوگوں سے مکمل عدم دلچسپی کا اظہار کرتا ہے اگر وہ اتنا کنجوس ہو کہ اپنے جاسوسوں کو درجات اعزازات اور سونے کے سو ٹکڑے نہ عطا کرے اور جنگ ہار جائے کیونکہ وہ دشمن کے حالات سے ناواقف ہے۔ ایسا آدمی اپنے سپاہیوں کا کمانڈار ہونے اپنے حکمران کا مشیر ہونے اور فتح کا مالک ہونے کا اہل نہیں ہے۔

روشن دماغ حکمران (بادشاہ) اور قابل کمانڈار ہر چال پر دشمن کو فتح کرتے ہیں اور ایسی کامیابی حاصل کرتے ہیں جو عام لوگوں کی کامیابیوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ان کے پاس ''پیش بینی'' ہوتی ہے۔ یہ ''پیش بینی'' آسیبوں اور روحوں سے حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی ماضی کے واقعات کی تشبیہات سے اور نہ ہی نجومی حساب کتاب سے۔ یہ صرف ان لوگوں سے آ سکتی ہے جو دشمن کی حالت جانتے ہیں۔

اس لیے جاسوسوں کا استعمال جن کی پانچ قسمیں ہوتی ہیں۔ مقامی' اندرونی' تبدیل شدہ' قابل گزاشت اور بچ جانے والے ایجنٹس۔ جب یہ پانچ قسم کے ایجنٹ ایک ہی وقت پر اور اپنے عمل کے طریقوں میں مکمل رازداری برتتے ہیں تو اس سے معجزے رونما ہو سکتے ہیں۔ یہ طلسماتی ہتھیار حکمران کے لیے ایک حقیقی خزانہ ہوتا ہے۔

ایک مقامی ایجنٹ دشمن کے اپنے ملک کا باشندہ جو آپ کی ملازمت میں ہوتا ہے۔ ایک اندرونی ایجنٹ دشمن کا سرکاری ملازم جو آپ کی ملازمت میں ہوتا ہے۔ ایک تبدیل شدہ ایجنٹ' دوہرا ایجنٹ' دشمن کا جاسوس ہوتا ہے جسے آپ ملازم رکھ لیتے ہیں ایک قابل گزاشت ایجنٹ وہ ہوتا ہے جسے جان بوجھ کر غلط معلومات فراہم کی جاتی ہیں تاکہ دشمن کو گمراہ کیا جائے۔

ایک بچ جانے والا ایجنٹ وہ ہے جو دشمن کے کیمپ سے معلومات لے کے واپس آ جاتا ہے۔ ان سب میں سے جو کمانڈار کے قریب ہوتے ہیں۔ ایجنٹوں سے زیادہ قریبی کوئی نہیں ہوتا۔ تمام انعامات میں سب سے زیادہ فراخدلی سے ایجنٹوں کو دیئے جاتے ہیں۔ تمام معاملات میں سب سے زیادہ اعتماد والے خفیہ عمل سے متعلق ہوتے ہیں۔ وہ جس میں دانشمندی کی کمی ہے ایجنٹوں کو استعمال نہیں کر سکتا۔ وہ جو حساس اور چوکس نہیں ہے وہ ان سے معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔ جاسوسی اتنی نازک اور خفیہ ہوتی ہے کہ کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی جہاں آپ اس کا بہتر استعمال نہ کر سکیں۔

لیکن اگر خفیہ کارروائیوں کے منصوبے وقت سے پہلے افشا ہو جائیں تو وہ ایجنٹ اور وہ تمام لوگ جن کو اس نے یہ راز بتایا ہو قتل کر دینے چاہئیں۔

عام طور پر چاہے مقصد ایک فوج کو کچلنا ہو' ایک شہر پر حملہ کرنا ہو' یا دشمن کے کسی ملازم کو قتل کرنا ہو تو ہمیشہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ شروعات گیریزن کمانڈار کی شناخت کی دریافت سے کی جائے اس کے سٹاف افسروں' مصاحبوں' دربانوں اور محافظوں کا پتہ چلایا جائے۔ ایجنٹوں کو حکم دیا جائے کہ وہ یہ معلومات حاصل کریں۔ یہ لازمی ہے کہ پتہ چلایا جائے کہ دشمن کے ایجنٹ کون ہیں۔ کون آپ کی جاسوسی کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اور انہیں رشوت دے کر اپنے لیے استعمال کیا جائے۔ انہیں ہدایات دو اور واپس ان کے وطن بھیج دو۔ اس طرح تبدیل شدہ ایجنٹ بھرتی اور استعمال کیے جاتے ہیں۔ تبدیل شدہ ایجنٹوں کے ذریعے حاصل شدہ معلومات کی بنا پر مقامی اور اندرونی ایجنٹ بھرتی اور استعمال کیے جاتے ہیں۔ قابل گزاشت ایجنٹوں کو بھیجا جا سکتا ہے کہ وہ دشمن کو غلط معلومات فراہم کریں اور بچ جانے والے ایجنٹ طے شدہ پروگرام کے مطابق ضرورت والی معلومات کے ساتھ واپس آ سکتے ہیں۔ حکمران کو لازمی طور پر ان پانچ قسم کے ایجنٹوں کی کارروائیوں سے باخبر ہونا چاہیے اور یہ تبدیل شدہ ایجنٹ ہوتا ہے جو اس کے لیے ضروری

معلومات حاصل کرنے میں فیصلہ کن ہوتا ہے اس لیے اُسے موخرالذکر سے انتہائی سخاوت کا سلوک کرنا چاہیے۔

پرانے وقتوں میں ''یی زہی'' جس نے ''ایکسیا'' کے تحت کام کیا تھا ''ین'' (شانگ) خاندان کی ایکسیا خاندان پر بالادستی حاصل کرنے کا ذریعہ بنا تھا۔ اسی طرح ''کویا'' جس نے ''ین'' کے تحت خدمات انجام دی تھیں اس کے بعد میں آنے والے ''زہیو'' خاندان کے عروج میں اس کا خاصا ہاتھ تھا۔

اس لیے روشن دماغ حکمران اور دانشمند کماندار جو سب سے زیادہ ذہین لوگوں کو ایجنٹوں کے طور پر استعمال کرنے کے قابل ہوتے ہیں کارہائے نمایاں سرانجام دینے والا مقدر رکھتے ہیں۔ جنگ میں خفیہ کارروائیاں لازمی ہوتی ہیں۔ فوج اپنی ہر حرکت (چال) کا فیصلہ کرنے کے لیے ان پر انحصار کرتی ہے۔

❁

تحقیق کے نئے زاویے

بنگلہ دیشی نیشنل ازم

ڈاکٹر مبارک علی

نیشنل ازم کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ یہ زبان' مذہب' نسل اور سیاسی نظریات کی بنیادوں پر ابھرتا ہے۔ اس کی ابتداء ہمیشہ بڑی رومانوی ہوتی ہے جو جذباتی طور پر لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ قومی جذبات کا اثر اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ وقتی طور پر لوگ ذات پات' طبقات' جنسی تفریق اور زبان کے فرق کو بھول کر ایک وحدت میں مل جاتے ہیں جب نیشنل ازم کے زیراثر تاریخ کی تشکیل کی جاتی ہے' تو اس میں قوم ماضی میں یا تو سنہری دور کو ڈھونڈتی ہے تاکہ اس سے فخر کے جذبات پیدا کرنے اور یا تاریک دور کو تاکہ عبرت حاصل کرے' اور آگے کی جانب بڑھے۔ لیکن جب نیشنل ازم کی مدد سے سوسائٹی اور معاشرہ کامیابی حاصل کرلیتا ہے تو اس کے دو نتائج نکلتے ہیں یا تو معاشرہ خود کو مستحکم کرلیتا ہے اور یا نیشنل ازم کے نظریہ پر حکمراں طبقے قابض ہو کر اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جب کامیابی قریب آجاتی ہے تو کسانوں' مزدوروں اور عورتوں کو جنہیں جدوجہد اور آزادی کی جنگ کے لیے استعمال کیا گیا تھا' اب انہیں واپس ان کے مقام پر بھیج دیا جاتا ہے' ان کی قربانیوں کو نظرانداز کر کے انہیں تاریخی عمل سے دور کر دیا جاتا ہے۔ اور نتیجتاً معاشرہ زوال پذیر ہو کر پسماندہ ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال تیسری دنیا کے وہ ممالک ہیں کہ جو کولونیل ازم سے آزاد ہو کر مستحکم ہونے کے بجائے افراتفری کا شکار ہو گئے۔

ان نئے ملکوں میں بنگلہ دیش بھی ہے جو کہ درحقیقت دو بار آزاد ہوا ایک بار برطانوی تسلط سے اور دوسری بار پاکستان کے قبضہ سے۔ لہٰذا بنگلہ دیش کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ''بنگلہ قوم'' کی تعریف کس طرح سے کی جائے' کیا اسے بنگالی قوم کہا جائے یا

بنگلہ دیشی قوم؟ اس موضوع پر رنبیر سمدر (Ranabir Samader) کی کتاب (Paradoxes of the Nationalist Time) ایک اہم کتاب ہے کہ جس میں ان پیچیدگیوں اور الجھنوں کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

نیشنل ازم کے تحت جب تاریخ کو لکھا جاتا ہے تو کوشش کی جاتی ہے کہ معاشرے کی تمام پیچیدگیوں کو نظر انداز کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ نہ تو کوئی معاشی و سماجی تضادات ہیں اور نہ ہی رکاوٹیں' تاریخی عمل سیدھا اور صاف ہے۔ اس لیے جہاں جہاں اس نقطہ نظر میں مشکلات آتی ہیں' وہاں اسے خاموشی سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد بنگلہ دیشی نیشنل ازم جو کہ زبان کی بنیاد پر تھا' اب اس میں مذہب کو بھی داخل کیا گیا۔ تاکہ قوم کی تشکیل کے عمل کو ماضی سے وابستہ کر کے اس کو تاریخی حیثیت دی جائے۔ اس سلسلہ میں بنگلہ دیش کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ اپنے نیشنل ازم کی بنیاد زبان پر رکھتے تو اس صورت میں مغربی بنگال جو کہ اب ہندوستان میں ہے' اس سے ان کی جڑیں مل جاتیں اور ان کی انفرادیت ختم ہو جاتی۔ اس وجہ سے بنگالی نیشنل ازم کی جگہ بنگلہ دیشی نیشنل ازم کی تشکیل دی گئی کہ جس میں زبان اور مذہب دونوں کو شامل کیا گیا ہے۔

1971ء کی جنگ آزادی کے بعد' سوال یہ تھا کہ بنگلہ دیش کی تاریخ کو کہاں سے شروع کیا جائے؟ کیا اس کی ابتداء 1905 سے کی جائے کہ جب برطانوی حکومت ہند نے بنگال کو تقسیم کر دیا تھا' اور اس تقسیم کے نتیجہ میں بنگال میں قوم پرستوں نے زبردست تحریک شروع کی تھی۔ جس کے نتیجہ میں بالآخر حکومت کو 1911ء میں اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا اور بنگال کی تقسیم کو ختم کرنا پڑا۔ اس تقسیم اور اس کے خاتمہ نے مغربی اور مشرقی بنگال کے درمیان مذہب کی لائن کھینچ دی۔ تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ 1947ء میں کانگرس اور مغربی بنگال کے راہنماؤں نے آزاد بنگال کے بجائے یہ منظور کیا کہ اب اسے مذہب کی بنیاد پر تقسیم کر دیا جائے۔ لہٰذا 1947ء کی تقسیم میں مشرقی بنگال نے مسلم نیشنل ازم کے تحت خود کو پاکستان کا ایک حصہ بنا لیا۔ اس طرح بنگلہ دیش کی تاریخ پیچیدگی سے دوچار ہے۔ 1947ء کے واقعہ کو کس طرح بیان کیا جائے' اور اس وقت کے مسلم نیشنل

ازم کی کس طرح تشریح کی جائے؟ 1971ء میں لسانی نیشنل ازم کو کس طرح ماضی سے جوڑا جائے۔

لہٰذا بنگلہ دیش کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں سے واقعات و شخصیات کو کس طرح سے خارج اور شامل کیا گیا ہے' مثلاً اس میں مولانا اکرم خاں' ابوالقاسم فضل حق اور حسین شہید سہروردی کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے' کیونکہ یہ وہ راہنما تھے کہ جنہوں نے تقسیم اور اس سے پہلے پاکستان کی سیاست کی تھی' اب بنگلہ دیش کی تاریخ میں ان کا کوئی خاص ذکر نہیں ہے۔ یہاں تک مولانا عبدالحمید بھاشانی کو بھی تاریخ کے حاشیہ پر ڈال دیا گیا ہے' کیونکہ انہوں نے جو تحریک شروع کی تھی' وہ کامیاب نہیں ہوئی' کمیونسٹ پارٹی اور دوسرے انقلابی گروپس بھی تاریخ سے باہر ہیں۔

اب تاریخ کی تشکیل میں نمایاں حصہ مکتی باہنی کا ہے کہ جس نے جنگ آزادی لڑی اور بنگلہ دیش کو پاکستان سے آزاد کرایا۔ ان مظالم اور قتل عام کا ذکر ہے کہ جو پاکستانی فوج نے' فوجی ایکشن کے دوران کیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمان اس تاریخی عمل میں اہم شخصیت بن کر ابھرتے ہیں کہ جنہوں نے ثابت قدمی کا ثبوت دیتے ہوئے ملک کی آزادی کی جدوجہد کی۔ لیکن یہ تو تاریخ ہوئی' حقیقت میں جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔ جیسے ہی مجیب الرحمان کا سیاسی اقتدار مضبوط و مستحکم ہوتا ہے' اس کے ساتھ ساتھ ملک میں آمرانہ حکومت کی داغ بیل پڑنا شروع ہو جاتی ہے۔ مخالف جماعتوں اور شخصیتوں کو کچلنے اور روکنے کے لیے رکشی باہنی بنائی جاتی ہے بائیں بازو کی جماعتوں کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ نوکر شاہی کا اقتدار اور تسلط قائم ہو جاتا ہے مجیب الرحمان کی شخصیت کو ابھارا جاتا ہے' جن لوگوں نے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی' انہیں خاموش کر دیا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فوج کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ان حالات کا نتیجہ کیا ہوا؟ مجیب الرحمان کا قتل ہوا' جمہوریت کا خاتمہ ہوا' اور فوج نے اقتدار سنبھال کر سویلین اداروں کو توڑ دیا یا انہیں اپنے تسلط میں لے لیا۔ اس وقت سے بنگلہ دیش ایک بحران سے گزر رہا ہے۔

اس وجہ سے بنگلہ دیش کی تاریخ لکھتے ہوئے' مورخوں کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔
1977ء میں حکومت نے ایک کمیشن بنایا تھا' جس کا مقصد بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کی تاریخ لکھنا تھا۔ 1985ء میں اس کمیشن نے 15 جلدوں میں وہ تمام دستاویزات شائع کر دیں کہ جو 1971ء کے واقعہ سے تھیں۔ 1991ء میں بنگلہ دیش کی حکومت نے 500 شہیدوں کی سوانح شائع کیں۔ لیکن اب تک ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی کہ جو ماضی کے واقعات کا تجزیہ کر کے تاریخ کو عوامی شکل میں لوگوں کے سامنے لائے۔

تاریخ کا کردار قوموں کی زندگی میں اہم ہوتا ہے' کیونکہ یہ ماضی کی تشکیل کرتی ہے۔ اور ماضی کی یہ تشکیل معاشرے کے لوگوں کا ذہن بناتی ہے۔ اگر تاریخ فوج اور حکمراں طبقوں کے کردار کو شاندار طریقہ سے پیش کرے گی' تو اس سے یہ طبقے اور ادارے فائدہ اٹھا کر اپنی بالادستی کو قائم کریں گے اور تاریخ سے اپنے تسلط کا جواز پیش کریں گے۔ اگر تاریخ لوگوں کی جدوجہد اور ان کی کوششوں کو اجاگر کرے گی' تو اس سے معاشرے میں ایسا تاریخی شعور پیدا ہو گا کہ جو جمہوری روایات اور اداروں کو مضبوط کرے گا اور آمرانہ حکومتوں کے راستے کو روکے گا۔

ایک ایسی تاریخ کی ضرورت نہ صرف بنگلہ دیش کو ہے بلکہ تیسری دنیا کے ملکوں کو بھی ہے۔

❁

ہندوستانی اسلام

ڈاکٹر مبارک علی

اسلام کی فتوحات اور پھیلاؤ نے مغرب اور مشرق میں دو علیحدہ علیحدہ روایات کو پیدا کیا۔ اسپین، شمالی افریقہ (مصر، تیونس، الجزائر اور مراکو) اور مشرق وسط میں عربی تہذیب و کلچر کی جڑیں مضبوط ہوئیں۔ عربی زبان اس علاقہ کی زبان بن گئی اور یہاں کے لوگوں کی شناخت بھی عربی ہو گئی۔ اس کے مقابلہ میں جب اسلام ایران میں آیا تو یہاں ایرانی قوم پرستی نے اس کی ہیئت کو بدل دیا۔ مذہب کو تو قبول کیا، مگر تہذیبی اور ثقافتی طور پر ایرانیوں نے اپنی شناخت قائم رکھی۔ عربی زبان کے بجائے فارسی زبان کو اپنایا اور اسی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ اس وجہ سے وسط ایشیا اور ہندوستان میں اسلام ایران کے ذریعہ آیا اس لیے ثقافتی طور پر ان معاشروں پر ایران کے اثرات ہوئے، عرب کے نہیں۔

اس موضوع پر فرانسس روبن سن (Francis Robinson) نے اپنی کتاب (The Ulama of Farangi Mahall and Islamic Culture in South Asia.2001.

فرنگی محل کے علماء اور جنوب ایشیا میں اسلامی کلچر، میں شامل مضامین میں روشنی ڈالی ہے۔

ہندوستان میں جب ترک اور مغل فاتحین آئے تو وہ اپنے ساتھ ایرانی کلچر کو لے کر آئے۔ اس عہد میں فارسی زبان دربار کی زبان تھی، جس کی وجہ سے اہل انتظامیہ اور دانشوروں نے اس زبان کو اختیار کرلیا۔ ہندوستان میں کایستھ اور برہمن دونوں طبقوں نے فارسی سیکھ کر اس میں اس قدر مہارت حاصل کرلی کہ فارسی لغت اور گرامر میں ان کی تحریر شدہ کتابیں آج بھی ایران میں

مستند مانی جاتی ہیں۔ زبان کے ساتھ ہی جو کلچر آیا اس نے ایک طبقہ اعلیٰ کو پیدا کیا کہ جن کا ذہن فارسی زبان کے ادب سے بنا تھا اور دنیا کے بارے میں ان کا نقطہ نظر وہی تھا کہ جو اس زبان کے ادب میں موجود تھا۔ اس نے ایک اشرافیہ کلچر تخلیق کیا کہ جو نچلی ذات کے مسلمانوں سے مختلف تھا۔ حکمراں طبقوں میں سے اکثریت کا تعلق وسط ایشیا اور ایران سے تھا' اس لیے وہ اہل ہندوستان کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتے تھے۔

چونکہ فاتحین اور انتظامیہ کے عہدیدار اپنی فوجی اور سیاسی طاقت و اختیار کی وجہ سے اہمیت رکھتے تھے' اس لیے ان کی رہائش شہروں میں ہوتی تھی۔ یا ان قصبات میں کہ جہاں ان کو جائیدادیں ملی تھیں یا انتظامی امور و درس و تدریس کے لیے انہیں رہنا ہوتا تھا۔ وہ شہر اور قصبات بھی ان کے مراکز تھے کہ جو درگاہوں کی وجہ سے زیارت گاہوں میں بدل گئے تھے۔ اس لحاظ سے شہر اور دیہات کا فرق اس ثقافت میں بہت نمایاں تھا۔

فارسی زبان جب دربار کی زبان بن گئی تو ہندوستان میں جو شاعری' انشاء' سوانح حیات تاریخ' تذکرے' اور وقائع لکھے گئے' وہ اسی زبان میں تھے۔ درس و تدریس کی زبان ہونے کی وجہ سے طلباء وہی کتابیں پڑھتے تھے کہ ایران کے نصاب میں تھیں۔ عربی زبان صرف مذہبی تعلیمات تک محدود رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں عقلی علوم اور منطقی فکر پیدا ہوئی' جو کہ معقولات کہلاتی ہے' خاص طورے مغل عہد میں جب کہ ہندوستان سیاسی طور پر مستحکم ہو چکا تھا۔ دربار کے ذرائع آمدنی بڑھ گئے تھے' اور بادشاہ امراء اس پوزیشن میں تھے کہ ایران سے آنے والے شعراء' مفکرین' اساتذہ' اور علماء کی سرپرستی کر سکیں' تو اس دور میں ایرانی مہاجرین کی برابر آمد ہوتی رہی۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد میں سیالکوٹ اور جونپور خاص طور سے معقولات کے مرکز بن گئے تھے۔ اکبر اور جہاں گیر نے ان علماء اور مفکرین کی سرپرستی کی' جس کی وجہ سے ان علوم میں اضافہ ہوا۔

علوم عقلیہ نے جس رواداری کو پھیلایا' اس میں اس کی مدد کرنے والی صوفیہ کی وہ تحریکیں تھیں کہ جو وحدت الوجود (سب خدا ہے) کی حامی تھیں۔ حکمرانوں کے لیے یہ فکر اور سوچ اس

لیے ضروری تھی کیونکہ انہیں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں' بدھ مت اور جین مت کے ماننے والوں پر حکومت کرنی تھی' اس لیے مذہبی رواداری اور سیکولر سوچ ان کی سیاست کے اہم ستون تھے۔

اکبر اور جہاں گیر کے دور میں اس کے خلاف جو ردعمل ہوا' اس میں شیخ احمد سرہندی اور عبدالحق محدث قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے کوشش کی کہ مسلمانوں کو علیحدہ مذہبی شناخت دے کر انہیں دوسرے مذاہب سے کاٹ دیں۔ صوفیا میں وحدت الوجود کے خلاف وحدت الشہود۔(سب خدا کی طرف سے ہے) کی تبلیغ کی تاکہ مومن اور کافر کا فرق قائم رہے۔

مغل زوال کے بعد یہ ایرانی کلچر ہندوستان کی شیعہ ریاستوں میں رہا۔ اودھ اور بنگال میں مرشد آباد جب 1760ء کی دہائی میں بنگال میں ایسٹ انڈیا کا اقتدار قائم ہوگیا تو ایرانی مہاجرین اودھ ہجرت کر آئے' اودھ میں شیعہ کلچر کو حکمرانوں کی سرپرستی میں زبردست فروغ ہوا اور اودھ کے ایران سے قریبی تعلقات قائم رہے۔

18 ویں صدی میں مغل زوال کے ساتھ ہی جہاں سیاسی کمزوری آئی' وہاں ایرانی کلچر بھی کمزور ہوا' اور اس کی جگہ عربی کلچر اور احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان میں سب سے اہم شاہ ولی اللہ (وفات 1762) ہیں۔ جن کے والد کا قائم کیا ہوا مدرسہ رحیمیہ اس کا مرکز بن گیا۔ وحدت الوجود کی جگہ وحدت الشہود کے نظریہ کی تبلیغ کی گئی' شیعہ اور ایرانی اثرات کے خلاف مہم چلائی گئی۔ جب 1835 میں انگریزوں نے انگریزی زبان کو رواج دیا تو اس کے بعد سے فارسی کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی اور مذہبی کتابیں اردو اور علاقائی زبانوں میں لکھی جانے لگیں۔ جب فارسی کا خاتمہ ہوا ہے تو اس کے ساتھ ہی عقلی علوم بھی ختم ہوگئے اور ان کی جگہ منقولات اور عربی بنیاد پرستی نے لے لی۔

(2)

مدرسہ میں دو قسم کا نصاب ہوتا ہے: منقولات' جس میں حدیث' صرف ونحو' اور قرآن شریف کی تفسیر کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس معقولات میں فقہ' منطق اور عقلی علوم ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں معقولات کا نصاب اورنگ زیب کے عہد میں ملا نظام الدین (وفات 1748) نے

ترتیب دیا تھا' جو اب تک درس نظامیہ کہلاتا ہے۔ اس درس کی یہ اہمیت تھی کہ یہ ان علماء کی تربیت کرتے تھے جو حکومت میں قاضی' مفتی اور محتسب کے عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ ملا نظام الدین کا تعلق فرنگی محل سے تھا۔ اس کی تاریخ یہ ہے کہ 1692 میں ملا قطب الدین کا جائیداد کے سلسلہ میں سہالہ میں قتل ہو گیا۔ اس پر اورنگ زیب نے 1695 میں ان کے چار لڑکوں کو لکھنو میں وہ عمارت دے دی جو ایک فرنگی نے تعمیر کرائی تھی۔ اس مناسبت سے یہ خاندان فرنگی محل مشہور ہو گیا۔ فرنگی محل سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان سے متعلق تھے اور یہ انفرادی طور پر درس و تدریس میں مشغول تھے' فرنگی محل کی شکل مدرسہ کی نہیں تھی کہ جو ایک ادارے کی شکل میں ہو' اس لیے اس کی وجہ شہرت خاندان ہے مدرسہ نہیں' جیسے مدرسہ رحیمیہ میں ولی اللہ کے خاندان کے علاوہ دوسرے اساتذہ بھی ہوتے تھے' یا دیوبند مدرسہ۔ 1905 میں جا کر یہاں ''مدرسہ عالیہ نظامیہ'' قائم ہوا۔

فرنگی محل کے علماء درس و تدریس کے علاوہ پیری و مریدی سے بھی منسلک تھے۔ انہوں نے مذہبی نصاب کے لیے کتابیں لکھیں۔ اس خاندان کے علماء نے 18 اور 19 صدیوں میں مسلمان ریاستوں میں بطور قاضی و مفتی اور دوسری مذہبی خدمات سرانجام دیں۔ ان میں رامپور' مدراس' اور حیدرآباد کی ریاستیں قابل ذکر ہیں۔ جن طلباء نے فرنگی محل کے علماء سے تعلیم حاصل کی تھی' انہوں نے اپنے علاقوں میں مدارس کھولے 19 صدی میں جب برطانوی حکومت کا اقتدار مضبوط ہو گیا تھا' تو اس نے معقولات کی تعلیم کو کمزور کر دیا اور اس کی جگہ منقولات اور احیاء اسلام کی تحریکیں مسلمانوں میں مقبول ہو گئیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اب علماء کے لیے حکومت میں ملازمتوں کے مواقع ختم ہو گئے تھے' اس لیے اب انہوں نے احیاء اسلام کی تحریک کے ذریعہ مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں سے محفوظ رکھنے کی مہم چلائی۔

عہد برطانیہ میں فرنگی محل کے علماء نے انفرادی طور پر جدیدیت کے خلاف رویہ بھی اختیار کیا تو نئے حالات و ماحول میں تبدیلیوں کو قبول بھی کیا۔ مثلاً مولانا عبدالرزاق (وفات 1889) جدیدیت کے سخت خلاف تھے' انگریزوں سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے' نئی اشیا مثلاً شکر اور برف کا استعمال بھی نہیں کرتے تھے۔ ریلوے میں سفر کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ جب کہ ان کے برعکس

مولانا عبدالحق کا استدلال تھا کہ معاشرے میں تبدیلی لازمی ہوتی ہے' اس لیے فتووں کو وقت اور ماحول کے مطابق بدلتے رہنا چاہیے۔ اگر مسجدوں میں بجلی کے پنکھوں کا استعمال ہو تو اس میں حرج نہیں' اسی طرح ٹیلی گرام کے ذریعہ عید کے چاند ہونے کو تسلیم کر لینا چاہیے اور انگریزی زبان سیکھنا بھی وقت کے مطابق ہے۔

فرنگی محل کو اس وقت ہندوستان کی سیاست میں اہمیت ملی کہ جب مولانا عبدالباری نے خلافت تحریک میں حصہ لیا۔ جب جمعیت علماء ہند کا قیام آیا تو مولانا باری کو اس کا پہلا صدر بنایا گیا (1919) دیوبند کے علماء کے برعکس فرنگی محل کے علماء نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا' ان میں جمال میاں فرنگی محل قابل ذکر ہیں۔

موجودہ دور میں فرنگی محل کا خاندان اس وجہ سے کمزور ہو گیا کہ اس کے افراد نے مذہبی تعلیم کو چھوڑ کر جدید تعلیم اور پیشوں کو اختیار کر لیا ہے۔

❁

تبلیغی جماعت

ڈاکٹر مبارک علی

ہندوستان میں اصلاحی تحریکوں کی ابتداء مغل زوال کے دوران اٹھارویں صدی سے شروع ہوئی' ان میں سب سے اہم شخصیت شاہ ولی اللہ (1762) کی ہے کہ جنہوں نے مغل امراء کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کوشش کی کہ اصلاح اوپر سے ہو۔ ان کے نزدیک معاشرے کی اصلاح امراء اور فوجی جنرلز ہی کر سکتے تھے۔ اس کا اظہار ان کے خطوط سے ہوتا ہے کہ جو انہوں نے امراء اور جرنیلوں کو لکھے۔ ان سے مایوس ہو کر انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو یہاں آنے کی دعوت دی تا کہ وہ مرہٹوں کے تسلط سے نجات دلائے۔ شاہ ولی اللہ کا تعلق چونکہ اشرافیہ سے تھا اس لیے ان کے ہاں نچلی ذات کے لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے' بلکہ ایک طرح سے حقارت کا جذبہ ہے' کیونکہ یہ لوگ صحیح اسلام کو نہ تو سمجھتے تھے اور نہ اس پر عمل کرتے تھے۔

دوسری اہم اصلاحی اور جہادی تحریک سید احمد شہید (1831) کی تھی کہ جنہوں نے سرحد میں علماء کی مدد سے جو کہ اشرافیہ سے تعلق رکھتے تھے' ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی' مگر سکھوں کے ہاتھوں شکست نے ان کے منصوبے کو ناکام بنا دیا۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد' ہندوستان کے سیاسی و سماجی اداروں میں تبدیلی آئی کہ جس نے روایتی ڈھانچہ کو کمزور کرنا شروع کر دیا۔ ان تبدیلیوں سے ہندو اور مسلمان دونوں متاثر ہوئے۔ اس موضوع پر یوگندر سکند نے تبلیغی جماعت کی ابتداء اور ڈویلپمنٹ (Origin and Development of the Tablighi jamaat)(1920-2000) پر کتاب لکھی ہے۔ اس میں اول اس پس منظر کا تذکرہ کیا ہے کہ جس کی وجہ سے مسلمان معاشرے میں انگریزی اقتدار کے آنے کے بعد تبدیلیاں آئیں اور انہوں نے آگے چل کر جہاں مختلف

اصلاحی تحریکوں کو پیدا کیا۔ ان میں سے ایک تبلیغی جماعت ہے۔

یوگندر سکند اس تحریک کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے نشاندہی کرتا ہے کہ مسلمان معاشرہ دو طبقوں میں بٹا ہوا تھا: اشراف اور اجلاف۔ اجلاف یا نچلی ذات میں وہ مسلمان شامل تھے کہ جو ہندو مذہب سے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اس لیے ان لوگوں کے ہاں مذہب کی تبدیلی کے باوجود مقامی روایات اور کلچر اسی طرح سے باقی تھا۔ جب کہ ان کے مقابلہ میں اشرافیہ کا تعلق ایران وسط ایشیا اور عربیہ سے تھا۔ ان کے پاس دولت' اقتدار اور مذہب کی خالصیت تھی' اس وجہ سے یہ اجلاف سے اپنا تعلق رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان دونوں طبقوں میں مذہبی وسماجی دوری تھی۔

1857 کی بغاوت میں جب مغل بادشاہت کا خاتمہ ہوا تو اس کے ساتھ وہ نام نہاد حکومت کہ جس کی علامت مغل بادشاہ تھے' وہ بھی ختم ہوگئی اور مسلمان معاشرے خاص طور سے اشرافیہ نے خود کو بے بس اور عدم تحفظ کا شکار پایا۔ اس لیے پہلی مرتبہ انہوں نے اجلاف سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کی طرف توجہ کی۔ اس مقصد کے لیے اشرافیہ نے مدارس میں مذہبی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا' تا کہ ہندوستانی مسلمان جو ہندوانہ رسومات میں جکڑے ہوئے ہیں' انہیں پکا اور صحیح مسلمان بنایا جا سکے۔ 1867 میں دیوبند مدرسہ کا قیام اسی منصوبہ کی ایک کڑی تھا مقصد یہ تھا کہ اجلاف ہندووانہ اور مشرکانہ رسومات ترک کر کے اشرافیہ کے مذہب کے دائرے میں آ کر ایک مضبوط کمیونٹی کی شکل اختیار کریں۔ کیونکہ نئے حالات میں اس بات کی ضرورت تھی کہ انگریزوں اور ہندوؤں سے مقابلہ کے لیے مسلمانوں کو متحدہ ہونا چاہیے۔ اس اتحاد کے لیے ان کا مذہبی طور سے ایک ہونا لازمی تھا۔

ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس وقت احساس ہوا کہ جب 1871 میں پہلی مردم شماری ہوئی۔ اس میں مذہب کے خانہ میں ہر ایک کو اپنے مذہب کے بارے میں بتانا پڑا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں مذہبی شناخت کا احساس پہلی مرتبہ ابھر کر آیا۔ اس کے بعد جب ملازمتوں اور کونسل کی کا سوال آیا تو یہاں بھی مذہبی شناخت کو ابھارا گیا۔ اس لیے اب ہندو اور مسلمان دونوں اپنی تعداد کے بارے میں بڑے حساس ہو گئے۔ اور یہ کوششیں شروع ہوئیں کہ تعداد کو بڑھایا جائے تا کہ ان کے مقابلہ میں دوسرا نہ آسکے۔

اسلام اور ہندو مذہب میں فرق یہ تھا کہ اسلام میں تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کا مذہب تبدیل کیا جاتا تھا' اس نے ہندوستان میں ایک بڑی تعداد مختلف وجوہات کی بنا پر مسلمان ہوگئی تھی۔ اس کے برعکس ہندو مت میں تبدیلی مذہب کا اصول نہیں تھا۔ لہٰذا ہندو راہنماؤں کو یہ احساس ہوا کہ مسلمان تو تبلیغ کے ذریعہ مزید ہندوؤں کو مسلمان کر سکتے ہیں اور یوں ان کی تعداد کم کر کے اپنی تعداد بڑھا لیں گے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے انہوں نے ''شدھی'' یا خالص و پاک کرنا' کے طریقہ کو اختیار کیا۔ یعنی اب تک جو برادریاں یا ہندو مسلمان ہو گئے ہیں' انہیں دوبارہ سے شدھی کر کے ہندو بنایا جائے اس کی ابتداء پنجاب سے آریہ سماج نے کی۔

ابتداء میں انہوں نے فرد کو شدھی کیا۔ مگر اس سے انہیں اندازہ ہوا کہ جب کسی ایک فرد کو شدھی کر دیا جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کا رشتہ و ناطہ اپنی برادری اور خاندان سے ٹوٹ جاتا ہے اور وہ تنہا ہو کر مسائل کا شکار ہو جاتا ہے' اس لیے انہوں نے ایک اور حکمت عملی اختیار کی' وہ یہ کہ فرد کے بجائے پوری برادری کو شدھی کیا جائے' اس سلسلہ میں انہوں نے پہلی کوشش ملکانہ راجپوتوں پر کی' اور 1,63000 لوگوں کو شدھی کر دیا۔ اب ان کی توجہ مسلمان جاٹ اور گجر برادریوں کی طرف تھی۔ ان کا لائحہ عمل یہ تھا کہ غیر ملکی مسلمانوں کو چھوڑ کر سب کو شدھی کر لیا جائے' کیونکہ ان کے آباؤ اجداد کا مذہب ہندو تھا' لہٰذا ان کو دوبارہ سے ہندو بنانا ایک اخلاقی و سماجی فریضہ ہے۔ آریہ سماج کی اس تحریک نے 1920 کی دہائی میں فرقہ وارانہ جذبات کو پیدا کیا۔

اس کا اثر مسلمان معاشرہ پر ہوا۔ پہلا احساس تو ان کا یہ تھا کہ اس سے مسلم اتحاد ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے' لہٰذا اسے بکھرنے سے بچایا جائے۔ دوسرا سوال ان کے ذہن میں یہ آیا کہ آخر اجلاف مسلمان کیوں ہندو ہو رہے ہیں؟ اس سلسلہ میں مختلف جوابات دیئے گئے' مثلاً غلام بھیک نیرنگ کا کہنا تھا کہ انگریزوں نے تاریخ کے ذریعہ نفرت پیدا کی ہے جس کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگے ہیں۔ ایک اور دلیل یہ دی گئی کہ اس سے ہندو مسلم اتحاد کا خاتمہ ہو جائے گا کہ جس کا فائدہ انگریزوں کو ہوگا۔ ایک اور تجزیہ میں کہا گیا کہ چونکہ نچلی ذات کے مسلمان اسلام کی صحیح تعلیم سے واقف نہیں اس لیے وہ ہندو ہو رہے ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ انہیں اسلامی تعلیمات کے ذریعہ پکا مسلمان بنایا جائے۔ اس مقصد کے لیے تبلیغی سرگرمیوں کو شروع کیا جائے۔ خواجہ حسن نظامی اور مولانا عبدالحلیم صدیقی کے مطابق:

تقریباً آٹھ سو سال سے مسلمانوں نے تبلیغ کے بنیادی فریضہ کو چھوڑ رکھا ہے یہ شدھی سبھا کی عنایت ہے کہ ہم اب اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور پہلی مرتبہ ملکانہ اور دوسرے مسلمان بھائیوں کی طرف توجہ کی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے کون تھا کہ جو اپنے آرام کو چھوڑ کر پورے پورے دن گاؤں کا دورہ کرتا تا کہ اسلام کی تبلیغ کر سکے؟

ردعمل کے طور پر مختلف تبلیغی جماعتوں کی بنیاد پڑی' جن میں رضائے محمدی' انجمن خدام صوفیاء' جمعیت علماء ہندو دہلی' جمعیت تبلیغ اسلام' مدرسہ دیو بند' جمعیت مرکز تبلیغ اسلام انبالہ اور قادیانی جماعت قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے تبلیغی جماعت نے مستقل مزاجی سے کام کر کے اپنے وجود کو باقی رکھا جب کہ دوسری جماعتیں آپس کے جھگڑوں اور رقابتوں کا شکار ہو کر ختم ہو گئیں۔

ان تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ نچلی ذات کے مسلمانوں کا پہلی مرتبہ اشرافیہ سے تعلق ہوا' اس سلسلہ میں اشراف کا مقصد یہ تھا کہ اجلاف کو شامل کر کے اپنے تسلط کو قائم کریں اور اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کریں۔

تبلیغ کے سلسلہ میں ایک اہم تبدیلی یہ آئی کہ اب تک مذہبی علماء اور صوفیاء یہ سمجھتے تھے کہ تبلیغ کے اہل وہی ہیں' لیکن اب یہ ان کی اجارہ داری سے نکل کر ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض کر دی گئی کہ وہ تبلیغ میں حصہ لے اور اس سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی (وفات 1955) نے اس پر زور دیا کہ ملکانہ راجپوت مسلمانوں کو دوبارہ سے مسلمان بنانے کے لیے مسلمان راجپوت جاگیرداروں سے مدد لینی چاہیے۔ ان میں مذہبی جذبہ اور جوش پیدا کرنے کے لیے مقبول تہواروں کا اجراء کرنا چاہیے' صوفیا کے معجزوں کا پروپیگنڈا ہونا چاہیے تا کہ لوگ ان کے معتقد ہوں' آریہ سماج کے ردعمل میں اچھوتوں میں تبلیغ کرنے کی ضرورت ہے کہ انہیں مسلمان بنایا جائے تبلیغ کی اس تحریک میں ہر مسلمان کو حصہ لینا چاہیے' چاہے اس کا تعلق کسی پیشہ سے ہو کیونکہ اسلام کو خطرے سے اسی وقت بچایا جا سکتا ہے کہ جب کمیونٹی کا ہر فرد اس ذمہ داری کو سنبھالے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کا جذبہ ایمانی اس وقت اور زیادہ شدت اختیار کرے گا کہ جب رسول اللہؐ کی طاقت وشان وشوکت کا ذکر ہو۔ آپ کی مفلسی اور غربت کے بارے میں نہیں بتانا چاہیے' کیونکہ اس سے نومسلم مرعوب نہیں ہوں گے۔ تبلیغ کے لیے مدارس اور مسجدوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ پمفلٹوں کے ذریعہ اسلام کی تعلیم پھیلانی چاہیے' غریب مسلمانوں

کوسہولتیں دینے کی غرض سے بنکوں کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔

لیکن تبلیغی سلسلہ کو ایک ادارہ کی شکل دینے کا کام مولانا الیاس (وفات 1969) نے کیا ان کے نزدیک ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ تھا کہ وہ مذہب سے دور ہو گئے تھے' اس لیے اولین طور پر ضروری ہے کہ ان میں مذہبی فرائض کی ادائیگی کے بارے میں شعور پیدا کیا جائے۔ انہوں نے دوسری اہم بات یہ کی کہ غیر مسلموں میں تبلیغ کر کے انہیں مسلمان بنانے کے بجائے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں تبلیغ کی جائے اور انہیں مذہب سے آگاہ کر کے راسخ العقیدہ مسلمان بنایا جائے تاکہ وہ مذہب کو ترک نہ کریں بلکہ اس پر قائم رہتے ہوئے اس کا دفاع کریں۔

تبلیغی جماعت کو جن خطوط پر تشکیل دیا گیا' وہ ان مذہبی جماعتوں سے مختلف تھے کہ جو احیاء اسلام اور انقلاب اسلام کی باتیں کرتی تھیں۔ ان کے برعکس تبلیغی جماعت کا مقصد سماجی اور اخلاقی طور پر معاشرے میں تبدیلی لانا تھا۔ احیاء اسلام کی جماعتوں کے برعکس جو رسول اللہ ؐ کی مدینہ زندگی کو ماڈل بناتی ہیں کہ جہاں آپ نے ریاست کی بنیاد ڈالی تھی اور سیاست میں حصہ لیا تھا' تبلیغی جماعت کا ماڈل رسول اللہ کی مکی زندگی ہے کہ جہاں آپ نے تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو مسلمان بنایا تھا۔ مسلمان معاشرے میں اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے یہ چاروں سنی فقہا کو مانتے ہیں اور اجتہاد کے بجائے تقلید پر زور دیتے ہیں۔ تعلیم کے سلسلہ میں وہ ان علوم کو ترجیح دیتے ہیں کہ جو اگلی دنیا کے لیے ہوں' اس لیے وہ جدید علوم کے مخالف ہیں۔ کیونکہ ان کا فائدہ اس دنیا میں ہے۔

ان کے ہاں تحریری مواد بہت کم ہے' تبلیغ کے لیے وہ زبانی بات چیت اور گفتگو کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ نہ تو کسی پبلسٹی کے قائل ہیں اور نہ ہی کوئی اخبار نکالتے ہیں' نہ ہی پمفلٹ چھاپتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''نہ پرچہ' نہ چرچا' نہ خرچہ'' کیونکہ کتابیں پڑھنے کا مطلب بے عملی ہے۔ لہٰذا دنیا کو مسافر خانہ سمجھتے ہوئے مذہبی فرائض پر توجہ دی جائے۔ ان کے نزدیک تاریخ کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

ایک اچھے اور نیک مسلمان ہونے کے لیے جماعت کے ماحول میں اس کی تربیت کرنی چاہیے۔ تربیت میں اسلام کی بنیادی تعلیمات پر زور دیا جاتا ہے' یعنی کلمہ' نماز' ذکر' مراقبہ' زکات' دعا ضروری ہے کہ نیت کو پاک وصاف رکھا جائے' اور فضول باتوں یا تفریحوں میں وقت ضائع نہیں کیا جائے فرائض کی ادائیگی کا ثواب ملے گا' اگر کوئی نیک عمل کرے گا تو ہر ایک عمل کے بدلہ میں اسے

7,000,000 نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ اگر تبلیغ کے سلسلہ میں اس کے منہ سے کوئی اچھا لفظ نکلے گا اتو اسے پورے سال کی عبادت کا ثواب ہوگا' ایک اور جگہ کہا گیا ایک نیکی کا ثواب 49 کروڑ نیک کاموں کے برابر ہوگا۔ اس حساب کتاب کا مقصد یہ تھا کہ عام مسلمان اس سے متاثر ہو کر اپنے اعمال میں اچھائی پیدا کرے۔ فرائض کی ادائیگی کا شعور پیدا کرنے کی غرض سے مولانا زکریا کی کتاب ''فضائل عمل'' ایک لحاظ سے تبلیغی کورس میں ہے۔

تبلیغی جماعت کا مرکز دہلی قرار پایا۔ اس کے بعد جو مراکز تھے ان کے نگراں کو حضرت جی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ تبلیغ کے سلسلہ میں مختلف جماعتیں تشکیل دی جاتی ہیں۔ جو واپس آ کر اپنی کارگزاری پیش کرتی ہیں۔

تبلیغی جماعت اگرچہ دوسری جماعتوں سے متصادم نہیں ہوئی' مگر دوسری جماعتوں نے ان پر تنقید شروع کر دی' مثلاً بریلویوں کا استدلال ہے کہ صوفیاء ذریعہ شفاعت ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کی نجات کے لیے روحانی قوت کی ضرورت ہے۔ جب کہ تبلیغیوں کا کہنا ہے کہ ہر مسلمان مبلغ ہے لہٰذا اسے کسی راہنمائی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک جمہوری سوچ ہے کہ جس میں کسی راہنما کا تسلط نہیں ہے بریلویوں کا یہ بھی اعتراض ہے کہ یہ وہابی ہیں' رسول اللہؐ کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں اسلام کے خلاف ایک سازش ہے' یہ برطانوی' امریکی اور ہندو ایجنٹ ہیں۔

اہل حدیث کی تنقید یہ تھی کہ تبلیغی جماعت راہبانیت کا پرچار کرتی ہے جو کہ غیر اسلامی ہے۔ جماعت اسلامی کا اعتراض ہے کہ ان کے ہاں صرف رسومات پر زور ہے' جہاد کو نہیں مانتے ہیں۔ اور اسلام کو بطور ضابطہ حیات کے بھی قبول نہیں کرتے ہیں۔ سیاست سے دوری کی وجہ سے یہ انقلاب نہیں لا سکتے ہیں۔

تبلیغی جماعت کو سب سے زیادہ کامیابی میو برادری میں ہوئی۔ میو اگرچہ مسلمان ہو گئے تھے مگر انہوں نے اپنے قدیم طرز زندگی' رسومات اور روایات کو نہیں چھوڑا تھا۔ تاریخ میں یہ ہمیشہ سے لڑاکو مشہور تھے۔ چونکہ ان کے اردگرد کا ماحول نہیں بدلا تھا' اس لیے ان کے مزاج اور طرزِ زندگی میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بیسویں صدی میں ان کی معاشی حالت ابتر ہونا شروع ہوئی گورنمنٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق:

> میو کی حالت تیزی سے خراب ہو رہی ہے۔ وہ تقریباً فاقہ زدگی کی حالت میں ہیں۔ جب وہ خشک سالی کا شکار ہوتے ہیں' تو شادی بیاہ تجہیز د

تکفین اور دوسری ضروریات کے لیے ساہوکار سے سود لیتے ہیں' اس موقع پر وہ جو سود کی رقم مقرر کرے یہ اسے قبول کر لیتے ہیں۔

اس صورت حال نے میو مسلمانوں اور ہندو بنیوں اور ساہوکاروں کے درمیان نفرت و عداوت اور علیحدگی کے جذبات کو پیدا کیا۔ دیو بند اور علی گڑھ کے قیام کی وجہ سے میو برادری کا ایک چھوٹا سا طبقہ تعلیم یافتہ بھی ہوا' مگر الور ریاست کے میو غیر تعلیم یافتہ رہے۔ جب 1932ء اور 1934ء میں الور کے میوؤں نے راجہ کے خلاف بغاوت کی' تو اس کی وجہ سے ان کا رابطہ ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں سے ہوا۔ چونکہ ہندوؤں نے ان بغاوتوں میں ان کی مدد نہیں کی' اس لیے ان میں مذہبی شناخت کا احساس ابھرا۔

اس صورت حال سے تبلیغی جماعت نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے میو برادری میں مکتب اور مدرسے کھولے' تبلیغی مشن بھیجے اور ان میں یہ احساس ابھارا کہ انہیں بحثیت مسلمان کے اپنی شناخت قائم کرنی چاہیے۔ لہٰذا اپنا لباس اور طرزِ زندگی کو مسلمانوں کے انداز میں ڈھالنا چاہیے۔ جو مبلغین تبلیغ کے لیے جاتے تھے ان کو ہدایت تھی کہ وہ انتہائی انکساری سے کام لیں اور کسی بھی صورت میں غصہ کا اظہار نہ کریں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میو برادری میں مذہبی و سماجی طور پر تبدیلی آئی۔ میو برادری کا یہ اعتراض تھا کہ تبلیغی جماعت سے پہلے وہ ڈاکو اور مویشی چرانے والے تھے اور آپس میں مسلسل لڑائی میں مصروف رہتے تھے۔ مزاج کے لحاظ سے وہ درشت اور اکھڑ تھے۔ وہ گوبر کے اپلوں کی پوجا کرتے تھے (گوبردھن) ان کا لباس بہت ہی غیر مہذب تھا اور ان کی عورتیں آزادی سے مردوں سے ملتی تھیں' اس وجہ سے اشراف طبقہ کے مسلمانوں میں ان کی کوئی عزت نہیں تھی۔ تبلیغی جماعت نے نہ صرف انہیں اچھا مسلمان بنایا بلکہ انہیں مہذب اور متمدن بھی بنایا۔

اگرچہ یہ تبدیلیاں ضرور آئیں' مگر میو برادری نے اب تک اپنے پرانے رواجوں کو برقرار رکھا ہے جن میں وراثت' شادی بیاہ' اور جہیز کی روایات قابل ذکر ہیں۔ 1947ء کے بعد تبلیغی جماعت ہندوستان و پاکستان میں تقسیم ہوگئی۔

یوگندر نے تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کا ذکر بنگلہ دیش اور برطانیہ میں کیا ہے پاکستان ان کے مطالعہ سے اس لیے خارج رہا کہ انہیں پاکستان آنے کے لیے ویزا نہیں ملا۔

❁

یورپ کی ترقی کیوں اور کیسے ہوئی؟

ڈاکٹر مبارک علی

یورپ کی تاریخ نویسی میں ایک بحث یہ ہے کہ کیا یورپ نے اپنے اندرونی حالات اور تقاضوں کے تحت ترقی کی یا اس کی ترقی میں بیرونی عوامل کا بھی دخل ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا یورپی اقوام خاص صلاحیتوں کی مالک ہیں کہ جن کی وجہ سے انہوں نے دوسری قوموں پر برتری حاصل کر لی یا وہ دوسری اقوام ہی کی طرح ہیں مگر سازگار حالات نے ان کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے وہ دوسری قوموں سے آگے بڑھ گئے؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا یورپ کی ترقی ایک معجزہ ہے' یا یہ معجزہ نہیں ہے بلکہ اس کی ترقی کے اسباب و وجوہات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے؟ یورپ کی برتری کو تسلیم کرنے والے تاریخ کو یورپ کی مرکزیت (Eurcentrism) کے تحت لکھتے ہیں۔ جے۔ایم۔بلاٹ (J.M.Blaut) ان میں سے ہے کہ جس نے اس کو چیلنج کیا ہے۔

اس کی کتاب ''1492 ' کولونیل ازم او ریورپی مرکزیت اور تاریخ پر ایک مباحثہ''

1492: The Debate on Colonialsim, Eurocentrism and History.(1992)

امریکہ کی دریافت کے بعد اگرچہ پانچ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے' مگر اب تک اس ثقافتی ارتقاء کے بارے میں پوری طرح سے تحقیق اور اندازہ نہیں لگایا گیا ہے۔ امریکہ کی دریافت کو عام طور سے یورپ کے عروج سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ کہ کیوں سرمایہ دارانہ نظام یورپ میں ابھرا اور کیوں یہ دوسرے ملکوں میں قائم نہیں ہو سکا؟ اور یہ کہ سرمایہ دارانہ نظام آخر کیوں سترہویں صدی میں پیدا ہوا؟ 1492 نے دنیا کو ایک مرکز (Centre) اور حاشیہ (Periphry) میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔

1492 سے پہلے کلچر کا ارتقاء مشرق میں ہو رہا تھا اور یہ وہ دور تھا کہ جب ایشیا' افریقہ اور یورپ کئی مراکز میں بٹے ہوئے تھے۔ فیوڈل ازم کے ذریعہ ایک عمومی قسم کے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف رواں دواں تھے۔ ان تینوں علاقوں کے ممالک اس وقت یکساں قسم کی ترقی کے مراحل میں تھے اور ان کا پیدواری نظام بھی ایک ہی قسم کی سمت میں تھا اور یہ سب اپنے اپنے دائروں اور مراکز میں سرمایہدارانہ نظام کی تشکیل میں مصروف تھے۔ یورپ کسی بھی صورت میں نہ تو ایشیا افریقہ سے ترقی کی راہ میں آگے تھا اور نہ ہی اس کے معاشرے میں ایسی وجوہات تھیں کہ جو اسے دوسروں پر فوقیت دے سکیں۔

1492 کے بعد سے دنیا میں یورپ کا عروج ہوا' اس عروج کے پس منظر میں 1492 نے اہم کردار ادا کیا ہے کیونکہ اس نے ایسے تاریخی عوامل کو پیدا کیا کہ جن کی وجہ سے یورپ کو سرمایہ دارانہ نظام کے ان عناصر کو تقویت ملی کہ جنہوں نے یورپ سے فیوڈل ازم کا خاتمہ کیا اور ان دوسرے علاقوں سے کہ جہاں ماقبل سرمایہ دارانہ عناصر تھے انہیں تباہ و برباد کر کے اپنی فوقیت کو قائم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 17 صدی کے خاتمہ پر 1492 کے دوسو سال بعد سرمایہ دارانہ نظام نے یورپ کے چند ملکوں میں سیاسی وسماجی تسلط حاصل کر لیا اور اس کے ساتھ ہی افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کو نوآبادیات بنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس مرحلہ سے یورپ نے دنیا پر اپنا اقتدار قائم کر کے ترقی اور ڈویلپمنٹ کے لیے دنیا کی راہنمائی کرنے لگا۔ اس کے بعد دنیا کا منظر نامہ تبدیل ہو گیا اور ترقی غیر مساوی ہوگئی' اس کے بعد سے یہ غیر مساوی ترقی آج تک جاری ہے۔

اس میں کسی کو شبہ نہیں کہ امریکہ کی دریافت اور اس کے استحصال کے نتیجہ میں یورپ کو عروج ہوا۔ بلاٹ اپنے نقطہ نظر کے ثبوت میں چار دلائل دیتا ہے۔

1- یہ اس بات سے انکار ہے کہ 1492 سے پہلے یورپ کو کسی بھی لحاظ سے افریقہ اور ایشیا کے ممالک پر سرمایہ دارانہ اور جدیدیت کی جانب ترقی کرنے پر فوقیت تھی قرون وسطی کا یورپ ایشیا و افریقہ کے مقابلہ میں قطعی ترقی یافتہ نہیں تھا' اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے پاس کوئی خاص طاقت وقوت اور صلاحیت تھی اور نہ ہی عقلیت کا کوئی مخصوص عنصر تھا اور نہ ہی مہم جوئی کی علیحدہ سے خصوصیت تھی۔

2- کولونیل ازم ایک تاریخی عمل کے طور پر ابھرا اور اس تاریخی تبدیلی کے نتیجہ میں پیدا ہوا کہ

جس نے یورپ کو اور سرمایہ دارانہ نظام کو پیدا کیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی تشکیل بہر حال ایک لازمی امر تھا۔ لیکن یہ عمل وقت کے ساتھ ساتھ کئی ملکوں میں ہوتا نہ کہ صرف یورپ کو اس پر اجارہ داری ہوتی، یورپ میں اس کی تشکیل کا ایک اہم سبب امریکی براعظم پر قبضہ تھا۔ اس کے بعد سے سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام کے لیے کولونیل ازم ضروری ہو گیا۔ لہٰذا دیکھا جائے تو 1492 کے بعد سے سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اہم عنصر کولونیل ازم ہے جو کہ کسی نہ کسی شکل میں اب تک موجود ہے۔

3- 16 اور 17 صدیوں میں امریکہ کو تباہ کن طریقہ سے یورپیوں نے استحصال کیا، جس کی وجہ سے انہیں سرمایہ کا بڑا حصہ ملا۔ اب تک اس حقیقت کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

4- بلاٹ روایتی مارکسسٹوں کے نقطہ نظر سے اختلاف کرتا ہے جو کہ روایتی قدامت پرستوں کی مانند اس پر یقین رکھتے ہیں کہ یورپی سرمایہ داری کے نظام کو اس کے اندرونی عناصر میں تلاش کرنا چاہیے جو کہ اس کے معاشرے میں متحرک تھے۔ اگر دیکھا جائے تو یورپ میں کسی بھی طرح ''فیوڈل ازم سے سرمایہ داری کی تشکیل میں کوئی عمل وجود میں نہیں آیا۔ اس کے مقابلہ میں ایک واضح خلا ہے، جو کہ قرون وسطی کے یورپ اور اور یورپ کے بورژوا انقلاب کے درمیان ہے۔ اس خلاء کو 1492 سے ذرا پہلے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد سے اچانک انقلابی تبدیلیوں کو دیکھتے ہیں، لہٰذا اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یورپ ایک مرحلہ سے دوسرے میں تاریخی عمل کے نتیجہ میں داخل نہیں ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ 1492 سے پہلے یورپ کے معاشرے میں فیوڈل پیداواری نظام میں تبدیلی ضرور آ رہی تھی، لیکن یہ تبدیلی پورے براعظم میں ایک وسیع اسکیل میں ہو رہی تھی۔ لہٰذا جب یورپ کی تاریخ میں سرمایہ دارانہ نظام کی ابتداء کو دیکھا جاتا ہے تو مختلف مارکسٹ ماڈلز سامنے آتے ہیں۔ مثلاً یورپ کے دیہاتی علاقوں میں فیوڈل ازم کا زوال اور یورپ میں شہروں کا ابھرنا وغیرہ، لیکن درحقیقت ان کی کمزوری یہ ہے کہ یہ محدود دائرے میں رہتے ہوئے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہیں، جب کہ تبدیلی کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

کتب خانے ان تاریخی کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں کہ جنہوں نے روایتی انداز میں تاریخ کے اس پہلو کا جائزہ لیا ہے۔ بلاٹ اس نقطہ نظر کی تردید کرتا ہے۔ خاص طور سے دو نقطہا نے

نظر۔ اول یہ کہ 1492 سے پہلے یورپ ایشیا و افریقہ پر برتری رکھتا تھا۔ دوم یہ کہ یورپ سے باہر کی دنیا نے 1492 کے بعد کلچرل ترقی میں کوئی زیادہ حصہ نہیں لیا' اس کا مطلب یہ ہوا کہ کولونیل ازم دنیا کی تاریخ کا ایک غیر اہم عمل تھا اس لیے 1492 کے بعد سے اب تک اس کو وجہ (Cause) قرار نہیں دینا چاہیے۔ بلکہ یہ 1492 کے بعد کے حالات کا اثر ہے۔

لیکن موجودہ تاریخ کی تحقیق ان نظریات کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتی ہے' ان کی حمایت ان دلائل اور تجربات سے آتی ہے کہ جس کا پوری طرح سے عمل طور پر تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ یورپ کی برتری ان مفروضات کی شکل میں موجودہ زمانے تک وراثت میں آئی ہے کہ جب کسی بھی جانب سے اس کی برتری کو چیلنج نہیں کیا گیا تھا اور اسے بلا کسی تجزیہ کے تسلیم کر لیا گیا۔

تاریخ میں ایسا مواد بڑی تعداد میں موجود ہے کہ جس کے ذریعہ اس تبدیلی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جو قرون وسطی میں یورپ کے معاشرے میں ہو رہی تھی۔ دسویں صدی کے بعد سے جدیدیت کے ان رجحانات کو دیکھا جا سکتا ہے کہ جو یورپ میں ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ مثلاً شہروں کی آبادی بڑھ رہی تھی اور وہ ایک طاقتور پوزیشن حاصل کر رہے تھے' فیوڈل سوسائٹی میں اندرونی تبدیلیاں آرہیں تھیں جو کہ اس کے زوال کی علامت تھیں' دور دراز کے علاقوں سے تجارت جو کہ بحری اور خشکی راستوں سے ہو رہی تھی' اس میں تیز رفتاری سے ترقی ہو رہی تھی۔ ان تمام حقائق کو تاریخی تحقیق میں بتایا گیا ہے۔ لیکن ان تبدیلیوں کی وجہ سے کلچر کے ارتقاء میں کیا ہو رہا تھا؟ اور اس کا کیا مقصد تھا؟ اس کا مقصد تھا کہ ان تبدیلیوں اور عوامل کی وجہ سے یورپ کے معاشرے میں نظام پیداوار بدلا جائے۔ یہ تبدیلی آہستگی کے ساتھ ہوئی لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ارتقائی تبدیلیاں کیا صرف یورپ میں ہو رہیں تھیں؟ تاریخ میں ایسی شہادتیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ عمل صرف یورپ میں ہی نہیں ہو رہا تھا۔ یورپ میں اس تبدیلی کے پس منظر میں دو عناصر کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یورپ کی تبدیلی کا ایک سبب وہ حالات و واقعات تھے کہ جو اس سے باہر ہو رہے تھے' اس لیے یورپ کی تاریخ میں اندرونی طور پر تبدیلی کی وجوہات نہیں تھیں لیکن یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ جو واقعات یورپ سے باہر ہو رہے تھے تو ان کے ان ملکوں پر کیا اثرات تھے کہ جہاں پر یہ ہو رہے تھے؟

بہرحال یہ ایک مشکل کام ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ یورپ کی تاریخ میں کس مرحلہ پر

ارتقائی تبدیلی کا آغاز ہوا' 1492 سے پہلے یا بعد میں؟

یہ نقطہ نظر کہ یورپ 1492 سے پہلے تاریخ کے ہر دور میں سب سے آگے رہا ہے' یہ ہمارے خیالات و سوچ و فکر کا ایک حصہ بن چکا ہے اور تاریخ سے متعلق جو بھی ہماری روایات ہیں۔ ان میں یہ گہرائی کے ساتھ موجود ہے' اسے یورپی مرکزیت کا نقطہ نظر کہا جاتا ہے پھیلاؤ (Diffusionism) کا ایک پیچیدہ عمل ہے اور اس کی تاریخ بھی الجھی ہوئی ہے' لیکن اس کے اثرات بالکل واضح ہیں۔ اس تھیوری کی تشکیل انیسویں صدی میں ہوئی کہ جس کے ذریعہ یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقاء کا مطالعہ کیا گیا' لیکن اس سے زیادہ یہ کہ اس نے کولونیل ازم کے عمل کی حمایت کی۔ اس کی خاص خاص باتیں درج ذیل ہیں۔

1- یہ ایک منطقی عمل ہے کہ کلچر کے ارتقاء کو یورپ میں ترقی کرتا ہوا دیکھا جائے۔

2- یورپ اور اس کے کلچر میں ترقی کا اہم سبب وہ اندرونی قوت یا عنصر ہے کہ جو کہ اس معاشرہ کی علمی و روحانی زندگی کا حصہ ہے اور یہی وہ عنصر ہے کہ جس نے ایجادات میں حصہ لیا (یہ ایجادات چاہے سماجی ہوں یا ٹکنالوجیکل) ان ایجادات میں عقلیت' تخلیقی صلاحیت اور نیک عمل شامل تھے۔

3- یورپ سے باہر اس کلچرل ترقی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی' کیونکہ غیر یورپی معاشرے جمود اور روایت پرستی کا شکار تھے۔

4- اگر غیر یورپی ممالک میں کوئی ترقی ہوئی ہے تو ان یورپی اثرات کی وجہ سے جن سے یہ ممالک اثر انداز ہوئے' یا جو ایجادات یورپ میں ہوئیں وہ ان ملکوں تک پہنچیں اور انہوں نے معاشرے میں تبدیلی کی۔

5- یورپ اور غیر یورپی ملکوں کے درمیان جو اثرات ہوئے وہ باہمی رابطہ کی وجہ سے ہوئے جس کی وجہ سے نئے خیالات اور قدروں سے غیر یورپی متاثر ہوئے۔ لیکن جہاں غیر یورپی ملکوں نے یورپی اثرات لیے' اہل یورپ بھی ان سے متاثر ہوئے اور ان سے بدلے میں جو کچھ لیا اس میں کالا جادو' بربریت اور ڈراکولا قسم کی چیزیں تھیں جن کا تعلق پس ماندگی' غیر متمدن زندگی اور ٹھہرے ہوئے معاشروں سے تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یورپ کی حیثیت مرکزی (Core) رہی ہے جب کہ دوسرے ممالک ابتدا ہی سے پسماندہ

اور پچھڑے ہوئے رہے ہیں۔

لہٰذا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یورپ ایجاد کرتا ہے' دوسرے اس کی تقلید کرتے ہیں' یورپ آگے بڑھتا ہے دوسرے اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اس طرح سے پھیلاؤ کی تھیوری یورپ کو غیر یورپی ممالک پر فوقیت دے دیتی ہے اور یہ اس خیال کو تقویت دیتی ہے کہ یورپ کے علمی اور اخلاقی اقدار کی وجہ سے غیر یورپی معاشروں میں ترقی ہوئی ہے۔ لیکن جب یورپ کی تاریخ کو اس کے اندرونی عناصر کی روشنی میں مطالعہ کیا جاتا ہے' اس کے معاشرے اور اس کے ماضی و حال کو دیکھا جاتا ہے تو اس میں تضادات نظر آتے ہیں۔ مگر یورپی اثرات کے پھیلاؤ کے نظریہ کے تحت ایک تنگ سرنگ والا تاریخی شعور ابھر کر آتا ہے۔ اگر تاریخ کے اس سرنگ والے نقطہ نظر کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے باہر دنیا چٹانوں اور پتھروں میں گھری ہوئی اور تبدیلی کے عمل سے دور ہے۔ یہ دنیا غیر یورپی ممالک کی ہے کہ جو مرکز کے حاشیہ پر ہیں۔ یورپ کی قرون وسطیٰ کی تاریخ کو اسی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس سے پہلے کے جن مورخوں نے اس پر لکھا ہے' انہوں نے سنجیدگی سے یورپ کے باہر کچھ نہیں دیکھا اور یورپ کا دوسرے ممالک سے غیر منصفانہ طور پر مقابلہ کیا ہے۔ آج بھی جب یورپی مورخ قرون وسطیٰ کی تاریخ پر تحقیق کرتے ہیں تو وہ انہیں خیالات کی روشنی میں دلائل لاتے ہیں جو کہ کولونیل دور کے مورخوں نے دیئے تھے اور وہی پرانے پھیلاؤ والے نظریہ کو دہراتے ہیں کہ جن سے دوسرے متاثر ہوئے جس کے تحت وہ ''ایشیا کے جمود'' اور افریقہ کی بربریت کی بات کرتے ہیں لہٰذا دیکھا جائے تو تاریخ کی تنگی اور سرنگ والی ذہنیت اب بھی باقی ہے اور آج کے موجودہ مورخ بھی یہ بات کرتے ہیں کہ رقی کا دارومدار یورپی لوگوں پر ہے۔ جہاں کہیں بھی وہ آباد ہوں وہاں ترقی ہوتی ہے اور جہاں کہیں وہ تاریخی عمل میں شریک ہوتے ہیں' وہاں معاشرہ آگے بڑھتا ہے۔

دوسری تھیوری اس سے بھی زیادہ نازک ہے' جیسا کہ پھیلاؤ کے نظریہ میں کہا گیا ہے کہ یورپ کی علمی و روحانی اثرات کے پھیلاؤ نے اپنے اثرات کے تحت دنیا کی ترقی میں حصہ لیا' اور یہی وہ صلاحیتیں تھیں کہ جن کی وجہ سے یورپ کی ترقی ہوئی۔ دو صدیوں پہلے یہ تصور تھا کہ خدا اور اس کا چرچ ترقی کا منبع ہے' لہٰذا ایک نیک عیسائی کے لیے یہ ایک قابل قبول نظریہ ہے کہ اس کا خدا جس کی وہ عبادت کرتا ہے' وہ اسے صراط مستقیم پر چلائے گا' لہٰذا یہ عیسائیوں کا فریضہ ہے کہ وہ

تہذیب کو آگے بڑھائیں، یہ تصور اس طرح سے ذہنوں پر اثر انداز ہوا کہ یورپی یہ یقین کرنے لگے کہ ان میں ایسی تخلیقی قوتیں کہ جن کو بروئے کار لا کر انہوں نے اپنے ہاں تبدیلیاں کیں۔ مارکس کے آنے سے پہلے تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ غیر یورپی دنیا میں جو بھی تبدیلی ہوئی ہے اس کا سبب یورپ ہے۔ لیکن مارکس اور اینگلز نے جو کچھ ''جرمن آئیڈیالوجی'' میں کہا ہے اس کے باوجود اب تک یورپ کے عقلی اور اخلاقی اثرات اور ان کے تسلط کو بڑے حلقوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس وقت ''یورپی معجزہ'' کی تھیوری کی بنیاد یورپ کی عقلیت اور جدت پسندی پر مبنی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ یورپ کی ایجادانہ صلاحیت تھی کہ جس نے قرون وسطی کے یورپ میں ٹکنالوجی کو فروغ دیا اور اس ٹکنالوجی نے یورپ کے معاشرے کو تبدیل کرنے میں مدد دی۔ اس طرح سے سماجی ساخت کو بھی اہل یورپ نے نئی تشکیل دی۔ جس میں ان کی جدت پسندی اور تحقیقی صلاحیتوں کا دخل تھا۔

چونکہ اب تک قرون وسطی اور جدید یورپ کو پھیلاؤ والے نظریہ کے تحت دیکھا گیا ہے، اس کے مقابلہ میں کوئی اور تھیوری نہیں اس لیے اسے ہی صحیح تسلیم کر لیا گیا ہے۔ جیسا کہ سماجی علوم کے ماہرین جانتے ہیں کہ کسی تھیوری پر اس وقت نہ تو تنقید کی جا سکتی ہے، اور نہ ہی پوری طرح تجزیہ کیا جا سکتا ہے، جب تک کہ کوئی متبادل تھیوری نہ ہو۔ اگرچہ اس قسم کی متبادل تھیوریز کی کمی نہیں کہ جنہوں نے یورپ میں 1492 سے پہلے اور بعد میں سرمایہ داری کے عروج کے بارے میں مطالعہ کیا ہے مثلاً ایک تھیوری میں کہا گیا ہے سرمایہ داری اور جدیدیت، یورپ، افریقہ اور ایشیا کے ممالک میں یکساں طور پر باعمل تھی، تبدیلی اس وقت اور اس مرحلہ پر آئی کہ جب یورپیوں نے امریکہ کو دریافت کر لیا، اس کے نتیجہ میں جس کولونیل ازم کی ابتداء ہوئی اس نے اہل یورپ کو ایک نئی قوت اور توانائی دی۔

لیکن اس کے علاوہ دوسری اور تھیوریز بھی ہیں کہ جو ''یورپی معجزہ'' سے انکار کرتی ہیں۔ مثلاً کچھ مارکسٹ اسکالرز کا کہنا ہے کہ سترہویں صدی میں اہل یورپ کو بہت محدود وسائل حاصل تھے کہ جو اسے سرمایہ داری کی جانب لے جا سکتے تھے یہ وہ وسائل تھے کہ جو دوسرے ممالک کو بھی حاصل تھے، لیکن جب شمالی مغربی یورپ میں بورژوا تسلط قائم ہوا تو یہ ایک ایسا عمل تھا کہ جو دوسرے ملکوں میں نہیں ہوا اس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام میں تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی اور یہ

عمل صنعتی انقلاب سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔

دوسری تھیوری کے تحت یورپ نے اپنے ہاں سے فیوڈل ازم کا خاتمہ کر دیا' اس کی وجہ یہ تھی کہ فیوڈل ازم نے معاشرے کو پسماندہ بنا کر یورپ کو حاشیہ پر رکھ دیا تھا' اس کی وجہ سے سیاسی عدم استحکام تھا ان وجوہات نے فیوڈل ازم کے ادارے کو کمزور کر کے اس خاتمہ کا اعلان کر دیا' اور اس کے ساتھ ہی سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں پڑیں۔

تیسری تھیوری میں یورپی کلچر میں جدیدیت اور تہذیب اور ترقی کی اعلیٰ خصوصیات نہیں تھیں' بلکہ اس کے مقابلہ میں یہ جارحانہ اور بربریت کی حامل تھی۔ جب کہ مشرقی ممالک کے کلچر میں یہ عوامل نہیں تھے۔ لہٰذا اہل یورپ کا دوسرے ملکوں پر حملے کرنا ان پر قبضہ کرنا اور ان کو لوٹنا یہ وہ عوامل تھے کہ جن کی بنیاد پر ان کا کلچر کی پیدا ہوا' اس نے انہیں جو وسائل مہیا کیے ان کی بنیاد پر ان کا عروج ہوا۔

انیسویں صدی کا کوئی بھی اسکالر ایسا ہوگا کہ جسے یورپ کی تاریخی برتری سے انکار ہو' یہاں تک کہ مارکس اور اینگلز بھی اس خیال کے قریب قریب ہیں۔ انھوں نے یورپ کو ایک ایسی تہذیب قرار دیا کہ جس نے سب سے پہلے طبقاتی پیداواری نظام کو تشکیل دیا' جس کی اہم وجہ اس کا فطری ماحول تھا۔ ایشیا خشک تھا اس لیے ایشیا کے لوگوں کو آبپاشی کے نظام پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے انہیں ان طاقتوں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا کہ جو پانی کی تقسیم کے انچارج اور پانی کے ذخائر کے محافظ تھے۔ یہ ایک ایسا طاقت اور اختیارات کا نظام تھا کہ جو طبقاتی ریاست سے مختلف تھا۔ کاشتکار اس شکل میں کسی طبقہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اس وجہ سے ان معاشروں میں کوئی طبقاتی تضادات یا جھگڑے نہیں تھے' یہ وہ اہم عنصر ہے کہ جو مارکسی تھیوری میں ترقی کو آگے بڑھاتا ہے۔ اس لحاظ سے غیر یورپی ملکوں میں غلامی سے فیوڈل مرحلے میں کوئی ارتقاء نہیں ہوا' اور نہ ہی فیوڈل ازم سے سرمایہ دارانہ نظام میں ارتقاء ہوا ٹروپیکل ممالک میں فطرت اس قدر افراط سے پیداوار میں حصہ لیتی ہے کہ یہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہو جاتا ہے۔ یورپ کی کامیابی اس لیے ہوئی کہ اس کا فطری ماحول مختلف تھا۔ اس تھیوری کی کمزوری یہ ہے کہ اس میں یورپ کی قدیم تاریخ اور بعد میں پیدا ہونے والی ہر ترقی کے درمیان کوئی تجزیہ نہیں ہے اور نہ یورپی ذہن کا اس تناظر میں مطالعہ کیا گیا ہے۔

بعد میں آنے والے مارکسیٹ اور نیو مارکسٹ لکھنے والوں نے شاید اس خیال سے کہ اہل یورپ کی برتری کو کلچرل' نظریاتی یا ماحولیات کے نقطہ نظر سے نہ دیکھا جائے' اس وجہ سے وہ یورپ کی ترقی کے مسئلہ کا خاطر خواہ جواب نہ دے دیں۔ ان میں کچھ نے اس کی نشاندہی کی ہے کہ تیرہویں صدی میں یورپ' ایشیا اور افریقہ کے کچھ ممالک کو ایک سطح پر رکھا جا سکتا ہے۔

نیو مارکسٹ اسکالرز کی دلیل ہے کہ کلاسیکل عہد کے یورپ کہ جن کا معاشرہ فیوڈل ازم کے انفراسٹرکچر پر تھا وہ تجزیاتی ذہن رکھتے تھے اور اس وجہ سے قرون وسطی کے یورپ میں علیحدہ قسم کی ترقی ہوئی۔ ان میں کچھ نے نشاندہی کی ہے کہ شمالی مغربی یورپ میں سرف اور فیوڈلز کے درمیان طبقاتی جنگ نے آبادی کو گھٹا دیا اور یہ فیوڈل ازم کے زوال کا سبب ہوا۔ اس جنگ میں کسان کامیاب ہوئے اور چھوٹے زمیندار بن گئے۔ اس سے مطمئن ہو کر انہوں نے ایجادات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ صرف انگلینڈ میں فیوڈل لارڈز نے اپنا تسلط برقرار رکھا اور کسان ان کے مزارع رہے۔ اس نے کسانوں کو تقسیم کر دیا۔ وہ بے زمین کسان جو کہ پیداوار میں حصہ لیتے تھے اور وہ مزارع کہ جن کے پاس پٹے پر زمین تھی' چونکہ انہیں معاوضہ دینا ہوتا تھا' اس لیے یہ اس پر مجبور ہوئے کہ زمین اور پیداوار کو تجارتی بنائیں' ٹکنالوجی میں ایجادات کریں اور سرمایہ داری کو فروغ دیں لہٰذا انگلینڈ میں یومین ٹینٹ (Youmen Tenant) سرمایہ داری کے بانیوں میں سے تھے۔ اس کو اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ: سرمایہ داری کو عروج ہوا کیونکہ انگلینڈ کا کسان طبقاتی جدوجہد میں شکست کھا گیا تھا اس تھیوری کو اس طرح سے رد کیا جا سکتا ہے کہ انگلینڈ سے ملحق ممالک میں کسان زمین کے مالک نہیں تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام شہروں میں اور ان کے اردگرد کے ماحول میں ابھرا ہے نہ کہ دیہی علاقے میں۔ اس طرح ٹکنالوجی کی ایجادات 14 اور 15 صدیوں کے بجائے بعد میں ہوئی تھیں۔

یورپ کی برتری کے بارے میں میکس ویبر (M. Weber) نے یہ دلیل دی ہے کہ اول تو یورپی اقوام میں عقلیت کا جذبہ ہے' جو دوسری اقوام میں نہیں' دوسرے یورپ میں فیوڈل نظام نجی جائیداد پر تھا' جب کہ غیر یورپی ممالک میں جاگیر ملازمت کے دوران دی جاتی تھی اس وجہ سے یورپ کو ترقی کرنے میں دوسروں پر فوقیت ہوئی۔

بلاٹ کا استدلال ہے کہ 1492 سے پہلے ایشیا و افریقہ کے کچھ ممالک اور یورپ میں

فیوڈل ازم تنزل پذیر تھا اور سرمایہ دارانہ نظام ابھر رہا تھا' اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام صرف یورپ میں کامیاب ہوا۔ بلاٹ کا کہنا ہے کہ یورپ کے عروج میں امریکہ کی دریافت اس پر قبضہ اور اس کے ذرائع کا استحصال ہے۔ یہ وہ اہم موڑ تھا' کہ جس سے ایشیا و افریقہ کے ممالک محروم رہے۔

یورپیوں نے افریقہ اس لیے دریافت کیا کیونکہ جغرافیائی طور پر یہ اس کے قریب تھے ورنہ جہاں تک بحری صلاحیتوں' ٹکنالوجی یا مہم جوئی کا سوال ہے تو یہ خصوصیات اس وقت دوسری اقوام میں بھی تھیں۔ عرب' ہندوستانی' افریقی اور چینی قرون وسطی میں لمبے بحری سفر کرتے تھے اور تجارت کے لیے دور دراز کے ملکوں میں جاتے تھے۔

امریکہ کی دریافت اور اس پر قبضہ کی وجہ سے اہل یورپ نے اس کی قیمتی معدنیات کو حاصل کر کے ان کو استعمال کیا۔ یہاں معدنیات کی کانوں میں اول مقامی باشندوں کی محنت و مزدوری کو استعمال کیا اس کے بعد افریقہ سے غلام لا کر ان سے مشقت کرائی۔ مزید برآں یورپ نے اپنی آبادی کو منتقل کر کے اپنا بوجھ کم کر لیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر یورپ نے ترقی کی' سرمایہ دارانہ نظام کو پھیلایا اور اس کی ترقی کے لیے کولونیل ازم کی ابتداء کی۔

❁

نقطہ نظر

تاریخی ناول

مصطفیٰ کریم

کسی ادبی محفل میں مجھ سے پوچھا گیا کہ تاریخی ناول ادیب کو لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بہتر تو یہ ہوتا اگر پوچھا جاتا کہ ناول کا لکھنا کیوں ضروری ہے جب کہ اس پر دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور اب سنجیدہ ادبی کتابیں پڑھتا کون ہے' اس لیے ناول کی جانب کس کی توجہ جائیگی؟ درحقیقت ادبی تخلیق کا تعلق دیگر فنون کی طرح انسان کی حساس طبیعت سے ہے۔ اسے جب بھی کسی واقعے یا کردار سے اپنی جذباتی دنیا میں ہلچل کا احساس ہوتا ہے تو اس اضطراب کا اظہار اس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ابلاغ انسان کی شدید ضرورت رہی ہے۔ اس لیے یہ لکھنا غلط نہیں ہوگا کہ ادبی تخلیق ادیب کی خاموش گفتگو ہے جس کا خاموش جواب قاری کے ذہن میں بلند ہوتا ہے۔ یہ جواب کبھی ادیب تک پہنچتا ہے اور کبھی نہیں۔ معاشرے میں فکری تعطل ہو یا خلفشار' ادب کی بے وقعتی یا ناقدری ہو' مکاری اور عیاری سے گھٹیا ادیب اپنی شہرت بٹورتے ہوں' سنجیدہ ادیب اپنی تخلیقی کاوشوں سے باز نہیں آئے گا۔

ہر افسانہ نگار ناول بھی لکھ سکتا ہے۔ گو اچھا افسانہ لکھنا اس فن کے اختصار کی وجہ سے مشکل کام ہے۔ پھر بھی کبھی کبھی فکشن کے ادیب کو محسوس ہوتا ہے کہ جو موضوع اس کے ذہن میں ہے وہ اپنی وسعت اور گہرائی کی وجہ سے افسانے میں نہیں سما سکتا۔ طویل افسانے میں بھی کئی کردار ہوتے ہیں' ان کی اہمیت بھی ہوتی ہے' یہی معاملہ افسانے کے واقعات کا بھی ہوتا ہے۔ لیکن ان کی پیچیدگیوں کو طویل افسانے میں نبھانا ناممکن ہوتا ہے۔ اس لیے افسانہ نگار ایسے موضوع پر قلم نہیں اٹھاتا۔ اور اگر کسی وجہ سے ایک عہد اس کی نگاہ کے سامنے ہو اور وہ اسے قاری کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے' پھر مختصر یا طویل افسانہ اس کا متحمل نہیں ہوتا۔

ایک تاریخ داں کی طرح ادیب بھی مورخ ہوتا ہے۔ آج ادیب جس واقعے یا کردار کو دام تحریر میں لا رہا ہے وہ کل تاریخ بن چکا ہوگا۔ گو یہ عین ممکن ہے تاریخ داں کی نگاہ میں یہ ایک عام

انسان ہو اور واقعہ بھی اہم نہ ہو' نیز شب و روز کی ہماہمی انہیں اس طرح روندتی ہوئی گزر گئی ہے کہ تاریخ داں کیا اس کردار کے شہر کے شہری بھی اس کردار سے ناواقف ہوں۔ پھر بھی ادیب نے معاشریم یں ایک دھماکے کو بیان کر دیا ہے' جس کا اثر محدود ہی سہی لیکن ہوتا ضرور ہے۔ اس کے علاوہ ایسے ناول بھی تحریر ہوتے ہیں جو ان افراد کا احاطہ کرتے ہیں جن کی زندگی تاریخی واقعات سے متاثر ہوتی ہے۔

کبھی کبھی ادیب بھی ان کرداروں اور واقعات کو دام خیال میں لاتا ہے جو تاریخ دانوں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ لیکن مورخوں کے برخلاف وہ ان کرداروں کی روح میں جھانکتا ہے۔ ان کے جذبات کی گہرائی اور تصادم کو تحریر کرتا ہے۔ ادیب اپنے عقائد کی وجہوں سے ان کرداروں کو نیکی یا بدی کا رتبہ نہیں دیتا۔ یا انہیں اعلیٰ اور ارفع نہیں بناتا۔ اسے ادب کی حرمت کا پاس ہے تو وہ انہیں اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ ہمارے جیسے انسان محسوس ہوتے ہیں۔ اردو میں کئی اہم اور غیر اہم تاریخی ناول لکھے جا چکے ہیں۔ آگ کا دریا کو اردو کا سب سے بڑا ناول کہا گیا ہے۔ اور یہ دعوے درست ہے۔ دو ہزار سال پر محیط اس تاریخی ناول میں قرۃ العین کا فن اپنے عروج پر ہے۔

یہ تاریخی ناول ہندوستان اور تحریک پاکستان کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ کسی بھی تاریخ میں بہت سے دھارے آ کر ملتے ہیں اور اسے مکمل کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ان دھاروں کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی انگریز مورخ کا دعویٰ کہ دنیا کی تاریخ میں برطانیہ کی سلطنت کسی زمانے میں دنیا کی دیگر سلطنتوں کے مقابلے میں سب سے بڑی رہی ہے' نیز ہندوستان کے حوالے سے اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ برطانیہ کی فوج کو وہ ہندوستانی سپاہی ملے جو بھیگی بلیوں (Docile) کی طرح مسکین اور غیر معمولی طور پر فرمانبردار تھے (1)۔ یہ صورت حال نہیں ہوتی اگر پلاسی کی جنگ میں کلائیو کی مکاری اور چال بازی نیز میر جعفر کی غداری کی وجہوں سے سراج الدولہ کی شکست نہیں ہوتی۔ جہاں کہیں بھی انگریز مورخوں نے اہم جنگوں کی روداد لکھی ہے وہاں جنگ پلاسی کی غیر معمولی اہمیت محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ یہ پہلی فیصلہ کن جنگ تھی۔ (2)

پاکستان کی تاریخ قیام پاکستان سے نہیں شروع ہوتی۔ غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ میں بھی پاکستان کا حصہ ہے۔ اسی لیے میری نگاہ بنگال 1756-1757ء پر گئی۔ یہ وہ دور تھا جب سراج الدولہ کی نوابی یا صوبہ داری شروع ہوئی اور جنگ پلاسی کے بعد ختم ہو گئی۔ تاریخ کیا ہے؟ اس کی تشریح مختلف طور سے کی گئی ہے۔ اگر ماضی میں جائیں تو گبن (Gibbon) کا نظریہ سامنے آتا ہے۔

History is little more than the register of the crimes, follies

and misfortunes of mankind.

تاریخ کی بابت یہ بھی کہا گیا ہے کہ تاریخ ' ایک نسل کا دوسری نسل کے ساتھ مکالمہ ہے۔ میں اس نظریئے کو قبول کرتا ہوں جس کی رو سے تاریخ سماجی تحریک کی ٹکراؤ سے تحریر ہوتی ہے۔ اور یہ تحریک طبقاتی کشمکش سے وجود میں آتی ہے۔ یہ تحریک اور کشمکش کبھی نظر آتی ہے اور کبھی نہیں بھی۔ سویت روس جب تک تھا اس وقت دنیا کے بیشتر ملکوں میں محنت کش عوام کی جدوجہد کی مختلف شکلیں نظر آتی تھیں۔ سویت روس کے انہدام کے بعد جو خلا پیدا ہو گیا اس میں اسلامی بنیاد پرستوں کی جماعتیں اب متحرک نظر آتی ہیں۔ ان کی دہشت گردی اس وقت کی تاریخ بنی ہوئی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔ بیشتر صوبے مغلیہ حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔ جو بچ رہے تھے ان پر ان کی فرمانروائی برائے نام تھی۔ ایسا ہی ایک صوبہ بنگال بھی تھا جو ہمیشہ سے حکومت کا سب سے خوش حال صوبہ رہا تھا۔ اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسر بہشت کہتے تھے (3)۔ 1757-1756ء کے دوران نواب سراج الدولہ اس صوبہ کا صوبیدار تھا۔ وہ اس جاگیرداری نظام کا سربراہ تھا جو سارے ہندوستان میں اپنے تضاد کی وجہ سے خلفشار میں مبتلا تھی۔ اس کا مقابلہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے ناگزیر ہو گیا جو بنگال میں اہم ترین تجارتی ادارہ تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ابھرتی ہوئی توانا اور منظّم سرمایہ داری کا نمائندہ تھی جس کا سرچشمہ انگلستان تھا اور جس کی پشت پناہ اس وقت کی برٹش حکومت تھی۔ سراج الدولہ اور کمپنی کے مقابلے میں جن کرداروں نے حصہ لیا ان کی بابت جانے بغیر ناول کا لکھنا محال تھا۔

زیرموضوع تاریخی ناول کو لکھنے کے لیے اس زمانے کا معاشرہ کیسا تھا اس کا جاننا بھی میں نے ضروری سمجھا۔ اور اسے سمجھنے کے کے لیے اس دور کے زراعتی نظام اور صوبے کے انتظامیہ کی جانکاری بھی لازمی محسوس ہوئی۔ شہر مرشد آباد جو ان دنوں بنگال کا دارالسلطنت تھا اس کی واقفیت کا بھی خیال آیا۔ اس دور کی تاریخ میں جو اہم کردار تھے ان کی سوانح عمری سے واقف ہوئے بغیر ناول کا لکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس سلسلے میں علی وردی خاں' میر جعفر' جگت رائے اور کلائیو کی سوانح عمریاں تو مل گئیں لیکن سراج الدولہ کی قابل اعتبار سوانح عمری نہیں ملی۔ اس لیے میں نے 1757-1756ء کے دوران جو واقعات ہوئے ان میں اس نے جو کردار ادا کیا ان سے میں نے ان سے اس کے حالات زندگی کو اخذ کیا۔ یعنی جارج لوکاس (George Lukacs) کے الفاظ میں وہ انسانی اور سماجی عوامل کیا تھے جنہوں نے جس نے اس وقت کی تاریخ میں اسے اپنا مخصوص کردار ادا کرنے پر مجبور کیا۔

ان سب کے مطالعے سے کچھ حاصل کرنے کے بعد وہ ادبی مسائل سامنے تھے جنہیں ناول لکھتے ہوئے مجھے حل کرنا تھا۔ تاریخی ناول ادب اور تاریخ کا وہ نازک توازن ہے جس میں نہ تو تاریخی حقائق سے گریز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اچھی کہانی کے تقاضوں کو بھلایا جا سکتا ہے۔ ایک اہم نکتہ جس کا نبھانا تاریخی ناول ہی میں ممکن ہے وہ یہ ہے کہ تاریخ عوام کی ظاہری اور باطنی واردات میں اس طرح گھل مل جاتی ہے کہ انسان کے ارادوں اور اس کی سمجھ بوجھ کا ایک دوسرے سے ٹکرانا ناول کی شکل میں سامنے آ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں باختن (Bakhtin) کا ناول کی بابت نظریہ بھی غور طلب ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ناول ماضی کے حقائق اور زیریں سطح واردات کو اس طرح غیر جانبدارانہ پیش کرتا ہے کہ ہمیں ان کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ نیز ناول ماضی کو آج کا احساس بنا دیتا ہے۔ اسی لیے یوٹوپیئن تصورات اور ناول ایک دوسرے کے لیے زہر ہلاہل ہیں۔ اس بیان کی روشنی میں نسیم حجازی اور شرر کے ناولوں کا خرافات سمجھ میں آ جاتا ہے۔ جارج لوکاس نے ناول کو اعلیٰ ترین بے خانگی کہا ہے۔ یہ درست بھی ہے چونکہ ناول نگار کو جب تک بے گھری نہ ہو وہ دوسروں کے گھروں میں نہیں جا سکتا اور نہ ہی دربدر کی ٹھوکریں کھا سکتا ہے۔ ان ٹھوکروں کو کھانا جبھی ممکن ہے اگر ورجینیا ولف کے ان الفاظ کو نگاہوں کے سامنے رکھا جائے۔

A great novel should have religion, love, war, peace, family life. Rising moon, sunset, immortality of souls through characters as in War and Peace.

الغرض یہی آزمائشیں ہیں جو ہر ادیب کو ناول لکھتے وقت نظر آتی ہیں۔

حوالے

1. Linda Colley. Time Literary Supplement. 20th. September 2002

2. History of Bengal by S.C. Hill.

3. Decisive Battles of India. By Malleson.

طوفان کی آہٹ۔ ناول۔ مصنف مصطفیٰ کریم۔ پبلشر شہزاد۔ گلشن اقبال' 2003ء کراچی

❁

تاریخ کے بنیادی ماخذ

شیر خان کا والی بہار کے پاس جانا اور اس کے بیٹے کا اتالیق مقرر ہونا

پھر ایک مدت کے بعد خبر آئی کہ سلطان ابراہیم شہید ہوا اور ملک دہلی کا سن نو سو بتیس ہجری میں سلیمان ثانی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے ہاتھ آیا۔ فرید لاچار ہو کر پہاڑ خان کے پاس آیا اور اس کی خدمت میں آٹھ پہر رہتا اور ایک دم اس کے حضور سے نہ سرکتا' خدمت کے سبب سے ایسی مصاحبت حاصل کی کہ خلوت وجلوت میں کوئی اسے منع نہ کرتا اور اس کے مقربوں سے ایک یہ بھی ہوا اور اپنے حسن تدبیر سے بہار کے ملک میں مشہور تھا ایک روز پہاڑ خان کے ساتھ شکار کو گیا تھا اتفاقاً شیر شکار گاہ میں سے نکلا فرید نے اس شیر کو مارا پہاڑ خان نے کہ اپنا نام سلطان محمد رکھا تھا اور سکہ وخطبہ ملک بہار میں اپنے نام کا مقرر کیا تھا۔ فرید کو شیر خان خطاب دیا اور اپنے بیٹے جلال خاں کی نیابت اسے دی اور وہ اس کام پر معمور تھا ایک مدت بعید کے بعد سلطان محمد سے رخصت لے کر اپنے پرگنوں میں آیا اور وہاں اسے عرصہ ہوا۔ دیر رہنے کے باعث سلطان محمد نے اس کا گلہ کیا کہ تھوڑے دنوں کا وعدہ کیا تھا اور بہت دن گزرے کہ نہیں آیا اس واسطے کہ ایام خلل کے تھے ایک کو دوسرے پر کلی اعتماد نہ تھا۔

محمد خان نے بھی شکوہ شیر خاں کا سلطان محمد سے کیا کہ سلطان محمود کہ جو بیٹا سلطان سکندر کا ہے اس کے آنے کی راہ دیکھتا ہے کیونکہ اکثر امراء پٹھانوں کے اس کے ساتھ ہوئے ہیں اور اگر قبلہ عالم فرمادیں تو اس کے آنے کی میں تدبیر عرض کروں۔ بادشاہ نے پوچھا وہ کیا ہے اس نے عرض کی کہ بھائی اس کا سلیمان جوان قابل ہے اور میاں حسن نے اپنے جیتے جی اسے دونوں پرگنوں کی حکومت دی تھی اور شیر خان کو پرگنوں سے نکال دیا تھا۔ اس نے جا کر سلطان ابراہیم سے اپنے باپ کا شکوہ کیا۔ بادشاہ نے کہا کیا وجہ ہے کہ اپنے باپ کی شکایت کرتا ہے۔ دولت خاں نے جو بدھو خاں کا بیٹا تھا اسے اپنا وسیلہ کیا تھا اسی نے میاں حسن کی وفات کے بعد شیر خاں کے نام سلطان ابراہیم سے دونوں پرگنوں کی حکومت کا فرمان لکھوا دیا تھا۔ سلیمان نے بھی چاہا تھا کہ جو میاں حسن نے قریب مرنے کے سفارش لکھی تھی' اسے جا کر حضور میں گزارے۔ اس میں ہنگامہ برپا ہوا اور اس کا جانا سلطان ابراہیم کے پاس نہ ہوا اب آپ کے پاس فریاد کو آیا ہے' اگر حضور سے

اسے دونوں پرگنوں کی سند عنایت ہووے تو شیر خان شتابی سے حضور میں حاضر ہو‘ ایک مدت سے سلیمان نے اس کے ظلم سے بھاگ کر میری پناہ لی ہے اگر وہ اپنے حق کو پہنچے تو بندہ ہمیشہ حضور کا منت دار رہے گا۔ سلطان محمد نے کہا کہ اس نے میری خدمت بہت سی کی ہے تھوڑے سے قصور کے باعث بے تحقیق کیے اس کی جاگیر کیونکر ضبط کروں۔ لیکن تیری خاطر عزیز ہے تو اس قصے کو کہ یہ دونوں تیرے ساتھ نسبت عزیزی اور برادری کی برابر رکھتے ہیں اس طرح سے انفصال کر کہ کسو کی خاطر نہ ہو‘ تا حق اپنے مرکز پر قرار پاوے اور ان دونوں میں جو فتنہ برپا ہوا ہے دور ہووے جیسے کہ نظامی گنجوی کہتا ہے۔ بیت

میانجی گر ایسا ہرا ہے صواب
کہ ہم سیخ برجار ہے ہم کباب

محمد خان کی فوج‘ شیر خان کے دستوں کو شکست دے کر جاگیر پر قبضہ کرتی ہے

جب محمد خاں سلطان محمد سے رخصت لے پرگنہ جوند میں آیا اور اپنے چیلے شادی کو کہ معتمد اس کا تھا‘ شیر خاں کو اس کے ہاتھ کہلا بھیجا یہ مناسب نہیں ہے کہ دونوں پرگنے اپنے تصرف میں لائیے اور چھوٹے بھائی کو محروم رکھیے اور اپنے خاندان میں نزاع کا طور برپا کرے شادی کو بھیجتا ہوں‘ توقع ہے کہ جو کچھ کہے اس میں تفاوت نہ ہو‘ میں نت دار ہوں گا‘ تیرے بھائی ایک مدت سے میرے پاس ہیں اور رسم و قاعدہ پٹھانوں کا تجھ سے چھپا نہیں۔ جس وقت شادی شیر خاں کے پاس آیا جو محمد خاں نے کہا تھا سب اظہار کیا شیر خاں نے اس کے جواب میں کہا اے شادی خاں صاحب کی جناب میں میری زبانی عرض کر یہ ملک روہ کا نہیں ہے کہ حصہ برادرانہ ہو۔ ملک ہندوستان کا بادشاہ کے حکم کے تابع ہے کہ اس میں کسی کی شرکت نہیں اور خوردی و بزرگی اور برادری سے تعلق نہیں رکھتا۔ سلطان سکندر نے یہ مقرر کیا ہے جو کوئی اس کے سرداروں میں سے مرے اس کا جو نقد و جنس ہو موافق مسئلہ فرائض کے وارثوں میں اس کا حصہ کر دے جو اس کے فرزندوں میں سے لائق ہو اس کا پرگنہ و فوج اسے مرحمت فرما دیں اور اس کے سوا اور بھائیوں کا اس میں حصہ نہیں‘

سلطان ابراہیم نے دونوں پرگنوں کی سند بندے کو عنایت فرمائی ہے کہ اس میں کسو بھائی کو دخل نہیں اور جو مال وخزانہ میاں حسن کا تھا کہ سب وارث اس میں شریک ہیں سلیمان لے کر بھاگا ہے اور اس نے تمہاری پناہ لی۔ محض تمہاری خاطر عزیز کے باعث اسے کچھ نہیں کہتے جس وقت وہ تم سے جدا ہوا وارث میاں حسن کے اپنا حق اس سے لے لیں گے آپ کو یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ ٹانڈہ بلہو سلیمان کو دو میں اپنی خوشی سے نہ دوں گا۔ اگر آپ بزور لے کر دیں حاکم ہیں' اور دوسری بات نہیں۔ یہ کہہ کر شادی کو حکم کیا ہمارا سارا لشکر اپنے ساتھ لے جا کر ٹانڈہ بلہو سلیمان کو بزور لے دے' اگر وہ لڑے تو اسے شکست دے کر دونوں پرگنے چھین لے' جب یہ خبر شیر خاں کو پہنچی۔ سکھا کو جو خواص خاص کے باپ کا غلام اور ٹانڈہ بلہو جو بنارس کے نزدیک ہے اس کا حاکم تھا اور شیر خاں کی بیشتر فوج بھی اس کے ہمراہ متعین تھی پروانہ لکھا کہ سلیمان شادی کو لے کر تیری طرف آتا ہے بغیر لڑائی کے ٹانڈہ بلہو کو نہ دیجیو۔ اس نے شہر سے باہر نکل کر لڑائی کی۔ قضارا مارا پڑا اور فوج بھاگ کر شیر خاں کے پاس سہسراؤں کے پرگنے میں آئی۔ وہ بھی وہاں نہ ٹھہر سکا اگرچہ کسو کسو نے کہا بادشاہ کے پاس جانگیا' جواب دیا کہ دن ہلڑ کے ہیں میرے واسطے سلطان محمد خاں کو آزردہ نہ کرے گا' بصلح پیش آئے گا اور میرے نزدیک صلح مصلحت نہیں۔

شیر خان جاگیر پر دوبارہ قبضہ کرتا ہے محمد خان سے صلح

میاں نظام نے کہا اگر صلح منظور نہیں تو بہتر یہ ہے کہ پٹنے میں جا کر وہاں کسو اچھے آدمی کی معرفت سلطان جنید کے حضور میں پہنچ کر اس کی نوکری کریں چاہے کہ اس کی خدمت کے باعث محمد خاں سے اپنا بدلا لیں اور اسے بھی جوند سے نکالیں جب یہ بات ٹھہری شیر خاں پٹنے میں آیا اور اپنے وکیل سے کہا آگرے میں سلطان جنید کے پاس جا کر عرض کر۔ اگر پادشاہ یہ قول وقرار اور عہد وپیمان کرے کہ ہمارا کسی طرح سے برا نچاہے تو اس کی نوکری کریں اور بدل وجان اس کی دولت خواہی میں حاضر رہے۔ پادشاہ نے قبول کیا پھر شیر خان بادشاہ کا نوکر ہوا اور اتنا کچھ حضور میں پیشکش گزرانا کہ پادشاہ نہایت راضی ہوا اور شیر خاں کے ساتھ اپنا لشکر کر دیا محمد خاں اور سلیمان اس کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے بھاگ کر رہتاس کے پہاڑ میں آئے (13) شیر خان

اپنے پرگنوں کواور محمد خاں کے جوند پر گنے کواپنے قبضے میں لای اور بعضے پر گنے پادشاہی خالصے کے بھی لیےاور عزیزوں میں سے جو بعضے پٹھان بھاگ کر پہاڑ میں گئے تھے ان کولکھا کہ تم آؤ جاگیر تمہاری دو چند کر دیں گے اور مستورات کی شرم ایک ہے' میری غرض انتقام سے تھی کہ پر گنے لوں سو تصرف میں آئے چاہیے کہ خط کے دیکھتے ہی اپنے تئیں پہنچاؤ چنانچہ اکثر پٹھان شیر خان کی ملازمت میں آئے جب اس نے جانا کہ بیشتر افغان میرے پاس جمع ہوئے' مغلوں کو بہت کچھ دے' رخصت کر' عرضی محمد خاں کو جو حاکم جوند کے پر گنے کا قوم سور سے تھا اس مضمون کی لکھی کہ خان اعظم اپنے دل میں کچھ وسواس نہ کریں اور اسی طرح سے خاطر جمع رکھیں۔ پرگنہ جوند کا اپنے تصرف میں لائیں' میں نے پادشاہی پر گنے لیے ہیں اور عزیزوں کے ملک کی طمع نہیں رکھتا' کیونکہ ایام فتنہ انگیزی کے ہیں اور جو پٹھان کہ جمعیت رکھتا ہے میری ریاست و ملک گیری کا دم مارتا ہے' اور صاحب دول کو ایسے وقت میں اپنے قوم کی سپاہ کی جمعیت سے یار و مددگار چاہیے تا ملک اپنے سے خبردار رہے اور پرگنوں میں اوروں کے تصرف کرے' پس مناسب دولت یہ معلوم ہوتا ہے کہ حسد اور عجب و کینہ جو جان بین (جانبین ؟) سے دلوں میں رکھتے تھے اسے دور کریں اور اس کے عوض نہال مہر و محبت کا زمین دل میں بٹھا دیں تو ثمرہ اخلاص کا حاصل ہووے اور عزیزوں کی جمعیت کا باعث ہووے اور اس سے قدر و منزلت اور جاہ و عزت زیادہ ہووے۔ شعر

نہال دوستی بٹھلا کہ دل کا کا بر آوے
درخت دشمنی کر دور تا سب رنج بٹ جاوے

شیر خاں کی عرضی کے ملاحظہ کرتے ہی محمد خاں نے پہاڑ پر سے آ کر جوند کے پر گنے میں عمل کیا اور اگلی کدورت کی باہم دیگر عذر خواہی کی اور محمد خان شیر خاں کے احسان کا مرہون ہوا۔

شیر خان' بابر کی ملازمت اختیار کرتا ہے

یہ محمد خان کی طرف سے خاطر جمع کر کے آگرے میں سلطان جنید کے پاس آیا وہاں سے اس کے ساتھ ہو کر فریدون ثانی ظہیر الدین محمد بابر پادشاہ کی ملازمت کے لیے آیا اور شرف آستان

بوسی کا حاصل کیا' چنانچہ چندیری (14) کی مہم لیے آیا اور شرف۔ ایک مدت مغلوں میں رہ لڑائی کا طور اور تدبیر ملک داری کی اور روبیہ ارکان دولت کا معلوم کیا۔ پھر اکثر اوقات پٹھانوں کی مجلسوں میں کہتا' اگر میرے بخت نے مساعدۃ کی اور اقبال نے یاوری کی تو مغلوں کو ملک ہند سے بآسانی نکالوں گا۔ جس وقت لوگ اس سے یہ بات سنتے ہنستے' جب اس محفل سے اٹھتے تو آپس میں کہتے شیر خاں کیا گھمنڈ کرتا ہے اور باتیں اپنے منہ سے۔

مغلوں کو ہند سے نکالنے کا خیال اور اس کا اظہار

میں جو عباس مولف شیر خاں کے احوال کا ہوں اپنے عمو شیخ محمد کی زبانی جو سردار بڑے مشائخوں کا اور بیٹا شیخ ماہی قتال جو برگزیدہ اہل کمال کا عمر اس کی قریب اسی برس کے تھی میں نے سنا فرماتے تھے کہ میں چندیری کی مہم میں سکندر ثانی ظل سبحانی بابر پادشاہ کے لشکر کے ساتھ تھا۔ خانخاناں یوسف خیل کے ملازموں میں تھا کہ شیخ ابراہیم سروانی نے مجھ سے کہا آ ؤ شیر خاں سور کے پاس چلیں اور باتیں وہ اپنے مرتبے سے ایسی زیادہ کرتا ہے کہ لوگ ہنستے ہیں انہیں ہم سنیں میں نے کہا بہت اچھا پھر دونوں سوار ہو کر اس کے ڈیرے میں گئے۔ باتوں ہی باتوں میں شیخ ابراہیم نے کہا مشکل ہے کہ ملک ہندوستان کا پھر پٹھانوں کے ہاتھ آوے اور مغل ہندوستان سے خارج ہوویں شیر خاں نے شیخ محمد سے کہا تو اس کا گواہ رہیو جو میرے اور شیخ ابراہیم کے بات ہوتی ہے اگر میرے طالع نے یاوری کی تو تھوڑے دنوں میں مغلوں کو ہند سے نکال دوں گا۔ اس واسطے کہ مغل پٹھان سے تلوار کی لڑائی میں زیادہ نہیں۔ آپس کی مخالفت کے سبب پٹھانوں نے ہند کا ملک اپنے ہاتھ سے دیا جب سے کہ میں مغلوں میں آیا روبیہ ان کی لڑائی کا معلوم کیا کہ ان کے پاس لڑائی میں نہیں ٹھہرتے اور پادشاہ ان کا عالی نسبی اور بلند مرتبے کے باعث اپنی ذات سے تدبیر ملک میں متوجہ نہیں ہوتا اور امور مملکت کی مہمات کو اپنے امراء اور ارکان دولت کو سونپتا ہے اور ان کے قول و فعل پر اعتماد کرتا ہے اور دے رعیت اور سپاہی اور زمیندار جو حرام خور ہیں ان کے برآمد کار کے لیے دام رشوت میں گرفتار ہیں بھلا برا جو کہ حاجب زر ہے پیسے کے زور سے خاطر خواہ اپنے کام نکالتا ہے جو کہ زر نہیں رکھتا اگر ہزار دولت خواہی کرے یا ہر چند سپاہی جان دے لیکن اپنی داد کو نہ پہنچے۔

بیت

ملے کوئی جس در پہ راشی تجھے
اگر مال رکھتا ہے تو جی بچے

زر کی طمع کے سبب سے دوست و دشمن میں آپ فرق نہیں کرتے اگر اقبال نے میرے یاوری کی تو شیخ جی دیکھو گے یا سنو گے کہ پٹھانوں کو اس طرح سے قابو میں کروں کہ متفرق نہ ہونے دوں۔

بابر کو شیر خان کی طرف سے اندیشہ

کتنے ایک دنوں کے بعد خاصے کے وقت پادشاہ کی مجلس میں شیر خاں حاضر ہوا اس کے سامنے بھی قاب بھری ہوئی آش ماہیچے کی رکھی وہ اس کے کھانے کا طور نہ جانتا تھا۔ شیر خاں نے اسے چھری سے ٹکڑے ٹکڑے کر چمچے سے بآسانی کھایا ظل سبحانی بابر پادشاہ' شیر خاں کی عقل کو دیکھ کر متعجب ہوئے اور خلیفہ سے جو اس کا وزیر تھا کہا کہ شیر خاں کے احوال سے غافل نہ رہا چاہیے کہ صاحب تدبیر ہے اور آثار پادشاہت کے اس کے چہرے سے پیدا ہیں اور اکثر اس سے بڑے بڑے سردار پٹھانوں کے دیکھے ہیں اور مطلق کچھ میرے میں خطرہ نہیں گزرا لیکن دیکھتے ہی اس شخص کے یہ میرے دل میں خیال آتا ہے کہ اسے پکڑا چاہیے کیونکہ آثار بزرگی و ریاست کے اس میں پائے جاتے ہیں' جو سلطان جنید نے رخصت کے وقت خلیفہ سے شیر خاں کی سفارش بہت سی کی تھی اور اس نے بھی خلیفہ کو پیش کش خاطر خواہ گزرانی تھی عرض کیا کہ شیر خاں بے تقصیر ہے اور اس قدر جمعیت نہیں رکھتا کہ اس سے کسی طرح کا دل میں کچھ وسواس ہووے۔ اگر قبلہ عالم نے شیر خاں کو پکڑا تو جتنے پٹھان رکاب سعادت میں ہیں سب کو اندیشہ ہوگا اور کسو افغان کو ہمارے عہد و پیمان پر اعتماد نہ رہے گا اور یہ باعث تفرقے کا ہے۔ پادشاہ اس میں ساکت ہوا۔

شیر خاں کا ملازمت چھوڑ کر جان کے خوف سے بھاگنا

شیر خان نے فراست سے دریافت کیا کہ پادشاہ میرے حق میں کچھ فرماتا ہے پھر اپنے

ڈیرے میں آ کر لوگوں سے کہا آج پادشاہ نے میری طرف بہت دیکھا اور وزیر سے کچھ کہا۔ بلکہ نظرعبرت سے دیکھا۔ اب میرے یہاں رہنا خوب نہیں، میں یہاں سے جاتا ہوں، یہ کہا اور اسی وقت سوار ہو کر لشکر سے گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پادشاہ جو دیکھے تو شیر خاں مجلس میں نہیں، اسے یاد فرمایا لوگ جو اس کے مکان پر گئے تو وہ نہ تھا پادشاہ نے خلیفہ سے فرمایا اگر تو مجھے منع نہ کرتا میں اسے اسی وقت پکڑتا مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ ہونے والا ہے اور آگے خدا کو علم ہے جب شیر خاں لشکر سے اپنے پرگنوں میں گیا۔ تحفے اچھے اچھے سلطان جنید کے واسطے بھیجے اور عرضی لکھی جو پادشاہ سے میں رخصت مانگتا تو مجھے اجازت نہ دیتے اور میں اس ضرورت کے باعث کہ بھائی نظام نے لکھا تھا کہ محمد خاں اور بھائی سلیمان نے سلطان محمود سے عرض کی تھی کہ شیر خاں، مغلوں کے ساتھ ہے اور ان کے زور سے یہ پرگنے ہم سے لیے تھے اگر حکم ہو تو اس کے پرگنے لیں، سلطان محمود نے کچھ جواب نہ دیا جب یہ خبر مجھے پہنچی اس جگہ میں رہ نہ سکا اور میں آپ کے احسان کا بندہ ہوں۔ جس خدمت کا مجھے حکم ہو اسے بجالاؤں۔(15)

بہار کی حکومت پر قبضہ شاہ بنگال کی فوج پر شیر خاں کی فتح

بعد اس کے میاں نظام اور سب عزیزوں سے مشورت کی کہ نہ اب مغلوں کو میرا اعتماد ہے اور نہ مجھ کو ان کا اور اب مجھے سلطان محمد کے پاس جانا لازم ہوا یہ کہا اور گیا پھر اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ سلطان محمود نے حسن تدبیر اس کی دیکھی تھی۔ چنانچہ اپنے لڑکے جلال خاں کو اسے سونپا اور کہا اس کی نیابت تجھے دی اور اس کی تربیت میں سعی کر کے یہ ابھی لڑکا ہے اس بات سے شیر خاں نہایت خوش ہوا اور س کی تربیت میں مصروف تھا جب کہ سلطان محمود کا وصال ہوا اور جلال خاں کو اس کی جگہ بٹھایا۔ جلال خان کی ماں کہ جس کا دودو نام تھا سلطان محمد کی حرم محترم تھی اور جن دنوں میں جلال خاں لڑکا تھا، حکومت ملک بہار کی دودو کرتی تھی اور اس نے بھی نیابت کا عہدہ شیر خاں پر بدستور بحال رکھا تھا جب کہ دودو کی بھی وفات ہوئی۔ شیر خاں نیابت کے طور پر جلال خاں کا کاروبار کرتا تھا اور بہار کے ملک کی تدبیر بھی اسی پر موقوف تھی۔ مخدوم عالم جو حاکم حاجی پور کے پرگنے کا اور پادشاہ گوڑ بنگالے کے امیروں سے تھا، شیر خاں کے اور باہم اس کے دوستی نہایت تھی،

اور مزاج بنگالے کے پادشاہ کا مخدوم عالم سے منحرف ہوا۔ اس کا یہ ارادہ ہوا کہ بہار کا ملک رہیلوں سے لے دے۔(16)

نوحانیوں کی شیر خاں کے خلاف سازش اور ان کی ناکامیابی

پھر قطب خاں کو بڑی فوج سے بھیجا اور شیر خاں نے بہت طرح سے صلح کا پیغام کیا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم نے کبھی تم سے مخالفت نہیں کی اور اپنی حد سے ہم نے کبھی تجاوز نہیں کیا' چنانچہ مسند عالی دریا خاں بھی تم سے دوستی و اخلاص رکھتا تھا اور سلطان محمد کا بیٹا جلال خاں (17) بھی چھوٹا ہے' تمہیں مناسب نہیں کہ ایسے وقت میں اس کے ملک لینے کا ارادہ کرتے ہو' ہر چند عجز و زاری کی' پر قطب خاں نے نہ مانی' شیر خاں نے پٹھانوں سے کہا ایک طرف مغل کا لشکر اور دوسری طرف فوج بنگالے کی' سوا جوانمردی کے چھٹکارا نہیں' روہیلوں نے شیر خاں سے کہا خاطر جمع رکھ' اس قدر کوشش کریں گے کہ میدان کو نہ چھوڑیں گے۔ اس میں فتح ہو ہماری یا مارے جائیں' کیونکہ کتنے برسوں سے جو تیری بدولت پرورش پائی ہے نمک حرامی نہ کریں گے۔ پھر شیر خاں نے اپنی فوج کا یمنہ و میسرہ اور قلب و جناح آراستہ کر' ان کا مقابلہ کیا تو دونوں لشکروں میں بڑی لڑائی ہوئی آخر الامر بنگالے کے لشکر کی شکست ہوئی اور اس لڑائی میں شیخ اسمٰعیل نے بڑی جوانمردی کی۔ چنانچہ جب خاں گاگڑ جو سالا شیخ اسمٰعیل کا تھا اس نے ایک ایسا نیزہ قطب شاہ کے مارا کہ گھوڑے پر سے گرتے ہی جاں بحق تسلیم ہوا اور فتح شیخ اسمٰعیل کے نام ہوئی۔ پھر شیر خاں نے شیخ اسمٰعیل کو شجاع خاں خطاب عنایت فرمایا اور اس قدر خزانہ اور ہاتھ گھوڑے مال و اسباب لوٹ سے ہاتھ آیا کہ شیر خاں صاحب سامان ہوا اور نوحانیوں کو یہ اس کی حرکت خوش نہ آئی۔ پھر شیر خاں اور نوحانیوں میں دشمنی ہوئی لیکن ظاہر نہ کرتے تھے۔ جب مخدوم عالم قطب خاں کی مدد کو نہ آیا اور قطب خاں کو یہ واقعہ پیش آیا تب بنگالے کے پادشاہ نے فوج مخدوم عالم پر بھیجی۔ اس نے شیر خاں کو اپنی کمک کے واسطے بلایا۔ اس نے کہا میرے اور نوحانیوں کے دشمنی ہوئی ہے باہم دیگر اعتماد نہیں رہا۔

میں جو مصنف اکبر شاہی کا ہوں اور میاں حسو عباس خاں سروانی کا بیٹا تھا وہ میرے بزرگوں میں سے تھا اور اس کی اولاد شیر خاں کے ساتھ بہت سی تھی چنانچہ میاں حسو کو دریا خاں خطاب دیا تھا

اور شیر خاں کے امیروں میں سے اس کے برابر کوئی نہ تھا شیر خاں کی حقیقی بہن اسے بیاہی تھی اور شیر خاں کی ابتدائے دولت میں دریا خاں کی وفات ہوئی اس بیان سے فقیر کی غرض یہ ہے کہ میرے اور شیر خاں کی۔ درمیان کئی طرح کا رشتہ ہے۔ پس اس کے احوال سے میں خوب واقف ہوں کہ اپنے بزرگوں سے تحقیق کیا۔ آخرالامر دریا خاں کو مخدوم عالم کی مدد کو بھیجا اور اس نے اپنا تمام اسباب شیر خاں کے پاس بھیجا اور کہا اگر میری فتح ہوئی تو یہ میں تجھ سے لوں گا والا تیرے پاس اس مال کا رہنا غیروں کے پاس سے بہتر ہے۔ جب مخدوم عالم لڑائی میں مارا پڑا اور میاں حسو جیتا آیا اور سب مال و متاع اس کا شیر خاں کے پاس رہا بعد اس کے شیر خاں اور نوحانیوں کے دن بدن دشمنی زیادہ ہوئی یہاں تلک کہ نوحانیوں نے شیر خاں کے مارنے کا ارادہ کیا اور آپس میں یہ قرار ہوا کہ شیر خاں ہر روز تھوڑے لوگوں سے جلال خاں کے حضور میں آتا ہے۔ جلال خاں بیماری کا بہانہ کرے۔ شیر خاں مقرر اس کی عیادت کو گھر میں آوے گا بعد احوال پرسی کے جب خدمت عالی سے رخصت ہو کر اٹھے اور ایک دروازے سے نکل دوسرے دروازے تلک پہنچنے نہ پاوے کہ محل کے دونوں دروازوں میں جلال خاں' شیر خاں کو مار ڈالے بعضے نوحانی جو نسبت برداری و عزیزی کے ساتھ اخلاص و محبت بھی شیر خاں سے رکھتے تھے وہ جوان کے مشورے میں شریک تھے انہوں نے شیر خاں کو جتایا کہ ان کا مشورہ یہ ہے خبر دار ہو' اس سے پہلے ہی نوحانیوں کے اوضاع و اطوار سے معلوم کیا تھا کہ در پئے آزار کے ہوئے ہیں از بسکہ وہ دانا تھا' ہرگز اس کا اظہار نہ کرتا تھا' اور مخفی اپنی حفاظت و تیاری میں رہتا تھا اور جو نیا ملک یا اعزاز و مال ہاتھ آتا' قدیموں کے سوا نئے لوگوں کو رکھتا اور ان کو جاگیر خاطر خواہ دیتا اور نوحانیوں کو جائے داد نو سے کچھ نہ دیتا جب شیر خاں یہ سمجھا کہ نئے لوگ اتنے جمع ہوئے ہیں کہ نوحانی مجھ کو آزار نہیں پہنچا سکتے اور لڑائی میں غالب نہ ہو سکیں گے' دشمنی نوحانیوں کی ظاہر کی اور جلال خاں سے کہا آپ کو معلوم ہے کہ بنگالے کا پادشاہ اس تدبیر میں ہے آج کل تم پر ایک بڑا لشکر بھیجے اور ملک بہار کا تم سے لے اور نوحانی تین پشت سے جاگیر کھاتے ہیں اور فراغت سے رہتے ہیں جو ملک نیا ہاتھ آتا ہے اس میں طمع کرتے ہیں اور میں دولتخواہی تمہاری اس میں دیکھتا ہوں کہ جو ملک و خزانہ نیا ہاتھ آوے نئے لوگ رکھوں تازور و قوت ہووے

اور جب مخالف ہماری جمعیت دیکھیں ارادہ بہار کا نہ کریں' اس باعث سے وے میرا شکوہ وگلہ کرتے ہیں اور درپے آزار ہیں۔ آپ کے حضور میں از راہ حسد ہر ایک طرح کا بہتان باندھتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں اگر آپ مجھے دولتخواہ جانتے ہیں تو جو کچھ میں دولتخواہی سے کام کروں اسے جائز رکھیے اور ان کو میری دشمنی سے منع کیجئے اور جو کچھ وے کہیں اسے نہ مانیے اور حضور میں روشن ہے کہ نوحانی قوم و قبیلے میں قوم سور سے زیادہ اور قوی ہیں اور قاعدہ روہیلوں کا یہ ہے کہ جو کوئی چار بھائی زیادہ رکھتا ہے اور اس کے قتل اور بے حرمتی کا اندیشہ کم کرتا ہے۔ دن ہنگامہ کے ہیں اور تمہارا ابھی لحاظ اور ڈر نہیں رکھتے اور مجھے یوں معلوم ہوتا ہے انہوں نے میرے قتل پر کمر باندھی ہے آج کے سوا میں جمعیت تمام سے حضور میں حاضر ہوا کروں گا اور آپ مجھے اندر محل کے آنے کی تکلیف نہ فرمادیں اور اگر ضرور ہو کہ اندر بلایا ہی چاہیے پس حکم ہو کہ میں بھی محل میں بہت سے لوگوں سے آؤں۔ جب جلال خاں اور نوحانیوں نے جانا کہ شیر خاں ہماری مشورت سے آگاہ ہوا ان کا م کر پیش نہ گیا' جلال خاں نے شیر خاں سے کہا' نوحانیوں کا کیا مقدور ہے کہ تیری طرف میری نظر سے دیکھ سکیں' لیکن سب پٹھان جانتے ہیں کہ ہیں وے بدزبان ہیں اور فکر و اندیشہ نہیں رکھتے اور زبان ان کی ان کے کہنے میں نہیں جو منہ میں آتا ہے سو کہتے ہیں' لیکن عمل میں نہیں لاتے۔ جس میں تیری خاطر جمع ہو اس وضع سے اپنے لوگوں کے سمیت آیا کر اور تو اپنے دل میں کچھ وسواس نہ کر جو کچھ تو کرے گا مجھے قبول ہے غرض شیر خاں کو بہت تسلی و دلاسا دے رخصت کیا۔

اس روز کے بعد ایک کو دوسرے کا اعتماد نہ رہا اور نوحانیوں میں بھی اتفاق نہ رہا اور جن لوگوں نے کہ شیر خاں کو اس مشورے کی خبر دی تھی وے شیر خاں کے متفق ہوئے اور نوحانیوں کی جمعیت میں تفرقہ پڑا اور جب وے دشمن ہوئے۔ ان میں سے اکثروں نے بقسمیہ اس سے عہد و پیمان کیا۔ تب شیر خاں نے ان سے کہا کہ مجھے جلال خاں کی دولتخواہی کے سوا کچھ بن نہیں آتا۔ کیوں کہ اس کے ماں باپ کا مجھ پر احسان ہے' اور جب کہ وہ لڑکا تھا اس کی تعلیم کے واسطے مجھے مقرر کیا تھا اور میں نے بھی اپنے مقدور بھر اس کی تربیت میں کوئی درجہ باقی نہیں رکھا اور اسے وہ خوب جانتا ہے اگر تم اطلاع نہ کرتے تو بعض غرض گوؤں نے از راہ حسد مجھے قتل کیا تھا' جب تک میں جیتا ہوں

تمہارے احسان کا بندہ ہوں‘ اگر تمہارے نزدیک مصلحت وقت ہو‘ تو جلال خاں سے عرض کروں‘ کتنے ایک نوحانی جو باعث فتنہ وفساد کے ہیں ان کو تو دور کر اور اگر وہ ان کو دور نہ کرے تو میں اس کی نیابت سے دستبردار ہوں‘ مخالفت سے متفنی لوگوں کے ہمراہ رہنا مناسب نہیں‘ جیسے جلال خاں اپنا دولتخواہ سمجھے اسے اپنی نیابت دے مجھے نیابت سے کچھ غرض نہیں۔ اور اگر وہ مجھے اپنا دولتخواہ جانے اور ان کے قول پر اعتماد نہ کرے ہماری تمہاری خاطر سے ان کو برطرف کرے جب تک جیوں گا اس کا منت دار ہوں گا اور اس کی جمیع مہمات میں بدل وجان کوشش کروں گا جو نوحانی کہ شیر خاں سے متفق ہوئے تھے انہوں نے التماس کیا جو آپ کی رائے صائب میں آیا بجا ہے اور نہایت خوب کہ درمیان ہمارے اور ان کے دشمنی مالی و جانی ہوئی ہے۔ ایک جا رہنا مناسب نہیں اور ان کے قول وقرار پر اعتماد نہ کیا چاہیے جس سے کہ تیری دولت کو زوال ہو ایسی انہوں نے تدبیریں کی تھیں ہم اس سے ایک شمہ عرض کیا ہے سراسر تیرا اقبال تھا اور تیری عمر کے دن باقی تھے جو انہوں نے چاہا وہ نہ ہوا اب ایسی کچھ تدبیر کیا چاہیے کہ ان کے ضرر سے اپنے تئیں بچائے۔ شیر خاں نے ان نوحانیوں سے جو اس سے موافق تھے کہا اپنی حفاظت اور جلال خاں کی دولتخواہی کی فکر جو میں نے کی یہ ہے کہ جلال خاں سے عرض کیجئے تمہیں دو مہمیں درپیش ہیں ایک تمہارے روبرو جو بنگالے کا بادشاہ ہے دوسری باغیوں سے ملک کی حفاظت کرنی اور رعیت سے زر کی تحصیل اور تمہاری سپاہ کے بھی دو فرقے ہوئے ہیں اور آپس میں دوستی و اخلاص بھی نہیں رہا ایسے مقام میں باہم رہنا مشکل ہے غرض ان دونوں فرقوں میں سے جسے آپ کا جی چاہیے اسے دشمن کے مقابلے کے واسطے حضور میں رکھے اور دوسروں کو جاگیر کی طرف رخصت فرمادیں کہ رعایا سے زر تحصیل کریں اور ملک کی نگہبانی اور نوحانی جو شیر خاں کی طرف تھے انہوں نے کہا کہ تمہارے ساتھ آج بڑی جمعیت ہے‘ ونگٹی لوگوں کے رکھنے کی کچھ احتیاج نہیں ہے۔ جلال خاں سے کھول کر کہو کہ ان کو برطرف کرے اور جاگیران کی اور سپاہیوں کو دے۔ شیر خاں نے کہا غرض میری ان کے شر سے اپنی حفاظت ہے جو دور یئے منزل باارادہ سفر اختیار کریں تو شاید کتنے ایک دنوں کے بعد اپنے کیے سے پچتا دیں اور دشمنوں کے واسطے بڑی سیاست یہ ہے کہ احسان ولطف وکرام سے پشیمان ہوں دیں‘ اور مروت

ان کے دل سے بغض کو دور کرے اور حسد و عداوت کی جڑ کاٹ ڈالے اور ان کی اکھاڑ پچھاڑ میں اظہار دشمنی کی رخصت نہیں، ہر چند دفعیہ شر کا شر سے ہے۔ حاضران مجلس نے نہایت آفرین و تحسین کی۔

شیر خان کی عرضداشت

بعد اس کے شیر خاں نے واجب العرض اس مضمون کی لکھی کہ جب سلطان محمد نے مجھے آپ کی نیابت سے سرفراز کیا تھا، نوحانیوں کو حسد کے سبب خوش نہ آیا۔ پھر سلطان محمد کے وصال ہونے پر تمہاری والدہ صاحبہ نے مجھے امور ملکی میں دخل دیا تھا ان کو اور حسد زیادہ ہوا ظاہر و باطن میں میری شکایت کرنی اپنا شیوہ کیا جو میرا دامن آلودگی خیانت سے پاک تھا ہر چند میرے احوال کی جستجو کی، لیکن میرے کام میں کسو نوع کی کچھ خیانت نہ پائی نہ کوئی بات ایسی میرے نہ سے نکلی تھی جسے دست آویز کر کے مجھے نیابت سے دور کروا دیں۔ بیت

امین و ابد اندیش ہیں طشت مور
نہیں رخنہ کر سکتے اس میں بزور

اور میرے تئیں ان کے احوال کی خبر تھی لیکن میں یخنی اس کی سعی کرتا تھا اور کبھی خلوت و جلوت میں اس نے ظاہر نہ کیا اور عزت و حرمت اور مہمات دینوی میں ان کی اپنے مقدور بھر کمی نہیں کی اور بدلا اس کا لڑائی اور دشمنی سے جائز نہیں رکھا، اس واسطے کہ مخالفت باعث زوال نعمت و دولت کا ہے۔ مغلوں نے سلطان ابراہیم سے جو ملک لیا نہ تلوار کے زور سے بلکہ آپس کی پھوٹ سے، جب اکثر لوگوں سے مجھے معلوم ہوا کہ نوحانی میرے قتل کے درپے ہیں اور رات دن اسی فکر میں ہیں کہ کسی طور سے مجھے یہاں سے نکالیں اور اپنی قوت کی زیادتی پر مغرور ہیں تم دو مہمیں رکھتے ہو ایک ملک بنگالے کا جو دشمن تمہارے مقابل ہے دوسری غیر لوگوں سے ملک کی نگہبانی اور رعیت سے زر کی تحصیل، تمہارے لشکر کے دو گروہ ہوئے ہیں، بہت سے ہیں کہ میرے ساتھ اخلاص و محبت رکھتے ہیں اور بہترے ان کے ساتھ اور دونوں فرقوں کا یکجا رہنا ممکن نہیں، ان دونوں میں سے جسے

چاہو حضور میں رکھو اور دوسرے کو جائے داد پر بھیجو۔ جب ایسا ہی ضرور ہوا' تب میں نے عرض کیا' کیونکہ جان عزیز ہے' ناحق نہیں دی جاتی۔

شیر خان کے مخالف نوحانی امراء کا جلال خاں کو مشورہ

جب جلال خاں نے شیر خاں کی عرضی اس مضمون کی پڑھی اس کے وکیل سے کہا کہ اس سے کہہ' میں بھی اتنا جانتا ہوں کہ حق تیری طرف ہے' جب دوستی جاتی رہی' باہم رہنا مناسب نہیں تو مختار ہے' جو مصلحت تیری ہوگی وہی کروں گا اس سے کہہ بعض باتیں حضور کے آنے پر موقوف ہیں' جس وقت ہم تم ہوں گے ایک بات ٹھہرا کر اس پر عمل کریں گے' اور تھوڑے روزوں صبروں کر کہ دشمن زبردست ہیں' اس فتنے کو بآسانی موقوف کروں گا اور حق و باطل تحقیق' جب شیر خاں نے اپنی عرضی کا جواب معلوم کیا وکیل کی معرفت پھر جلال خاں کو عرض کر بھیجا جو آپ فرماتے ہیں نہایت بجا اور مناسب ہے تھوڑے دنوں پر کیا موقوف ہے بلکہ ایک مہینے تلک آپ اس امر کو بخوبی تحقیق کریں اور جس میں آپ کی دولتخواہی تھی وہ میں نے عرض کیا آپ کے حکم سے باہر نہیں ہوں' جو آپ فرماویں گے۔ اس پر عمل کروں گا۔ اور اس میں ایک موفرق نہ ہوگا بعد اس کے جلال خاں نے نوحانیوں کو جو شیر خاں کے قتل کے درپے تھے انہیں بلا شیر خاں کی واجب العرض دیکھا کہ کیا بعض نوحانی جو ہمارے مشورے سے آگاہ تھے' انہوں نے شیر خاں کے پاس جا کر ساری حقیقت کہی اور اس کے متفق بقسمیہ ہوئے' جو بھلا برا ہے ایک دوسرے کے پاس سے جدا نہ ہووے' اب کہو کیا کیا چاہیے۔ جو نوحانی کہ جلال خاں کے متفق تھے انہوں نے عرض کیا ہمارے تئیں شیر خاں کی خیر ہونے کا کچھ اندیشہ نہیں لیکن یہ برا ہوا کہ ہمارے بہت سے بھائی اس کے رفیق ہوتے' اور اب نوحانیوں کی قوم میں تفرقہ پڑا اور جو قوم کہ ہلاک ہوئی ہے آپس کی مخالفت کے باعث' میں نے دشمنوں کے دفع کرنے کے واسطے تدبیر کی تھی' ہمارے طالع کی زبونی کے سبب نہ بن پڑی' اور وہ اس سے خبردار ہوا اور اس کے سات لوگ بہت ہیں اور مغلوں سے بھی موافقت رکھتا ہے۔ تمہارا بیسا ان کی پیش کش کے لیے بھیجتا تھا اور کا اپنا بناتا تھا اور بہار کے ملک پر اعتماد نہ کیا چاہیے کہ تین پادشاہ اس کے لینے کی فکر میں ہیں' اور یہ محل حوادث ہے اگر ہمارے اور شیر خاں کے درمیان دوستی رہتی تو ہم حفاظت کر

سکتے تھے تمہارے اور شیر خاں کے درمیان اس روز سے نزاع باطنی ہوئی کہ ہم نے قطب خاں کو مارا اور جو مال و متاع گھوڑے ہاتھی اس کے ہاتھ آئے اور تمہیں نہ دیئے' لوگ شکوہ کرنے لگے کہ شیر خاں کو یہ مناسب تھا کہ جو قطب خاں کا مال ہاتھ آیا تھا' سب جلال خاں کو دیتا کہ مالک شکر اور ملک کا وہ تھا اور ان باتوں سے آپ کو بھی اس کی طرف سے رنج پہنچا اور اب وہ مخالفت ظاہر ہوئی اور بالفعل ایک جگہ رہنا اور ایک کو دوسرے پر اعتماد کرنا مناسب نہیں ہے اب ہم کو یہ چاہیے کہ بنگالے کے پادشاہ کو بہار کا ملک دیں اور ہر روز کی محنت و رنج سے جو اس کی نگہبانی کے واسطے کھینچتے ہیں نجات پاویں اور اپنے اہل و عیال کو بنگالے کے ملک میں رکھیں تو مغلوں کے غارت کرنے اور بندی سے چھٹیں' اور بنگالے کے پادشاہ کے پاس آپ آ کے جانے کی تدبیر یہ ہے کہ اس نے آپ سے یہ بات کہلا بھیجی ہے تمہارے لشکر کے دو فرقے ہوئے ہیں' ایک کو جاگیر کی طرف بھیجئے اور دوسرے کو اپنے پاس رکھیے اس کے تئیں جاگیر کو رخصت کیجئے اور آپ بفراغ خاطر دل جمعی سے بنگالے کے پادشاہ کے پاس جا کر اس کی فوج لایئے اور اپنی جاگیر بنگالے کے ملک میں لیجئے اور بہار کا ملک اس کی پیش کش کیجئے پیش از اس کے کہ کسو نے بہار کے ملک کا ارادہ نہ کیا تھا کہ جلال خاں کو نوحانیوں کی بات پسند آئی۔ شیر خاں کو بلا کر کہا کہ نوحانیوں نے میری دولت خواہی کے باعث تجھ سے مخالفت کی' انشاء اللہ تعالیٰ اپنی سزا کو پہنچے گے۔ تم مغلوں کے مقابلے کو جاؤ اور تدبیر ملک کی کرو' میں بنگالے کے پادشاہ کے مقابل ہوں۔ جب شیر خاں نے جلال خاں کی زبانی سنا مقبول کیا اور اسی وقت جلال خاں نے خلعت اور گھوڑا دے کر رخصت کیا۔

جلال خان کا شاہ بنگال کے پاس جانا بنگال کی فوج کا شیر خاں کے مقابلہ میں شکست کھانا

پھر شیر خاں سہسراؤں کے پرگنے میں آیا بعد اس کے جلال خاں بادشاہ بنگالے کی ملازمت کے لیے آیا اور اس نے جلال خاں کے ساتھ قطب شاہ کے بیٹے ابراہیم شاہ وغیرہ اور لشکر کو بھی کر دیا۔ جب شیر خاں نے سنا کہ جلال خاں بنگالے کے پادشاہ کے پاس گیا' خوش ہو کر کہا کہ بہار کا ملک میرے ہاتھ آیا اور مجھے یقین تھا کہ بنگالے کے پادشاہ کا لشکر ملک بہار کے لینے کو البتہ آوے

گا۔(18) جلال خاں کے لشکر میں میرے اور نوحانیوں کی مخالفت تھی۔ اس واسطے ڈرتا تھا کہ دشمن کی فتح ہوگی کیونکہ بڑا اسباب ہزیمت کا ہمارے لشکر میں آپس کی مخالفت ہے اب کسوطرح کا نفاق ہمارے لشکر میں نہ رہا۔ جب پٹھانوں کے لشکر میں خصوصیت نہ رہی لڑائی کے دن بنگالی کیا ہیں بلکہ مغل بھی برابری نہیں کر سکتے۔ جس وقت میں نے پادشاہ کے لشکر کو شکست دی اگر میں جیتا ہوں تو دیکھو گے کہ مغلوں کو کس طرح ہندوستان سے نکالتا ہوں بعد اس کے شیر خاں نے سرنو سے نگہداشت شروع کی اور جہاں کہیں پٹھان ہوتا وہاں آپنا آدمی بھیجنا اور جورو پئے مانگتا' سو دیتا اسی طرح بہت سے لوگ جمع کر استعداد تمام بہم پہنچائی پھر بہار کو اپنی پشت دے کر حریف کی فوج کے مقابل ہوا۔ اور اپنے لشکر کی گنجائش کے موافق ایک گڑھ بنایا اور قراولی شروع ہوئی لیکن ابراہیم شاہ کے ساتھ ہاتھی اور توپ خانہ بہت تھا اور اپنے لشکر پر ایسا مغرور تھا کہ شیر خاں کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور وہ گڑھ کی پناہ کے باعث ہر روز آکر لڑھتا اور بہتیرا ابراہیم خاں کے لشکر نے ارادہ کیا لیکن گڑھ کے باعث شیر خاں کے لشکر کو کچھ آزار نہ پہنچا سکتا تھا اور روہیلے جانبازی کرتے تھے اور جب فوج ابراہیم شاہ کی قلعہ کے پاس آتی بے کامیاب ہوئے پھر جاتی اور دونوں لشکروں میں سے کوئی کسی پر غالب نہ ہوتا' لیکن ابراہیم شاہ جو بنگالیوں کی تلوار پر مغرور تھا اور جانتا تھا لڑآئی کے دن بنگالی پٹھانوں پر غالب ہوویں گے ہاتھی اور توپ خانے اور لشکر کی کثرت کے سبب اب تلک ان کے مقابل رہے' اپنے پادشاہ کو عرضی لکھی کہ خداوند عالم از راہ تفضلات کے کمک بھجوادیں کہ شیر خاں نے گڑھ کی پناہ لی ہے اور میں اتنے لشکر کے ساتھ اسے گڑھ سے نہیں نکال سکتا پھر شیر خاں نے پٹھانوں کے سرداروں کو جمع کر کے کہا اتنے روزوں میں بنگالیوں سے میں نے صف جنگ نہیں کی گڑھ کی پناہ لی ہے اور تھوڑے لوگ نکالتا تھا۔ وہ ان سے لڑتے تھے اس واسطے کہ لشکر کی آوائی کی دہشت بری ہوتی ہے اور مجھے یقین تھا کہ بنگالی پٹھانوں سے لڑائی میں برابری نہ کرسکیں گے لیکن اس لیے میں نے تھوڑے دنوں گڑھ کی پناہ لی کہ پٹھان' بنگالیوں سے لڑیں اور احوال دونوں لشکر کے لوگوں کی جوانمردی کا معلوم کریں تا غرور بنگالیوں کا کم ہووے اور فوج کی کثرت اور دبدبہ آوائی کا روہیلوں کے دل سے دور ہووے' بعد اس کے میں صف جنگ کروں کہ بغیر صف جنگ کے

دشمن پراگندہ اور ہلاک نہ ہوسکیں گے الحمد اللہ جب پٹھانوں اور بنگالیوں میں لڑائی ہوئی پٹھان لڑائی میں غالب ہوئے اور وے ان سے لڑائی میں برابر نہیں ہو سکتے اب میرے دل میں یوں آتا ہے اگر سب عزیز متفق ہوں تو تڑکے ہی خدا کے فضل پر بھروسا کر کے اور اس آیہ کریمہ پر مد نظر کر کے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله پیشتر تھوڑے لوگ بہت لوگوں پر غالب ہوتے ہیں اب میں صف جنگ کروں کہ صف جنگ میں اہمال و درنگ کرنا مناسب نہیں ہے کیوں ان کی کمک آوے گی۔ سرداروں نے عرض کیا جو آپ کے مزاج مبارک میں آیا عین صواب اور اب کاہلی ڈھیل کرنی لڑائی میں خوب نہیں اور آپ خاطر جمع رکھیے کہ سب دل و جان سے لڑائی پر متفق ہیں اور اپنے مقدور پر جان فشانی میں کمی نہ کریں گے انشاءاللہ تعالیٰ جو اس کے باپ کو شربت شہادت کا پلایا تھا اسے بھی پلائیں گے اور کسو نوع کا اپنے دل میں اندیشہ نہ کیجئے لشکر کی بہتایت کا اور دشمن کے حشم کا کچھ خطرہ دل میں نہ لایئے کہ مارے ہوئے کو پھر بھی مار سکتے ہیں جب شیر خاں نے دیکھا کہ لڑائی میں بنگالیوں پر پٹھان دلیر ہیں پھر ان سے کہا ابراہیم خاں مجھے ہر روز کہلا بھیجتا ہے کب تلک گڑھ میں رہے گا باہر نکل کے صف جنگ کر اور اپنے لشکر کی کثرت پر غرور کرتا ہے اور پناہ گڑھ کی بھی نہیں لیتا البتہ اس سے صف جنگ کیا چاہیے اور اپنے وکیل کو اس کے پاس بھیجا چاہیے اور اسے کہلا بھیجئے کہ تو تڑکے ہی مستعد ہو کر آ اور میں بھی اپنی تیاری سے نکلوں اور باہم صف جنگ کریں۔

شیر خاں اور ابراہیم خان کی جنگ' شیر خان کی فتح' جلال خان کا فرار' شیر خان کا بہار پر قبضہ

جب شیر خاں نے عزیزوں سے یہ باتیں کیں انہوں نے قبول کیں۔ پھر شیر خاں نے ابراہیم خاں کو اپنے وکیل کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ تو مجھ سے اکثر کہتا تھا گڑھ کے باہر نکل کر صف جنگ کریں تا جوانمردی دونوں کی معلوم ہو جائے میرے دل میں تھا کہ تھوڑے دنوں لڑائی موقوف رکھیں کہ ہمارے تمہارے درمیان شاید صلح ہووے اگر تم صلح پر راضی نہیں تو تڑکے ہی اپنے لشکر کو آراستہ کر کے آؤ تا صف جنگ کریں دیکھیں طالع کس کی مدد کرے اور بخت کس کی یاوری' ستارہ

کلاہ کس کے سر پر رکھے فلک رخت کو کس کے در پے رکھے۔ ابراہیم خاں نے شیر خاں کے وکیل سے کہا ہمارے تمہارے درمیان ہرگز صلح نہیں ہے مگر جنگ جو کہلا بھیجا اس پر قائم رہو اور اپنے وعدے سے نہ پھرو پھر دھندھل کے ہی اپنے لشکر کے سمیت جنگاہ میں حاضر ہو' شیر خاں یہ بات سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے لوگوں سے کہا لڑائی کی تیاری کرو' ابراہیم خاں نے بھی فتح خاں سے کہا سب لوگ تڑکے ہی تیار ہو کر ہوں جب پہر رات رہی شیر خاں نے سارے لشکر کو گڑھ کے باہر بھیجا اور آپ بھی بعد نماز صبح کے باہر آیا اور سرداروں سے کہا حریف کے لشکر میں ہاتھی اور توپ خانہ اور فوج پیادوں کی بہت ہے اس طرح ان سے لڑائی چاہیے کہ جس طرح انہوں نے اپنا لشکر آراستہ کیا ہے' اس طور پر نہ رہے اور بنگالیوں کے سوار اپنے توپ خانے اور پیادوں سے جدا ہو جاویں اور ہاتھی گھوڑوں کے سوار ایک جا ہو جاویں تا ان کے لشکر کے بندوبست میں خلل پڑے۔ شیر خاں کے سرداروں نے عرض کیا کہ ہم تمہارے حکم کے تابع ہیں جس طرح فرماؤ گے اسی طرح سے لڑیں گے شیر خاں نے کہا بنگالیوں کی شکست کی تدبیر میرے دل میں یہ آتی ہے کہ اپنی بہت سی فوج یہ بلندی جو نظر آتی ہے اس کے پیچھے جا کر چھپے اور کتنے ایک سوار جو جنگ آزمودہ ہیں وہ ان کے مقابلے کو جاویں اور ان کے روبرو سے بطور شکست کے بھاگیں اور ان سے جو میں کہتا ہوں اس میں کچھ تفاوت نہ کریں ایک بار لڑ کر پھر نہ لڑیں اور ہزیمت کا فکر و اندیشہ نہ کریں اور ایسے لوگوں کو چن کر نکالوں کہ وہ بنگالیوں کے لشکر کے روبرو جا کر ایک باری تیر اندازی کر' وہاں سے بھاگیں' کیونکہ ابراہیم خاں اپنے باپ کے مارے جانے کا کینہ دل میں رکھتا ہے اور لشکر کی بہتایت کا غرا بھی۔ سمجھے گا کہ پٹھان بھاگے' ایک بارگی توپ خانے اور اپنے پیادوں کو پیچھے چھوڑ کر بے اختیار دوڑے گا اس کے لشکر کی آراستگی میں خلل ہو گا۔ بعد اس کے میرا لشکر جو ٹیلے کے پیچھے چھپا ہوا ہو گا وہ نکل کر ان سے لڑے گا' کیونکہ بغیر پیادے اور توپخانے کے بنگالیوں کے سوار پٹھانوں سے لڑائی میں برابری نہ کر سکیں گے خدا کے فضل سے امید یہ ہے کہ بنگالیوں کی شکست ہو گی اور بھاگیں گے۔

سب پٹھانوں نے شیر خاں کی اس تدبیر پر تحسین و آفرین کی اور خوش ہو کر عرض کیا کہ اس

سے بہتر لڑائی کی کوئی تدبیر نہیں بعد اس کے شیر خاں نے جو تدبیر ٹھہرائی تھی اسی طور پر اپنے لشکر سے لوگ چن کر نکالے اور انہیں سمجھایا ہم نے جو بات ٹھہرائی ہے اس میں تفاوت نہ کرو اور باقی لشکر ٹیلے کے اوجھل کر آ گیا جب فوج ابراہیم شاہ کی نمودار ہوئی ان سواروں نے موافق وعدے کے حریف' حریف کے مقابل ہوا ایک باری سب نے تیر چلا کر گھوڑوں کی باگیں پھیریاں۔ بنگالیوں کے سواروں نے جانا کہ روہیلے بھاگے اپنی جگہ کو چھوڑ کر جس طرح شیر خاں نے تصور کیا تھا بے محابا پٹھانوں کے پیچھے گھوڑے ڈالے جس وقت شیر خاں نے معلوم کیا کہ بنگالی توپ خانے اور اپنے پیادوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑے' شیر خاں نے جو چھپا ہوا تھا معہ لشکر نمودار ہوا' بنگالی گھبرائے اور فوج جو مصلحتاً بھاگی تھی وہ شیر خاں کے آ کے شامل ہوئی جس طرح کہ دستور پٹھانوں کا ہے ایک باری میں بنگالیوں کے لشکر میں پہنچے اور انہوں نے بھی استقلال کیا اور اپنی جاگیر پر قائم رہے پھر دونوں لشکروں میں لڑائی ہونے لگی اور بڑی ہی لڑائی کے بعد جب بہت سے لڑ و تیے نامی مارے گئے مشرق فتح کے کنارے سے آفتاب ابراہیم شاہ کا طلوع ہوا۔ بنگالیوں کے لشکر کی شکست ہوئی۔ ابراہیم خاں نے ہر چند کوشش کی اور بنگالیوں سے کہا پھرو اور ہمت کرو کہ پٹھانوں کا لشکر تھوڑا ہے پادشاہ کو کیا منہ دیکھاؤ گے' کچھ فائدہ نہ کیا۔ ابراہیم خاں کے لوگوں نے عرض کیا پادشاہ کے امراء سب بھاگے تمہارے ہمراہیوں سے تھوڑے سوار رہے ہیں اتنے لوگوں سے فتح ہوئی معلوم۔

جو دیکھے کہ یاری نہیں کرتے یار
غنیمت ہے میداں سے کیجئے فرار

ابراہیم خاں نے اپنے لوگوں سے کہا پادشاہ کو کیا منہ دکھاؤں گا اس نے اپنا حشم و لشکر میرے ساتھ کیا تھا اسے برباد کر کے میں جاؤں اور لوگ کہیں گے جب ابراہیم خاں بھاگ تب ہم بھی بھاگے۔ اس وقت میں کس کا نام لوں گا اور تھوڑے دن کی زندگی کے واسطے شرمندگی اٹھاؤں اور مثل ہے کہ اگر آب حیات عوض آبرو کے بکے تو نہ لیجئے۔ اس میں میری فتح ہوئے' یا مارا جاؤں اس نے بہت سا تردد کیا لیکن عمر جو آخر ہوئی تھی مارا گیا۔ جلال خاں بھاگ کر بنگالے کے پادشاہ کے پاس گیا۔ ہاتھی گھوڑے خزانہ اور حشم و توپخانہ سارا شیر خاں کے ہاتھ آیا اوران کے ہاتھ کے مارے

جانے کی ذلت سے چھوٹا اورا کثر بہار کے پرگنات کا حاکم ہوا حق سبحانہ تعالیٰ نے جو روز ازل سے چاہا تھا کہ شیر خاں کو ہندوستان کا ملک دے اور خلق خدا کی اس کے سایہ عدل میں امن اور رفاہیت سے زندگانی کرے اور وہ حاکم کامگار اور عدالت شعار ہو دن بدن دولت اس کی زیادتی پر تھی اور ملک اس کے قبضے میں آتا تھا اور وہ اس ملک کی عمارت و زراعت کے کرنے میں ایسا تردد کرتا کہ تھوڑے دنوں میں بہ نسبت سابقہ کے دونی آبادی ہوتی اس سبب سے کہ آپ ہی سب کی خبر لیتا اور ظالم اور سرکش کی خاطر نہ کرتا' اگر چہ اس کے اقرباء یا نہایت عزیزوں میں سے کوئی ہوتا اور جو کوئی اس کے پاس نوکری کو آتا پہلے ہی اس سے یہ کہہ دیتا جو کچھ تیرا درماہہ مقرر کروں گا وہ تجھے تمام و کمال دیا کروں گا اور اس میں دام و درم کم نہ کروں گا لیکن تو کسی سے نہ لڑیو اور ظلم و بدعت نہ کیجیئو اور جو کرے گا تو اس کے عوض میں ایسی سزا دوں گا کہ اور ونکو ڈر ہو تھوڑے دنوں میں نام نیک عالم میں نکالا اور شہرا ہوا کہ شیر خاں حق سپاہیوں کا دیتا ہے اور رعیت پر ظلم نہیں کرتا اور نہ کرنے دیتا ہے۔

لاڈ ملکہ سے شادی' قلعہ چنار پر قبضہ

عباس خاں بیٹا شیخ علی سروانی کا جو مولف شیر خاں کے احوال کا ہے اس کے قلعہ چنار کے لینے کا باعث اپنے اقرباء اور عزیزوں سے جو امرائے عظام اس کے ساتھ تھے ان سے اس طرح سنا ہے کہ سلطان ابراہیم نے چنار کا قلعہ تاج خان سارنگی کو سونپا تھا اور خزانہ پادشاہی بھی اس میں رہتا تھا۔ تاج خاں کا جو قبیلہ لاڈ ملکہ تھی یہ اس کے سلسلہ محبت کا قیدی تھا۔ سپاہ اور ملک کی تدبیر اس کے طور پت تھی اور تینوں بھائی جو تر کمانی تھے تاج خاں نے اپنی نیابت ان کو دی تھی۔ ایک کا میر احمد دوسرے کا میر داد اور تیسرے کا میر اسحاق نام تھا اور تینوں حقیقی بھائی تھے۔ سر براہ کار اور نہایت عاقل و دانا تھے' جب انہوں نے دیکھا کہ وہ لاڈ ملکہ کا محکوم ہے ضرورۃً اس سے بقسمیہ عہد و پیمان کیا کہ تم کسی طرح ہماری مخالفت نہ کرو اور ہم تمہاری دولتخواہی میں قصور نہ کریں گے' اور لاڈ ملکہ کے کوئی لڑکا نہ تھا اور تاج خاں کے اور قبیلوں سے لڑکے تھے لیکن اس کی محبت کے سبب اپنے لڑکوں کو تنگئ معاش میں رکھتا تھا' یہاں تک کہ اس کے ڈر سے لڑکوں کو کھانا بھی رات دن کا فراغت سے نہ

پہنچتا تھا۔ ہر چند اس سے احوال اپنا ظاہر کرتے تھے کچھ فائدہ نہ کرتا۔ ہمیشہ لڑکوں کو لاڈ ملکہ سے عداوت کینہ زیادہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک رات تاج خاں کے بڑے بیٹے نے لاڈ ملکہ کو تلوار ماری لیکن کارگر نہ ہوئی۔ وہیں اس کے لوگوں نے غل مچایا کہ تاج خاں تلوار کھینچے ہوئے آیا چاہے کہ بیٹے کو مارے۔ بولا اے لڑکے تو نے تلوار چلائی تھی اب میری تلوار کا وار دیکھ۔ اس کے بیٹے نے جانا لاڈ ملکہ کے واسطے مجھے مارے گا یہ سمجھ کر ایک وار لگا کر گھر سے بھاگ گیا اور تاج خاں اسی زخم سے شہید ہوا کیونکہ لاڈ ملکہ کے سبب سے تاج خاں کے بیٹے اس کے نائبوں اور اکثر لشکر کے سرداروں سے عداوت رکھتے تھے از بسکہ لاڈ ملکہ لائق اور سخاوت و مروت میں مشہور تھی۔ تاج خاں کے جیتے جی سارا لشکر اس سے راضی تھا اس کے مرنے کے بعد وہ بھی اس کے متفق ہوئے مگر تھوڑے لوگ جو برے تھے تاج خاں کے بیٹوں سے جا ملے خزانے کے باعث ہر روز لڑائی ہوتی کیوں کہ تاج خاں کے بیٹے نا قابل تھے۔ اس سبب سے اکثر لشکر کے سرداروں کی طرف رغبت نہ کرتے تھے۔ شیر خاں نے میر احمد کو مخفی کہلا بھیجا کہ میر داد کو میرے پاس بھیجو کتنی باتیں میرے جی میں ہیں، تم کو کہلا بھیجوں۔ میر احمد نے اپنے بھائیوں سے کہا ہر چند کہ لاڈ ملکہ کی قابلیت رکھتی ہے، لیکن رنڈی ہے۔ قلعہ اور خزانے کے بہت شخص خریدار ہیں اور یہ قلعہ کو نہ رکھ سکے گی پس بہتر اس سے یہ ہے کہ ہم شیر خاں کو دیں اور اسے اپنا منت دار کریں کہ ایک روز ہمارے کام آوے گا۔ بھائیوں نے بھی میر احمد کی رائے پسند کی اور لاڈ ملکہ کے پاس آئے اور شیر خاں کا خط دکھا کر عرض کیا کہ ہم تمہارے تابع ہیں جو کچھ فرماؤ اس پر عمل کریں۔ اس نے کہا میرا اختیار تمہارے ہاتھ ہے جو کچھ کرو گے مجھے قبول ہے، تمہارے برابر دو لتخواہ نہیں رکھتی ہوں اور میرے باپ کی جگہ تم ہو، میر احمد نے عرض کی۔ اگر آپ کی خاطر آزردہ نہ ہووے تو ایک بات میرے دل میں ہے، عرض کروں اس نے کہا کچھ دل میں خطرہ نہ لا جو تیرے جی میں آدے بے اندیشے کہہ میر احمد نے عرض کیا اگر قلعہ میں ہنگامہ نہ ہوتا تو بھی تم نہ رکھ سکتیں کس واسطے کہ تم عورت ہو اور تمہارے کوئی بیٹا بھی نہیں، قلعہ کے خریدار بہت سے ہیں کہ مکان پادشاہوں کا ہے اب تلک کسو نے ارادہ نہیں کیا، شیر خاں کو قلعہ دو اور اس کے عقد میں آؤ تو امن و امان میں رہو، کس واسطے کہ قلعہ و خزانہ پادشاہی ہے، تمہارے پاس کوئی نہ چھوڑے

گا اس نے کہا اپنے بھائی میر داد کو شیر خاں کے پاس بھیجتا وہ اس سے یہ قرار داد کرے کہ ہم قلعہ دیتے ہیں لیکن اس شرط سے کہ تو عہد کرے کہ جس بیٹے بد بخت نے اپنے باپ کو مارا ہے اس کی ناک اور کان کاٹے تا کہ اوروں کو کان ہوں جب میر داد شیر خاں کے پاس گیا اس سے بقسمیہ عہد و پیان کیا کہ لاڈ ملکہ اور تم تینوں بھائیوں کے ساتھ کسو نوع کی مخالفت نہ کروں گا اور مہمان داری کی رسم بخوبی بجالایا۔ کوئی فروگزاشت نہ کی اور ان کی آنے سے نہایت خوش ہوا' محبت و اخلاص حد سے زیادہ کیا اور کہا اگر لاڈ ملکہ میرے تئیں قلعہ دیوے اور مجھ سے نکاح کرے تو میں اس کا نہایت ممنون احسان ہوں گا مرغ دل کا شکار اکرنا احسان سے خوب ہے اور اچھے کاموں سے ہے میر داد نے کہا کہ خزانہ اور قلعہ سوائے پادشاہ کے دینا مناسب نہیں ہے لیکن جو بندہ آپ کی ملازمت میں آیا اور تم نے بہت اشتیاق' آرزو و تمنا اظہار کی اور میرا بھی اعزاز و اکرام بہت سا کیا اور مہمانداری کا بھی حق جتنا چاہیے بجالائے میرے دل میں بدلا اس کا سوائے اس کے کوئی نہیں آتا کہ یہ قلعہ تمہارے ہاتھ آوے اور میں بمقدور اپنے اس کی سعی میں قصور نہ کروں گا جناب باری سے یہ امیدواری رکھتا ہوں کہ وہ میرے کہنے کو عدول نہ کرے گی بعد اس کے جب کام تمہارا خاطر خواہ ہو تو ایسا معلوم نہ کیجیئو کہ موجب ہماری بدنامی اور شرمندگی کا ہو۔ شیر خاں نے اس کی خاطر خواہ جو وعدے کیے تھے ان پر بہت سی قسمیں کھائیاں اور میر داد کی تسلی کر کے کہا جب تلک جیتا رہوں گا تم سے کچھ بدی نہ کروں گا اپنے مقدور بھر لطف و احسان سے پیش آؤں گا تا اور لوگوں کو بھی میرے قول و قرار پر اعتماد ہو میری خدمت کی رغبت اور ملازمت کی آرزو کریں۔ میر داد نے موافق عہد و پیان کے کہا لازم ہے کہ جلدی چلو اور کاہلی نہ کرو۔ شیر خاں اس بات کے سنتے ہی سوار ہوا اور اپنے سارے سامان سے روانہ ہوا۔ میر داد نے آگے جا کر شیر خاں کے آنے کی خبر دی اور کہا قلعہ کے دینے میں ڈھیل نہ کرو لاڈ ملکہ نے اور اس کے بھائیوں نے قبول کیا اور میر داد کو پھر بھیجا کہ ابھی جا کر اسے اپنے ساتھ جلدی سے قلعہ میں لا کہ اب تلک اس بد بخت لڑکے کو خبر نہیں ہوئی اسی وقت میر داد نے جا کر شیر خاں کو قلعہ و خزانہ اور لاڈ ملکہ کے عقد میں آنے کا مژدہ سنایا اور اس کے ساتھ ہو قلعے میں لایا' پھر لاڈ ملکہ اور شیر خاں کا عقد اسی وقت بندھا۔ لاڈ ملکہ نے ڈیڑھ سو رقم جواہر کے بہتر

سے بہتر اور سات من موتی اور ڈیڑھ سو من سونا دیا بعد اس کے چنہار کے پرگنوں پر عمل کیا' پھر نصیر خاں کی جورو کہ جس کا نام کھر گسائیں تھا وہ اس کے عقد میں آئی اور سات من سونا بھی اس کے ہاتھ آیا اور صاحب قلعہ وخزانہ ہوا۔ سوار پیادے کی بہت سی جمعیت ہونے سے اس کے کام نے استحکام پایا۔

سلطان محمود

بعد اس کے سلطان محمود جو بیٹا سلطان سکندر کا تھا کہ جسے حسن خاں میواتی اور رانا سانگا اور بعضے پٹھانوں نے تخت پر بٹھایا تھا وہ فتح پور سیکری کے پرگنے میں جمشید ثانی ظل سبحانی بابر بادشاہ سے لڑا حسن خان بیٹا علاول خاں میواتی کا مارا پڑا اور راول نام راجہ دونگر پور کا تھا جب وہ بھی مارا گیا تب سلطان محمود اور رانا سانگا بھاگ کر چتوڑ میں آئے پھر سلطان محمود اس گردونواح میں مدت رہا' بعد اس کے پٹنے میں جانے کی یہ وجہ ہوئی کہ مسند عالی عیسیٰ خاں بیٹا مسند عالی عمر خاں ککھور کا جو حاکم لاہور کا تھا اور ابراہیم خاں اور احمد خاں اور پوتا مبارک خان یوسف خیل کا اور میاں پتن بیٹا میاں عطا شوہو خیل جو حاکم سرہند کا تھا اور میاں بایزید وغیرہ اس وقت باہم متفق تھے اور ملک پادشاہی میں خلل کرتے تھے' لیکن میاں ببن اور میاں بایزید صاحب جمعیت تھے اور مغلوں سے اکثر لڑتے تھے اور نام جوانمردی کا پیدا کیا تھا' ان امیروں نے سلطان محمود کو پٹنے میں بلا کر پادشاہ کیا۔ جب پادشاہ ان امیروں کے سمیت بہار کے ملک میں آیا تب شیر خاں کو بھی ضرور ہوا کہ ان امیروں سے دشمنی نہ کیا چاہیے کہ بیشتر ہیں اور بہت سا لشکر رکھتے ہیں اور شیر خاں پٹھانوں میں اتنا اعتبار نہ رکھتا تھا کہ ان سے دشمنی کر کے پیش لے جائے لاچار ہو کر سلطان محمود کی ملازمت میں آئی اور پٹھانوں نے بہار کا ملک آپس میں بانٹ لیا اور شیر خاں کو کہا جب جونپور کا ملک مغلوں سے ہم لیں گے تب بہار کا ملک تجھے دیں گے کہ تو نے بنگالیوں سے مار کے لیا تھا کچھ اپنے دل میں وسواس نہ کر جس طرح کہ بہار کا ملک سلطان سکندر نے دریا خاں کو مرحمت فرمایا تھا' سلطان محمود نے بہار کا ملک تجھے عنایت کیا ہے۔ شیر خاں نے عرض کیا اگر بادشاہ نے اس بندہ کو عنایت فرمایا ہے تو اس کا فرمان بندے کو مرحمت فرما دیں بادشاہ نے حکم کیا کہ فرمان لکھ دو' جب شیر خاں نے بہار کے ملک کا

فرمان حضور سے حاصل کیا اپنے لشکر کا سامان درست کرنے کے واسطے کئی ایک مہینہ کی پادشاہ سے رخصت لے کر جاگیر میں آیا۔

سلطان محمود کا جونپور پر حملہ' ہمایوں سے شکست کھانا

جب سلطان محمود نے اپنی فوج مکمل کی جونپور کی طرف کوچ کا ارادہ فرمایا۔ شیر خاں کو فرمان بھیجا کہ اس کے دیکھتے ہی جلدی حاضر ہو اس نے عرضی لکھی کہ اپنی فوج کا سامان درست کر کے حضور میں پہنچتا ہوں جب پادشاہ کے امراء شیر خاں کی عرضی کے مضمون سے مطلع ہوئے عرض کی کہ وہ مغلوں سے اخلاص رکھتا ہے پادشاہ کے ساتھ نہ جائے گا۔ مکر و حیلے کو اپنا پیشہ کیا ہے اور اس کے کہنے اور لکھنے پر اعتماد نہ کیا چاہیے' اسے نہ چھوڑیے۔ اعظم خاں ہمایوں سروانی نے عرض کیا کہ اس کے ساتھ لے چلنے کی تدبیر سہج ہے کچھ اندیشہ نہ کیجئے کہ شیر خاں اپنی جاگیر میں ہے جس جگہ وہ ہے کوچ فرما کے وہاں جایا چاہیے۔ اس کے نہ آنے کی سزا یہ ہے کہ مہمانیاں خوب سی اس سے لے کر ہمراہ لے چلیے پادشاہ نے اور اس کے امراؤں نے اعظم خاں کی رائے عالم آرائے پر بہت سی آفرین و تحسین کی اور کوچ بہ کوچ مہراؤں کے پرگنے میں کہ شیر خاں جس مقام میں تھا اس کے قریب پہنچے' اس نے سنا کہ پادشاہ اپنے سارے لشکر سمیت آتا ہے اور مجھے خواہ مخواہ ساتھ لے جائے گا اس بات سے متفکر ہو کر اپنے دولتخواہوں سے کہا کہ جو میں نے سوچا تھا وہ نہ ہوا پادشاہ کے امیروں سے اعظم خان ہمایوں سروانی اور مسند عالی عیسیٰ خان سروانی عاقل و دانا ہیں اور کاروبار ملکی میں نہایت رسا ہیں اپنی قومیت کی شرم اور قرابت قریبہ کے سبب اس لشکر کے ہمراہ ہیں لیکن جانتے ہیں ان لوگوں سے کچھ نہ ہو سکے گا کیونکہ اس لشکر کے امیر آپس میں اتفاق نہیں رکھتے اور بے اتفاقی سے کوئی کام نہیں ہو سکتا اور اس لشکر میں میاں ببن اور بایزید فرملی جمعیت بہت سی رکھتے ہیں اور نام بھی جوانمردی سے مشہور کیا ہے لیکن بے شعور ہیں اور امور ملکی کو نہیں پہنچ سکتے میں نے چاہا تھا حیلہ و حوالہ سے ان کو یہاں سے روانہ کروں جب یہ میرے ملک کی حد سے نکل کر آگے جاویں بعد اس کے ایک بہانہ کر کے رہ جاؤں لیکن ان دونوں سروانیوں کے سبب پادشاہ اس راہ سے آیا اب بہانہ کرنا مناسب نہیں یقینی اس لشکر کے ساتھ جانا ہوا تم اپنے لوگوں سے کہو کہ کوچ کی تیاری کریں اور

میں پادشاہ کے اور اس کے امیروں کے استقبال کو جاتا ہوں میں انہیں تسلی و دلا سا دے کر اپنی عذر خواہی کروں اور ان کو اپنے ساتھ لاؤں کہ مہمان عزیز ہیں لیکن تم ان کی مہمانی کا اسباب و اشیاء مہیا کر و بعد س کے شیر خاں پادشاہ کا استقبال کر کے لایا اور ہر ایک امیر کے مرتبے کے موافق خوب سا مہمانی کا سامان اپنے گھر سے تیار کر کے بھیجا اور پادشاہ کے واسطے پیش کش بہت سی اور مہمانی خوب سی بھیجی اور مہمانوں کی اینکی مہمانداری کی کہ سب نہایت راضی ہوئے اور ذکر خیر کرنے لگے شیر خاں نے پادشاہ سے عرض کی اگر تھوڑے دنوں حضرت توقف فرمائیں تو میں اپنے لشکر کا سامان درست کر کے ہمراہ رکاب کے ہوں پادشاہ نے شیر خاں کی عرض قبول کی اور چند روز وہاں دائرہ دولت رہا جب شیر خاں اپنے لشکر کی تیاری کر چکا تب پادشاہ اسے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوا جس وقت متصل جونپور کے پہنچا' سردار مغلیہ کہ جونپور میں تھے وہاں سے چلے گئے۔ جب جونپور پادشاہ کے ہاتھ آیا کتنے دنوں وہاں رہا اور اپنے لشکر کو آگے روانہ کیا بعد اس کے لکھنؤ اور ملک اس کے سرداروں کے ہاتھ آئے۔ اس عرصہ میں سلطان محمود نے سنا کہ ہمایوں پادشاہ کے رایات ظفر آیات اس سمت کو چلے سلطان محمود نے بھی جونپور سے کوچ کیا اور قریب لکھنو کے دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا ہر روز لڑائی ہوتی تھی مبازر طرفین سے نکل کر آتے تھے اور کارزار کرتے تھے۔ جس وقت شیر خاں نے معلوم کیا کہ پٹھانوں کے لشکر میں اتفاق نہیں' ہر ایک سرخود ہے' ہندو بیگ کو لکھا کہ میں خانہ زاد حضور کا ہوں اور یہ مجھے بزور ساتھ لائے ہیں لیکن لڑائی کے دن بدون لڑائی کے چلا جاؤں گا میرا احوال حضور معلیٰ میں عرض کرنا کہ میں روز نبرد کے خدمت نمایاں کروں گا۔ ان کے لشکر کی شکست کا باعث میں ہوں گا جب ہندو بیگ نے شیر خاں کی عرضی حضور میں گزرانی' پادشاہ نے ملاحظہ کر کے شیر خاں کو فرمان اس مضمون کا لکھ کر بھیجا' ان کے ساتھ جو تو آیا اس کا اپنے دل میں کچھ فکر و اندیشہ نہ کر اور جو کچھ تو نے اپنی عرضی میں لکھا ہے اگر وہ بات تجھ سے عمل میں آوے گی تو موجب تیری سرفرازی کا ہوگا۔ کتنے ایک دنوں کے بعد دونوں لشکروں کی صفیں آراستہ ہوئیں اور کارزار ہونے لگا۔ شیر خاں بغیر لڑائی کے اپنی فوج کو ساتھ لے کر نکل گیا اور سلطان محمود کے لشکر کی شکست کا وہی باعث ہوا۔ ابراہیم خاں یوسف خیل نے اس لڑائی میں بہت سا تردد اور جوانمردی

کی اور کوئی مرتبہ باقی نہ رکھا جب تلک کہ وہ جیتا رہا مغلوں کی جو فوج اس کے مقابل ہوتی تھی اسے پسپا کر دیتا تھا جب وہ شہید ہوا اور میاں بایزید نے اس روز ایسی حد سے زیادہ شراب پی کہ اس کے نشہ سے مست و بیخبر تھے چنانچہ اسی بے خبری میں مارے پڑے۔ پھر سلطان محمود اور باقی امیر بھاگ کر بہار کے ملک میں آئے۔ سلطان محمود صاحب ملک وخزانہ نہ تھا کہ لشکر اس کے طور پر رہے جن امیروں نے کہا سے تخت پر بٹھایا تھا ان میں سے اکثر لکھنو کی لڑائی میں مارے گئے اور بعضے جو جیتے رہے تھے مخالف کے باعث پراگندہ ہو گئے۔ سلطان محمود کو ناچ راگ سے بہت شوق تھا اور اکثر اوقات لہوولعب میں مشغول رہتا پٹھانوں کی مخالفت کا تحمل نہ کر سکا اور پادشاہت سے دست بردار ہو کر پٹنے کے ملک میں جا کر بیٹھ رہا۔ بعد اس کے کبھی سلطنت کا خیال نہ کیا اور نوسو انچاس ہجری میں اس کا وصال ہوا۔

قلعہ چنار پر ہمایوں اور شیر شاہ کی جنگ

جب حضرت ہمایوں پادشاہ نے سلطان محمود جو بیٹا سلطان سکندر کا تھا اس کی لڑائی ماری اور اکثر اعدا قتل میں آئے ہندو بیگ کو یقین فرمایا کہ شیر خاں سے چنار کا قلعہ لے جب اس نے ہندو بیگ کو قلعہ نہ دیا حکم ہوا کہ رایات نصرت آیات ہمارے چنار کے قلعہ کی طرف روانہ ہوں دیں شیر خاں نے جو سنا کہ ہمایوں پادشاہ قلعہ لینے آتا ہے اپنے بیٹے جلال خان کو کہ بعد شیر خاں کے مرنے کے وہی قائم مقام اس کا ہوا اور نام اپنا اسلام شاہ رکھا تھا اور جلال خاں جو بیٹا جلو کا تھا ان دونوں کو چنار کے قلعے میں چھوڑا اور اپنے اہل وعیال ساتھ لے کر ان پہاڑوں میں کہ جن پر اپنا نام کھدوایا تھا وہاں آیا اور یہاں ہمایوں پادشاہ نے قلعے کو محاصرہ کیا اور اس جگہ ہر روز لڑائی ہوئی کرتی تھی اور ان لڑائیوں میں دونوں سے ایسی جوانمردی ظہور میں آئی کہ کہنے اور لکھنے میں نہیں آ سکتی اور نام ان کی مردانگی کا اس لڑائی میں مشہور ہوا اور شیر خاں کا یہ قاعدہ تھا ہر ایک ملک کی طرف جاسوس بھیج کر وہاں کی خبر معلوم کرتا۔ ابیات

خبرداری کیا ہے گی اچھی متاع
ہو اس نقد سے خلق کو انتفاع
ہو ہوتا ہے آفات میں سربلند
کہ جو کار عالم میں ہو ہوشمند

اور شیر خاں جانتا تھا کہ ہمایوں پادشاہ ان ضلعوں میں بہت نہ رہے گا کس واسطے کہ خبردار اس کے خبر لائے تھے کہ سلطان بہادر جو پادشاہ گجرات کا تھا اس نے ملک مندو کا لیا اور دہلی کے لینے کا ارادہ رکھتا ہے تھوڑے دنوں کے بعد قصد کرے گا اور ہمایوں پادشاہ کو بھی خبر ہوئی ہے کہ سلطان بہادر دہلی کی طرف آیا چاہتا ہے شیر خاں نے اپنے وکیل کو قبلہ عالم کے پاس بھیجا اور عرضی میں لکھا کہ یہ غلام فرمانبردار حضور کا ہے اور تربیت کیا ہوا اسی خاندان کا ہے اور جو غلامی لکھنو کی لڑائی میں کی تھی حضور میں روشن ہے اگر جہاں پناہ چنہار کا قلعہ غلام موروثی سے لیں گے تو کسی اور خادم کو عنایت فرمائیں گے بندہ بھی اس بارگاہ کے خاموں سے ہے جو بندہ کو قلعہ چنہار کا عنایت فرماویں تو میں اپنے بیٹے قطب خان کو حضور میں بھیجوں اور اس طرف سے قبلہ عالم خاطر جمع فرماویں اگر اس بندہ سے یا اور کسور سالہ دار سے ایسی کوئی حرکت ظہور میں آئے کہ حضور کی دولتخواہی کے مناسب نہ ہووے تو غلام زادے کو جو حضور میں رہے گا اسے ایسی سیاست فرمایئے کہ اوروں کو عبرت ہووے جب ظل سبحانی نے اس کی واجب العرض ملاحظہ فرمائی وکیل کو ارشاد فرمایا کہ اس شرط سے شیر خاں کو چنہار کا قلعہ دوں گا کہ جلال خان کو میرے ساتھ کر دے شیر خاں نے عرض کیا کہ لڑکے ماں باپ کے نزدیک شفقت و مہربانی میں برابر ہیں، میرے نزدیک جلال خاں قطب خاں سے بہتر نہیں ہے لیکن میرے دشمن بہت ہیں اور میں نے عہد کیا ہے کہ کسو متنفس کو نہ چھوڑوں کہ پادشاہ کے ملک میں بعد پادشاہ کے آوے اور کسی کو آزار دے کہ اس عرصہ (میں) خبر پہنچی مرزا محمد زماں جسے بیانے کے قلعہ میں قید کیا تھا وہ فرمان لباسی دکھا کر بند سے چھوٹا اور ملک میں ہنگامہ برپا کیا اور سلطان بہادر جو گجرات کا پادشاہ ہے وہ ملک دہلی کے آنے کا ارادہ رکھتا ہے شیر خاں کے وکیل سے کہا وہ حضور کا دولتخواہی ہے، مابدولت نے اس کی عرض قبول کی قطب خاں کو حضور میں بھیجے کہ چنار کا قلعہ

ہم نے اسے عنایت فرمایا یہ سنتے ہی شیر خاں نے خوش ہو کر اپنے بیٹے قطب خاں اور عیسیٰ خاں حجاب کو ہمایوں پادشاہ کی خدمت میں بھیجا (19) اور عالم پناہ نے آگرہ کی طرف مراجعت فرمائی۔

ہمایوں کا گجرات پر حملہ شیر شاہ کا اپنی قوت بڑھانا

سلطان بہادر نے جو فتنہ برپا کیا تھا اس کے دفع کرنے میں مصروف ہوا اس عرصے میں شیر خاں نے فرصت پا کر کسو دشمن کو بہار کے ملک میں نہ چھوڑا اور پٹھانوں کا تربیت کرنا شروع کیا اور بعض پٹھانوں نے جو حوادثات زمانہ سے فقیر و پریشان ہوئے تھے ان کو گدائی کے حال سے نجات دے کر سپاہیوں کی ذیل میں داخل کیا اور جنہوں نے سپہ گری اختیار نہ کی اور گدائی کا پیشہ لیا انہیں مار ڈالا اور کہا' جو پٹھان کہ سپاہی نہ ہوگا اسے مار ڈالوں گا اور پٹھانوں کی لڑائی کے دن بہت ہی احتیاط کرتا تا کہ تا بیجا نہ مارے جاویں' جب روہیلوں نے سنا کہ شیر خاں پٹھانوں کی نہایت خواہش رکھتا ہے ہر ایک طرف سے اس کے پاس نوکری کو آئے۔ اور جب سلطان بہادر شکست پا کر سورت (20) کے ملک میں گیا جتنے پٹھان کہ سلطان بہادر کی ملازمت میں تھے امراء وغیرہ سب شیر خاں کے پاس آئے اور بعضے بڑے بڑے سردار کہ شیر خان کی ہمراہی سے عار رکھتے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ اقبال اس کا روز بروز ترقی پر ہے ترک عار و ننگ کا کیا اور اس کی ملازمت اختیار کی جیسے کہ مسند عالی عیسیٰ خاں بیٹا ہیبت خان سروانی کا اور اعظم ہمایوں سروانی اور میاں بن شاہو خیل اور قطب خان موجی خیل اور میاں معروف فرملی اور اعظم ہمایوں بیٹا سلطان عالم شاہو خیل کا اور کوئی پٹھانوں سے نامی سردار نہ رہا کہ اس کی خدمت میں نہ آیا اور اس نے اپنا خطاب حضرت اعلیٰ مقرر کیا اور بی بی فتح ملک بیٹی میاں محمد کالا پہاڑ فرملی کی صاحب خزانہ تھی اور میاں مذکور بھانجا سلطان بہلول کا بڑا صاحب تدبیر تھا' سپاہ تھوڑی رکھتا تھا اور خزانہ کے جمع کرنے کی خواہش بہت تھی اور سلطان بہلول نے تمام سرکار اودھ کی اور پرگنے بھی اس کی جاگیر کر دیئے تھے اور باپ کے ورثے سے بھی خزانہ اس کے ہاتھ آیا تھا اور سلطان بہلول اور سکندر اور سلطان ابراہیم کے عہد تلک اس کی جاگیر میں کچھ خلل نہ ہوا اور اس مدت میں خزانہ کے جمع کرنے کے سوا اور کام کی طرف متوجہ نہ تھا یہ بات ثقہ لوگوں سے سنی ہے کہ تین سو من زر سرخ کی چاشنی جمع ہوئی تھی اور سوا جواہر اور

سونے کے کچھ مول نہ لیتا تھا اور بی بی فتح ملک کے سوا کوئی اولاد نہ تھی اور بی بی فتح ملک کے بیٹے کا
نام شیخ مصطفیٰ رکھا تھا سلطان ابراہیم کے عہد اخیر میں جب میاں محمد کالا پہاڑ کی وفات ہوئی اور
ایک بیٹا مجہول النسب بھی تھا کہ نام اس کا میاں نغمو تھا اور مجہول النسبی کا اس کے سبب یہ ہے کہ
میاں محمد کالا پہاڑ نے اپنی حرم غلام کو بخش دی تھی جب اس لونڈی کو غلام سے چھین کر اپنے گھر میں
رکھا تب اس لڑکے کو اپنا بیٹا کر مشہور کیا اور وہ لڑکا قابل ہونکلا۔ سلطان ابراہیم ۔نے میاں محمد کالا پہاڑ
کا اسے قائم مقام کیا اور تھوڑا سا خزانہ میاں مذکور کا اور کتنے ایک پرگنے سرکار اودھ کے میاں نغموں
کی جاگیر دیئے اور بہت سا خزانہ میاں مذکورٔ بی بی فتح ملک کی ملک میں رہا اور سلطان ابراہیم کے
عہد میں اور بعد اس کے بھی میاں مصطفیٰ نے کارزار نمایاں کیے بزرگوں کی زبانی یوں سنا ہے کہ
سلطان ابراہیم کے عصر میں میاں مصطفیٰ اور میاں معروف فرملی سے ملک کے لیے نزاع ہوئی
آخرش لڑائی ٹھہری اور قاعدہ میاں مصطفیٰ کا یہ تھا جس وقت کہ لڑائی پر سوار ہوتا تو شیخ محمد
سلیمان (21) جو اس کی اجداد میں تھا کئی من حلواہ پکوا اس کے نام فاتحہ دلوا فقرا کو دیتا بعد اس کے
لڑائی پر چڑھتا چنانچہ اسی طرح سواز ہوا اور میاں معروف دعائیں پڑھنے میں مشغول تھا کہ میاں
مصطفیٰ کی فوجیں نزدیک پہنچیں ایک راجپوت ظریف کہ نوکر میاں معروف کا تھا ان سے کہا کہ
وقت دعا پڑھنے کا نہیں ہے کہ فوجیں پہنچیں انہوں نے کہا کہ دشمنوں کی ہزیمت کے واسطے شیخ محمد
سلیمان نے جو دعائیں فرمائیں ہیں ان کو پڑھتا ہوں اس راجپوت نے کہا اٹھ سوار ہو کہ شیخ محمد
سلیمان حلوے کو چھوڑ کر دعا پڑھنے سے تیری مدد کو نہ آوے گا اور اسی لڑائی میں میاں معروف کی
شکست ہوئی جب میاں مصطفیٰ کا وصال ہوا ان کی ایک خورد سال بیٹی مہر سلطان نام رہی اور بی بی
فتح ملک بہت قابل تھی میان بایزید چھوٹا بھائی جو میاں مصطفیٰ کا تھا بی بی فتح ملک نے اس کو سمجھا کر کہا
تو فوج رکھ پیسا میں دوں گی میاں بایزید نے اس پیسے سے بہت سی جمعیت پیدا کی اور بڑے بڑے
کام کیے چنانچہ ظل سبحانی ہمایوں پادشاہ کی فوج سے لڑا اور فتح پائی اور نام میاں ببن اور بایزید کا
مشہور ہوا اور ان کے مارے جانے کا احوال جو لکھا تھا اس واسطے مکرر نہ لکھا گیا جب میاں بایزید مارا
پڑا بی بی فتح ملک بہار کے ملک میں تھی خزانہ کی حفاظت کے واسطے بہت سے لوگ رکھ ملک بہار کے

نزدیک جو پہاڑ تھے ان میں آ کر چاہا کہ بیٹے کی طرف جاوے کہ وہاں کے راجہ نے جو پٹھان زردار تھے ان سے برا سلوک کیا تھا جب میاں بایزید مارا پڑا اور سلطان محمود نے پادشاہت ترک کی تب بیٹے کے راجہ نے جانا کہ پٹھانوں کے سلسلہ دولت کو زوال آیا ان پٹھانوں کے مال پر کہ جنہوں نے اس کی پناہ لی تھی دست ظلم دراز کیا یہ خبر جو بی بی فتح ملک کو پہنچی بیٹے کا جانا مارے ڈر کے موقوف کیا اور بہت خوش ہوئی' جو ہیں شیر خان نے سنا اس فکر و تردد میں ہوا کہ کسو مکر و حیلے سے بی بی فتح ملک کو اپنے قابو میں لائے مبادا بی بی فتح ملک کسو اور راجہ کے ملک میں جاوے اور یہ خزانہ مفت میرے ہاتھ سے جاتا رہے اور یہ حسرت ندامت قیامت تلک میرے دل سے نہ نکلے اپنے وکیل کو بی بی فتح ملک کے پاس بھیجا اور اس مضمون کی عرضی لکھی کہ سارے امراء اور امرازادے سلطان بہلول اور سلطان سکندر کے اس دیار میں تشریف لائے اور بندہ کو سرفراز کیا اپنی قومیت کے ننگ سے جمع ہوئے اور میں نے بھی ان کی خدمت کے واسطے برضا و رغبت کمر باندھی ہے اور تم دو وجہ سے پٹھانوں کی قوم پر حق و حرمت رکھتی ہو ایک یہ کہ تم شیخ سلیمان کی اولاد میں ہو اور دوسرے سلطان بہلول سے نسبت فرزندی کی رکھتی ہو مجھ سے ایسی کیا تقصیر ہوئی ہے کہ تم نے اس طرف کے آنے میں توقف فرمایا اس دیار کے لوگوں پر اعتماد نہیں رہا جو تم ان پہاڑوں میں پھرتی ہو عیاذاً باللہ اگر آپ کے ملازموں کو کسو نوع کا آسیب پہنچے تو یہ بدنامی میرے واسطے قیامت تلک رہے گی اس لیے کہ لوگ کہیں گے کہ شیر خاں سے اطمینان خاطر نہ تھی کہ اس کا ملک میں نہ گئی جب وکیل شیر کا بی بی صاحب کی ملازمت میں گیا اور شیر خاں کی عرضی اس نے ملاحظہ کر اس کے جواب میں لکھا اگر تو مجھ سے عہد و پیمان بقسمیہ کرے تو میں آؤں اس نے قبول کیا بی بی فتح ملک نے ایک آدمی اپنا معتبر شیر خاں کے پاس بھیجا۔ خان مذکور نے اس کے روبرو قسمیں سخت سخت کھائیں تب بی بی آئی اور ایک مدت وہاں تھی۔

شیر خان کا بنگالہ پر قبضہ

نصیب شاہ جو بنگالے کا حاکم تھا جب اس کا وصال ہوا بنگالے کے امیروں نے سلطان محمود کو حاکم کیا لیکن بنگالے کے ملک کا وہ کچھ بندوبست نہ کر سکا اور اس ملک میں ہنگامہ رہنے لگا۔ تب

شیر خاں کا یہ ارادہ ہوا بنگالے کا ملک لیجئے تین سو من سونا بی بی فتح ملک سے جو بیٹی میاں محمد کالا پہاڑ فرملی کی تھی اس سے لیا اور بی بی کے پاس تھوڑا سا سامان اس کی معیشت کے واسطے چھوڑا کہ وہ کسو اور کی محتاج نہ ہووے اور کتنے ایک گاؤں بطور مدد معاش کے دیئے' جلال خاں نے چاہا کہ بی بی اپنی پوتی مہر سلطان کو مجھے دے' بی بی نے قبول نہ کیا شیر خاں نے یہ بات سن کر جلال خاں کو منع کیا بی بی نے اپنی پوتی کو سلطان سکندر جو اس کا رشتہ دار تھا اسے دیا اور وہ بہت نا قابل نکلا۔ جب تلک کہ مہر سلطان جیتی رہی سامان خوب تھا سلیمان ثانی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے عصر اور سن ایک ہزار ستانوے (22) ہجری میں مہر سلطان ہندوستان کی طرف جاتی تھی کہ کانت کے پرگنے میں پہنچ کر مظفر خاں کے گھر میں موئی اور شیر خاں نے زر مذکور سے لشکر کا سامان درست کر کے ملک بنگالے کا لینا شروع کیا اور جتنا ملک تیلیا گرہی کے اس طرف تھا وہاں تلک سب اپنے تصرف میں لایا۔(23)

ہمایوں اور شیر شاہ کی پہلی جنگ

جب حضرت ہمایوں پادشاہ گجرات سے آئے خانخانان یوسف خیل نے عرض کیا' شیر خاں سے غافل نہ رہیے کہ فتنہ ہے اور ملک کی تدبیر خوب جانتا ہے اور سب پٹھان اس کے پاس جمع ہوئے ہیں لیکن حضرت ہمایوں بادشاہ کو سلطنت کا از بسکہ غرور تھا' شیر خاں اس کی نظر میں نہ ٹھہرتا تھا اور برسات کے موسم میں پادشاہ نے آگرہ میں توقف فرما' ہندو بیگ کو یہ فرما کر جونپور کی طرف رخصت کیا کہ جتنا شیر خاں کا احوال ہے جو نکاتوں لکھ' جب شیر خاں کو معلوم ہوا کہ پادشاہ کا ارادہ بہار کے ملک کے آنے کا ہے ہندو بیگ جو حاکم جونپور کا تھا اس کے واسطے پیشکش بھیجی اور کہا پادشاہ سے جو وعدہ میں نے کیا تھا اس میں کچھ مجھ سے تفاوت نہیں ہوا اور تمہارے ملک میں دخل نہیں کیا از راہ مہربانی میری دولتخواہی حضور میں ظاہر کر' مانع ہو' کہ اس ضلع میں نہ آویں کہ اس بارگاہ کا ایک میں بھی خدمت گار اور دولتخواہوں سے ہوں۔ جس وقت ہندو بیگ نے شیر خاں کے تحفے دیکھے بہت خوش ہو کر اس کے وکیل سے کہا کہ شیر خاں سے کہو کہ جب تلک میں جیتا ہوں سب طرح سے اپنی خاطر جمع رکھ کہ تجھ سے کسو سے آزار نہ پہنچے گا اور اس کے وکیل کے روبرو وہی ہندو بیگ نے

پادشاہ کو عرضی لکھی کہ ایک شیر خاں بھی حضور کے دولتخواہوں سے ہے۔ خطبہ وسکہ حضور کے نام کا جاری رکھتا ہے اور اپنے ملک کی حد سے تجاوز نہیں کیا اور حضرت کے دائرہ دولت کے جانے کے بعد کوئی اس سے ایسی حرکت ناشائستہ عمل میں نہیں آئی کہ موجب ملال کا ہو' ہندو بیگ کی عرضی پادشاہ نے ملاحظہ فرما کر اس سال توقف کیا۔ شیر خاں نے اپنے بیٹے جلال خان اور بڑے خواص خاں کو اور امیروں کو بھی متعین کیا کہ بنگالے کا ملک اور گوڑ کا شہر سلطان محمود سے لیں جب جلال خاں اور خواص خاں بنگالے کے ملک میں آئے سلطان محمود ان سے لڑائی کی تاب نہ لا سکا اور گوڑ کے قلعے میں محاصرہ ہوا پٹھانوں نے گردونواح کا ملک لے لیا گوڑ کے قلعے کو بھی مانند مرکز کے گھیر کو بیٹھے اور ہر روز لڑائی ہوا کرتی تھی۔

ہمایوں کا بنگالہ پر حملہ۔ فتح چنار

دوسرے سال (24) حضرت ہمایوں پادشاہ کے بہار اور بنگالے کا ملک کی طرف رایات نصرت آیات روانہ ہوئے جب چنار کے قلعہ کے پاس پہنچے اپنے امراؤں سے پوچھا کہ ہم پہلے چنار کا قلعہ لیں یا گوڑ کی طرف جاویں کہ شیر خاں کے بیٹے نے محاصرہ کیا ہے لیکن اس کے ہاتھ ابھی نہیں آیا ہے جو مغل کہ امیر تھے انہوں نے عرض کیا کہ پہلے چنار کے قلعے کو لیجئے بعد اس کے بنگالے کی طرف جائیے اور بھی تدبیر ٹھہری۔

جب خانخانان یوسف خیل آیا ظل سبحانی ہمایوں پادشاہ نے اس سے پوچھا اور وہ بھی سن چکا تھا کہ امرائے مغلیہ سے یہ صلاح ٹھہری ہے کہ پہلے چنار کا قلعہ لیا چاہیے خانخانان یوسف خیل جو پٹھان کی قوم سے تھا اس نے عرض کی کہ ایک تدبیر جوانانہ یہ ہے کہ پہلے قلعہ لیجئے اور دوسری رائے پیرانہ ہے کہ گوڑ کے قلعے میں خزانہ بہت سا ہے پہلے اسے لیا چاہیے بعد اس کے چنار کا قلعہ لینا آسان ہے۔ ظل سبحانی ہمایوں پادشاہ نے فرمایا کہ میں جوان ہوں مجھے رائے جوانانہ پسند ہے' قلعہ بن لیے نہ جاؤں گا' میں نے خان خانان یوسف خیل کے ان مصاحبوں سے جو پٹھانوں سے معتمد اور اس کے اسرار کے محرم تھے جب خانخانان اپنے ڈیرے میں آیا کہنے لگا شیر خاں کے طالع بڑے زبردست ہیں کہ مغل گوڑ کی طرف نہ گیا جب تلک یہ قلعہ لیں گے روہیلے گوڑ کو فتح کریں گے

اورخزانہ ان کے ہاتھ آوے گا اور شیر خاں غازی خان سوار اور سلطان برواتی (25) جو چنار کے قلعے کے شقدار تھے ان کو چنار کے قلعے میں چھوڑ کر اپنے اہل و عیال اور پٹھانوں کے جو اس کے ساتھ تھے بھر کنڈھ (26) کے قلعے میں ان کی گنجائش نہ ہوئی۔

قلعہ رہتاس کے متعلق چورامن سے گفت وشنید

شیر خان کو رہتاس کے راجہ سے ایک سلسلہ محبت و دوستی کا تھا خصوصاً چورامن کے ساتھ جو نائب راجہ مذکور کا تھا نہایت اخلاص و یگانگی تھی اور چورامن ذات کا برہمن تھا اور راجہ کو اس پر بالکل اعتماد تھا۔ آگے اس سے اہل و عیال کے ساتھ میاں نظام کہ شیر خاں کا حقیقی بھائی تھا از راہ مروت کے رہتاس کے قلعہ میں جگہ دلوا دی تھی جب وہ ہنگامہ برطرف ہوا' تب قلعہ راجہ کے حوالہ کر اپنے اہل و عیال لے آیا۔ ان دنوں میں شیر خاں نے بھی اس سے کہا کہ مجھے بہت ضرور ہے اگر تھوڑے دنوں کے واسطے بطور عاریت کے رہتاس کا قلعہ دیں تو جب تلک جیتا ہوں منت دار رہوں گا' جب یہ فساد برطرف ہوگا' تمہارا قلعہ تمہیں دیں گے۔ چورامن نے کہا خاطر جمع رکھ کہ رہتاس کا قلعہ راجہ سے دلوا دوں گا۔ پھر اس نے راجہ کے پاس آ کر کہا کہ شیر خان کو نہایت مشکل پیش آئی ہے اور تم سے التجا کرتا ہے کہ اپنے اہل و عیال کے واسطے عاریت رہتاس کا قلعہ چاہتا ہے کیوں کہ تمہارا ہمسایہ ہے مصلحت وقت یہ ہے کہ اس پر احسان کرو اور اس کے قبائل کو جگہ دو۔ راجہ نے قبول کیا۔ جب شیر خاں نے اپنے اہل و عیال کو بھر کندھ سے نیچے لایا راجہ اپنے قرار سے پھر گیا اور کہا جن دنوں میں کہ میں نے میاں نظام کو قلعے میں جگہ دی تھی' ان دنوں ان کی جمعیت کم تھی اور میں غالب تھا اور اب ان پاس لوگ بہت ہیں اور میرے پاس تھوڑے اور وے اب غالب ہیں۔ رہتاس کا قلعہ مجھ سے لے کر اگر نہ دیں تو مجھ پر غالب ہیں۔ میں بزور نہیں لے سکتا۔ چورامن نے شیر خاں کو کہلا بھیجا بعضے جو مجھ سے مخالفت رکھتے ہیں انہوں نے راجا کو بدراہ کر' قلعے کے دینے سے باز رکھا ہے۔ جب شیر خاں نے یہ خبر سنی بہت فکر مند و غمگین ہو چورامن کو کہلا بھیجا کہ میں تمہارے کہنے پر اعتماد کر کے اپنے قبائل بھر کندے سے نیچے لایا تھا' اگر یہ خبر بادشاہ کو پہنچی تو فوج بھیج کر سارے قبائل پٹھانوں کے اسیر کرے تو یہ وبال تمہاری گردن پر ہوگا' اور چھ من سونا رشوت کا چورامن کو بھیج

دیا اور کہا جس طرح ہو سکے یہ قلعہ تھوڑے دنوں کے لیے ہمارے قبائل کے واسطے لو اور اگر راجہ نے بطور رعایت کے رہتاس کا قلعہ نہ دیا تو پادشاہ سے صلح کروں گا اور راجہ سے بے وجہ سمجھوں گا۔ چورامن نے کہا خاطر جمع رکھ کہ راجہ سے تیرے قبائل کے واسطے قلعے میں جگہ دلوا دوں گا' پھر چورامن نے راجہ سے آ کر عرض کیا آپ کو یہ مناسب نہیں ہے کہ وعدہ خلافی کریں اگر ہمایوں پادشاہ کو یہ معلوم ہوا کہ شیر خاں کے اہل وعیال کے رہنے کا کچھ ٹھکانا نہیں ہوا تو ان کو تاخت تاراج کرے گا اور یہ ہماری تمہاری گردن پر وبال ہوگا اور وہ تمہارے کہنے پر اعتماد کر کے اپنے اہل و عیال کو بھرکندے کے قلعے سے اتار لایا ہے جب شیر خاں نہایت تنگ آئے گا ضرورتاً پادشاہ سے صلح کر کے تجھ سے لڑے گا اور تو شیر خاں سے لڑائی کی تاب نہیں رکھتا' بے موجب کیوں دشمنی کرتا ہے اور اپنے ملک میں کس واسطے خلل ڈالتا ہے اور میں برہمن ہوں وہ میری بات پر اعتماد کر کے اپنے اہل وعیال کو بھرکندے کے قلعے سے لایا ہے اگر اس کے قبائل مارے گئے اور بندی ہوئے تو ان کا وبال میری گردن پر ہوگا اگر تو رہتاس کے قلعے میں ان کو جگہ نہ دے گا تو میں زہر کھا کر تیرے دروازے پر مروں گا۔ جب راجہ نے چورامن کی یہ حالت دیکھی شیر خاں کے اہل وعیال کے واسطے قلعہ میں جگہ دینی قبول کی' ابھی شیر خاں نے یہ بات نہ سنی تھی جو اس عرصہ میں جلال خاں کے لشکر سے خبر آئی کہ بڑا خواص خاں گوڑ کے قلعے کی خندق میں غرق ہوا اور یہ بھی خبر سنی کہ ہمایوں پادشاہ نے چنار کے قلعے کو محاصرہ کیا تھا۔ پھر صلح کر کے لے لیا یہ سن کر بہت متفکر و حیران ہو خواص خاں کے چھوٹے بھائی کو کہ جس کا نام صاحب خاں تھا اسے خطاب خواص خاں کا دے رخصت کر بہت سی تقید کی کہ ظل سبحانی ہمایوں پادشاہ نے چنار کے قلعہ کو لیا ہے اور بنگالے کی طرف تھوڑے دنوں کے درمیان متوجہ ہوگا۔ تم قلعے کے لینے میں کاہلی نہ کرو۔

گوڑ پر قبضہ

جس روز کہ خواص خاں گوڑ میں پہنچا' جلال خاں سے عرض کیا کہ اس طرح حکم ہوا ہے کہ گوڑ کا قلعہ لینے میں اہمال و درنگ نہ کرو کہ پادشاہ بھی پیچھے آتا ہے جلال خاں نے کہا اچھا آج اور بھی صبر کر پھر اس نے کہا میں خلاف حکم نہ کروں گا۔ سوار ہوا چاہیے جلال خاں نے کہا کہ اچھا تم اپنے

ڈیرے جاؤ' جب خواص خاں اس سے رخصت ہو بھائی کے ڈیرے میں آیا سردار بھائی کے اس کے دیکھنے کو آئے اس نے ان کی تسلی کی اور کہا حکم حضرت اعلیٰ کا یوں ہوا ہے کہ پہنچتے ہی ایسا تردد کرو کہ قلعہ لے لو اور اس میں ڈھیل وسستی نہ کرو نقیبوں کو حکم کیا کہ فوج کو خبر کرو کہ تیار ہو کر سوار ہو آوے کہ فرصت نہیں ہے آپ بھی' سلاح پہن' مستعد ہو' سوار ہوا اور جلال خاں کو اپنے وکیل کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ میں بموجب حکم حضرت اعلیٰ کے ساری فوج سے سوار ہوا ہوں۔ خود بدولت بھی سوار ہوں انشاء اللہ تعالیٰ فتح ہوگی۔ جلال خاں اور شجاعت خاں وغیرہ کو بھی یہ بات خوش نہ آئی لیکن بضرورت سوار ہوئے اور خواص خاں نے آپ ہی ایسا ارادہ و دلیری کی کہ جلال خاں آنے نہ پایا اور قلعہ فتح کیا اس روز سے لوگوں کے درمیان خواص خاں کا نام شجاعت سے مشہور ہوا اور بعد اس کے بھی جہاں گیا وہاں فتح کی۔ شیر خاں کے لشکر میں شجاعت وسخاوت مثل ونظیر نہ رکھتا تھا اور جب گوڑ کا قلعہ فتح ہوا' جلال خاں نے خواص خاں کے نام کا فتح نامہ اپنے باپ کے پاس لکھ کر بھیجا جب یہ خبر شیر خاں کو پہنچی بہت خوش ہوا اور چورامن نے بھی شیر خاں سے آکر عرض کی' راجہ نے رہتاس کے قلعہ میں تمہارے قبائل کو جگہ دینی قبول کی' جب شیر خاں اپنے اہل وعیال کو لے کر قلعے کے نزدیک آیا' راجہ سے بہت سی اپنی خصوصیت اور منت داری اظہار مال ومتاع دنیاوی اور نقد وجنس بہت سی دے' وعدہ کیا اگر اقبال نے میرے یاوری کی تو میں تیرا احسان نہ بھولوں گا راجہ نے بہت خوش ہو کر عرض کی کہ رہتاس کا قلعہ تمہارا ہی ہے حکم کرو تمہارے قبائل آویں شیر خاں نے اپنے لوگوں کو سمجھایا تھا جو کوئی قلعہ میں جائے نہ آئے بعد اس کے آپ آیا اور قلعے کو چاروں طرف سے پھر کر دیکھا اور شکر خدا کا بجا کر کہا' گو چنار قلعہ میرے ہاتھ سے گیا لیکن اس سے بہتر قلعہ میرے ہاتھ آیا۔ گو اس کی فتح سے اتنا خوش نہ ہوا تھا کہ اس قلعے کے ہاتھ آنے سے خوش ہوا۔ قلعے کے نگہبانوں کو کہلا بھیجا کہ تم راجہ کے پاس جاؤ کہ تمہارا پٹھانوں کے ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے تمہارے رنج کا سبب ہوگا اپنے لوگوں سے کہا اگر قلعے کے نگہبان تمہارے کہنے سے نیچے نہ جاویں تو مار مار کر نکال دو شیر خاں کے لوگ جو تیار تھے قلعے کے نگہبانوں کے پاس جا کر جو کچھ شیر خاں نے کہا تھا کہا۔ انہوں نے قبول نہ کیا۔ شیر خاں کے لوگوں نے دست بشمشیر ہو کر انھے مار مار قلعے سے نکال دیا اور ان کی جگہ

اپنے نگہبان مقرر کیے' اوراس کی حفاظت میں نہایت احتیاط کرتے تھے اس طرح سے رہتاس کا قلعہ ہاتھ آیا تھا جولکھا گیا۔

کیا شیر شاہ نے راجہ رہتاس کو دھوکا دیا؟

جس طرح خاص و عام میں شہرہ پایا ہے کہ شیر خاں نے عورات کے بہانے ڈولیوں میں پٹھانوں کو بھیجا بعداس کے قلعہ لیا یہ سراسر بہتان اور جھوٹ تھا۔ یہ بندہ عباس خاں بیٹا شیخ علی کا جو مولف تاریخ تحفہ اکبرشاہی کا ہے اس نے پٹھانوں کے سرداروں سے جو امرازادے تھے اور اب بھی وے امیر ہیں اوراس معرکہ میں شیر خاں کے ساتھ تھے اور جیسے کہ امیر الامراء مظفر خاں بھتیجا مسند عالی عیسیٰ خاں بیٹا مسند عالی عمر خاں سروانی کا اور شیخ محمد بیٹا شیخ بایزید سروانی کا اور کتنے ایک اس معاملے میں جو شیر خاں کے ساتھ تھے تحقیق کیا ہے انہوں نے بندے سے کہا لازم ہے کہ تم ہم سے حکایت اپنے بزرگوں کی سنو کیونکہ تمہیں سلطان بہلول اور سلطان سکندر اور شیر شاہ اور اسلام شاہ سے نسبت قریب قریب ہے۔ وے باتیں یاد کرلو کہ بہت روزوں گزرنے میں اختلاف و غلطی اکثر ہوتی ہے اور جو کچھ ہم نے دیکھا اور بزرگوں سے سنا ہے تم سے کہتے ہیں اور میں نے خان اعظم مظفر خان جو بیٹا جلال خاں اور پوتا ہیبت خاں اور پرپوتا عمر خان کا تھا اس سے عرض کیا کہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ شیر خاں نے روہیلوں کو ڈولیوں میں بھیج کر قلعہ رہتاس کا لیا اور آپ لوگوں کے خلاف فرماتے ہیں کوئی بات میری باور نہ کرے گا۔ فرمایا تم یقین جانو کہ میں اور عمو مسند عالی عیسیٰ خاں اس کے ساتھ تھے اور اہل و عیال بھی ہمارے رہتاس کے پہاڑوں میں شیر خاں کے ساتھ پھرتے تھے (27)۔

ہمایوں کا بنگالہ پر حملہ

الغرض جب شیر خاں نے ہمیں اپنے اہل وعیال کے پاس رہتاس کے قلعے میں چھوڑا اور بھر کندھے کے پہاڑوں میں جا بجا پھرتا تھا اور کہیں ٹھہرتا نہ تھا' جب حضرت ہمایوں پادشاہ کے چنار کا قلعہ ہاتھ آیا تب بنارس میں تشریف فرما ہو' عیش وعشرت میں رہنے لگے چنانچہ ایک مدت

بنارس میں دایرہ دولت رہا۔ اپنے ایلچی (28) کو شیر خاں کے پاس بھیجا کہ اسے ہماری خدمت میں لا شیر خاں نے کہا میں ملاحظے حضور میں حاضر نہیں ہوسکتا لیکن میرے تیئں سوائے حضور کی دولتخواہی کے کچھ بن نہیں آتا اور جو خدمت فرماویں اسے میں بجا لاؤں اور بہت سے پٹھان میرے پاس جمع ہوئے ہیں اور حضور کے غلام زادہ نے گوڑ کا قلعہ فتح کیا ہے کوئی جگہ مرحمت ہو کہ تھوڑے دنوں وہاں اوقات بسر کرے اور جس خدمت کا حضور سے حکم ہو اسے سرانجام پہنچا دے اگر گوڑ کا قلعہ اور بنگالے کا ملک مجھے مرحمت ہو تو سارا ملک بہار کا چھوڑ دوں جسے پادشاہ چاہے اسے دے اور سلطان سکندر کے عصر میں جہاں تلک بنگالے کی حد تھی اگر حضور سے مجھے ملے تو لوازمہ پادشاہت کا ہے جیسے چتر اور تخت وغیرہ ہے اور گھوڑے حضور میں بھیجو اور ہر سال بنگالے کے ملک سے دس لاک روپیہ بھی حضور میں بھیجا کروں جو دائرہ دولت حضور کا آگرے کی طرف مراجعت فرمائے جو کچھ شیر خاں نے اظہار کیا تھا اسے جونکا تیوں ایلچی نے حضور میں آ کر عرض کیا پادشاہ نے قبول کر کے پھر وکیل کو شیر خاں کے پاس بھیجا گھوڑا اور ملبوس خاص شیر خاں کے لیے مرحمت فرما کر وکیل سے ارشاد کیا کہ اسے دیجو اور ہماری طرف سے تسلی تمام کہیو کہ جو تو نے عرض کی تھی وہ قبول ہوئی اور جو تو نے اقرار کیا ہے اس میں ڈھیل اور تساہل نہ کرنا جب وہ رخصت ہو کر شیر خاں کے پاس آیا گھوڑا خلعت اسے دیا اور جو کچھ پادشاہ نے فرمایا تھا اس سے کہا وہ خوش ہوا اور وکیل سے پادشاہ کے کہا جو کچھ میں نے عرض کیا تھا تھوڑے دنوں میں حضور کے ملازموں کے وقوع میں آئے گا اور رات دن خدا تعالیٰ کی جناب سے یہی دعا مانگتا ہوں کہ جب تلک زیست ہے میرے اور پادشاہ کے درمیان کسو نوع کی مخالفت وقوع میں نہ آئے کہ میں ان کے ادنا خدمتگاروں سے ہوں۔

سلطان محمود شاہ بنگالہ کا ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہونا

حضور کے وکیل کے روانہ ہونے کے بعد تیسرے روز سلطان محمود جو حاکم بنگالے کا تھا اس کا وکیل حضرت ہمایوں پادشاہ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ پٹھانوں نے گوڑ کا قلعہ لیا اور اکثر ملک ابھی ہمارے تصرف میں ہیں شیر خاں کے قول پر حضرت اعتماد نہ کریں اور اس طرف توجہ فرماویں

کہ اب تلک انہوں نے زور وقوت نہیں پکڑی ہے ان کو اس ملک سے نکالیں تو یہ فتنہ سر نہ اٹھاوے
اور میں بھی خدمت میں پہنچتا ہوں اور ان کو اس قدر قدرت نہیں ہے کہ روبرو پادشاہ کے ہوسکیں۔
اس التماس کے سنتے ہی پادشاہ نے حکم فرمایا کہ ایات ظفر آیات ہمارے بنگالے کی طرف روانہ
ہوں بعد اس کے خانخانان یوسف خیل اور پری برلاس وغیرہ اور امیروں کو حکم ہوا کہ آگے روانہ
ہوں اور میرزا ہندال کو حکم ہوا کہ اردو کو اپنے ساتھ لے کر گنگا کے پار ہوٴ حاجی پور میں داخل ہو رہے
اور سوار چیدہ جمع کر کے آپ جریدہ رہتاس اور بھرکنڈے کے پہاڑوں کی طرف روانہ ہوئے۔
شیر خاں بھی انہیں پہاڑوں میں تھا کہ اس نے سنا جو بنگالے کا ملک تجھے دیا تھا جہاں پناہ اس قرار
سے پھر گئے (29) اور بنگالے کی طرف متوجہ ہوئے شیر خاں جو پادشاہ سے توقع رکھتا تھا اس سے
اسے یاس کلی ہوئی اور پادشاہ کے وکیل سے کہا کہ میں نے حضور کے پاس ادب سے کسو نوع کی
حضور کے ملازموں کی تقصیر نہیں کی اور کبھی ان کے ملک میں نے دخل نہیں کیا اور میں نے بہار کا
نوحانیوں سے لیا تھا جب بنگالے کے پادشاہ نے ملک بہار کے لینے کا ارادہ کیا میں نے اس سے
بہت سی منت وزاری کی کہ مجھے میرے طور پر رہنے دے اور ملک کے لینے کا ارادہ نہ کرے۔ اپنے
لشکر کی بہتایت کے گھمنڈ پر قبول نہ کیا جو زیادتی اس کی طرف سے تھی حق تعالیٰ نے مجھے فتح دی اور
وہ ملک بہار کے لینے کی طمع رکھتا تھا۔ بنگالے کا ملک بھی اپنے ہاتھ سے دیا۔ حضرت ہمایوں نے
بنگالے کے پادشاہ کے قول پر اعتماد کیا اور میری خدمت میں اور میں نے جو اس کی خدمت کے
واسطے پٹھانوں کو جمع کیا۔ ان سب کو برباد کیا اور بنگالے کی طرف کوچ کیا۔ جب قبلہ عالم نے چنار
کے قلعے کو محاصرہ کیا پٹھانوں نے بہت سا کہا کہ ہم لڑیں گے۔ ان سے میں نے کہا کہ بہت بڑا
پادشاہ ہے قلعے کے لیے اس سے لڑنا مناسب نہیں کہ ہمارا ولی نعمت ہے اس واسطے کہ وہ سمجھے گا کہ
باوجود اس لشکر کی کثرت کے میرا پاس ادب کیا اور مجھے بھی ایک اپنے خدمت گاروں سے جانے
اور ان لوگوں کو بھی کوئی ملک دے گا اور یہ ملک داری کی تدبیر سے دور ہے کہ اتنی بڑی جمعیت کو اپنی
خدمت سے دور کر کے ان کے دشمنوں کے کہنے پر ارادہ پٹھانوں کے قتل اور جلاوطنی کا کرے اب
مجھے کوئی بات بن نہیں آتی اور کسو نوع کی امیدواری نہیں رہی کہ پٹھانوں کی تسلی کروں اور حضور کی

مخالفت سے باز رکھوں اور مانع ہوں' اور سنو گے کہ پٹھانوں نے کیا کام کیا' حضرت جہاں پناہ بنگالے کی طرف کے جانے سے ندامت و پشیمانی کھینچیں گے کہ ان دنوں میں روہیلے متفق ہیں اور آپس میں جو نزاع رکھتے تھے بالکل دور ہوئی اور مغلوں نے جو پٹھان کو ملک سے نکالا تھا تو ان کے نفاق کے سبب پھر پادشاہ کے وکیل کو بہت سی پیش کش دے کر رخصت کیا اور جتنا لشکر اس کے ساتھ تھا رہتاس کے قلعہ میں بھیجا اور تھوڑے سے سوار اپنے ساتھ لیے تا کوئی پیچھانہ کرے مخفی گوڑ کی طرف جانا مقرر کر وہاں سے روانہ ہوا کہ گوڑ کی طرف جاوے اور ان پہاڑوں میں چھپا چھپا رہے تا کہ کوئی نج جانے اور خبر داروں کو ہمایوں پادشاہ کے لشکر میں بھیجا تا خبر لاویں کہ ویں کیا ارادہ رکھتے ہیں جب قبلہ عالم نے دو کوچ کیے خبر سنی کہ شیر خاں گوڑ کی طرف جاتا ہے تب وہاں سے پھرے اور خانخانان یوسف خیل اور پری برلاس جو پیشتر روانہ ہو شیخ یحیٰی کے پرگنہ منیر میں اترے ہوئے تھے سنا کہ گوڑ کی پادشاہ سلطان محمود آتا ہے پری برلاس اس کے استقبال کو گیا تھ' ہنوز وہ اس کو اپنے مقام میں نہ لایا تھا کہ حضرت ہمایوں پادشاہ منیر کے (30) پرگنے میں تشریف لائے پری برلاس سلطان محمود کو حضور اقدس میں لایا عالم پناہ نے جو اس کی خاطر خواہ اعزاز و اکرام نہ کیا سلطان محمود اپنے آنے سے پشیمان ہوا اور تھوڑے دنوں میں اس غم کی کوفت سے وفات پائی اور پادشاہ نے منیر کے قصبے میں اپنے لشکر کا بندوبست کیا موئید بیگ جو بیٹا سلطان محمود دلدی اور جہانگیر قلی بیٹا ابراہیم بیگ کا اور میر نورگا اور ترتی بیگ اور پری برلاس اور مبارک فرملی وغیرہ اور امیر قریب تیس ہزار کے جو تھے ان کو حکم کیا کہ ساتھ ساتھ (31) کوس لشکر سے آگے چلا کریں جب شیر خاں نے یہ سنا کہ پادشاہ بنگالے کی سمت کو متوجہ ہوئے آپ بھی تھوڑے سے سواروں سے مخفی روانہ ہوا جب دائرہ دولت پٹنے میں آیا اور فوج پادشاہ کی جو ساتھ کوس آگے جایا کرتی تھی ابھی منزل میں نہ پہنچے تھے کہ ان کی قراول جو آگے تھے ایک گانوں کے متصل پہنچ کر دیکھتے کیا ہیں کہ اس گاؤں کے باغ میں سوار پھرتے ہیں وہاں کے ایک زراعت کرنے والے سے پوچھا یہ سوار کس کے ہیں جو نظر آتے ہیں اس نے کہا شیر خاں ہے۔ قراولوں نے شیر خاں کا نام سن کر یہ تحقیق نہ کیا کتنے لوگ اس کے ساتھ ہیں موید بیگ کے پاس آ کر کہا کہ اس گانوں میں شیر خاں اترا ہوا ہے وہ سمجھا کہ لڑنے کو

آیا ہے پھر یہ خبر حضور میں عرض کی کہ کیا حکم ہوتا ہے اور وہاں مقام کر کے خبر داروں کو بھیجا کہ تحقیق خبر لاؤ جب خبر دار گاؤں کے نزدیک پہنچے دیکھا کہ ان سواروں میں سے کوئی نہیں۔ مغلوں نے اس گاؤں میں آ کر وہاں کے مقدم سے پوچھا اس نے عرض کیا کہ شیر خاں تھوڑے سواروں سے آیا تھا' جب تمہارے سواروں کو دیکھا تب بہت شتابی (سے) منگیر کی طرف گیا جب خبر دار یہ خبر لائے شام جو قریب پہنچی تھی اس باعث سے پیچھا نہ کیا جب شیر خاں گڑھ (32) کے دروازے سے نکلا سیف خان اجہ خیل سروانی کو دیکھا کہ اپنے اہل وعیال سمیت رہتاس کی طرف جاتا ہے شیر خاں نے کہا پھر کہ مغل پہنچے۔ جب سیف خاں نے جنت آشیانی کے لشکر کی حقیقت معلوم کی شیر خاں سے التماس کیا کہ تم تھوڑے لوگوں سے جریدہ جاتے ہو اور فاصلہ بھی تھوڑا ہے وے البتہ تمہارا پیچھا بطور دوڑ کے کریں گے اس ارادے سے کہ شاید ہاتھ آویں حضرت اعلیٰ میرے اہل وعیال کو اپنے ساتھ لے کر جاویں تڑکے ہی میں گزار گڑھ کے دروازے کو روکوں گا جب تلک کہ میرے دم میں دم رہے گا جنت آشیانی کے لشکر کو آنے سے باز رکھوں گا تا تمہارے اوران کے درمیان فاصلہ کلی ہو شیر خاں نے سیف خاں سے کہا کہ یہ مناسب نہیں ہے کریں اپنی حفاظت کے سبب تجھے تہلکے میں ڈالوں سیف خاں نے عرض کیا کہ سب آدمی برابر نہیں ہیں کہ اک جان کو واسطے ایک گھر کے لوگوں کے تصدق کیا جاتا ہے اور ایک گھر کے لوگوں کو ایک گروہ کے قرباں کیا جاتا ہے اور ایک گروہ کو ایک جان کے واسطے فدا کیا جاتا ہے' جیسے آقا پناہ ہو۔ بسلامتی ایسے کی جو صاحب دولت اور صاحب اقبال ہو اور ساتوں اقلیم کو وہ فائدہ پہنچا سکے تو سپاہی کو کوئی چیز اس سے بہتر نہیں کہ اپنے آقا کی حفظ وحمایت کے واسطے اپنی جان عزیز کو نثار کرے میرے اقبال کے ستارے نے نیکنامی کے کنارے سے طلوع کیا ہے اگر جان میری اور میرے بھائیوں کی تمہارے کام آوے تو اس سے کیا بہتر ہے ہر چند شیر خاں نے مبالغہ کیا میرے ساتھ رہ کر وہاں میرے کام آوے گا اس نے قبول نہ کیا اور شیر خاں خوش ہوا اس کے اہل وعیال کو اپنے ساتھ لے کر پادشاہ کے تعاقب سے خاطر جمع کر شتابی روانہ ہوا۔ سیف خاں نے تڑکے ہی اپنے بھائیوں سے کہا نہا کر مرنے کے واسطے تیار ہو اور مرنے سے کسو نوع کا دل میں اندیشہ نہ کرو' اجل وہ چیز ہے کہ کسو شخص کا اس سے بس نہیں چلتا'

سردار جو سپاہی کو زر دیتا ہے اور اسی طرح کی رعایت اس سے کرتا ہے اس واسطے کہ کام کے وقت جان کو مجھ سے عزیز نہ کرے پس سپاہی کو چاہیے کہ اپنے خداوند نعمت کے واسطے حیات چند روزہ کو صرف کرے اور زندگی کہ عبارت نیکنامی اور سعادت دارین کی ہے حاصل کرے اور یہ جان فشانی اس کے لڑکے بالوں کے کام آوے سیف خاں کے بھائیوں نے عرض کیا کہ جب تو نے یہ کام اختیار تو ہزار جان ہماری تجھ پر اور تیری جان پر فدا ہے یہ کام کا وقت ہے نہ باتوں کا جو ہمارے ہاتھوں سے ہو سکے گا قصور نہ کریں گے بعد اس کے مسلح ہو کر گزار گڑھ کے دروازے پر مستعد رہے جب فوجیں ہمایوں پادشاہ کی نزدیک گزار گڑھ کے پہنچیں سیف خاں نے لڑائی شروع کی بہتیرا مغل وز لائے پر گزار گڑھ کے دروازے کو نلے سکے ایسی جوانمردی اس کے بھائیوں سے ظہور میں آئی کہ لکھنے اور کہنے سے باہر ہے' الغرض ظہر کے وقت تلک فوجوں کو باز رکھا اور بہت سے بھائی اس کے مارے پڑے اور تین زخم ایسے کاری اس کے لگے بے ہوش ہو گیا۔ پھر مغل سیف خاں کو جیتا پکڑ موید بیگ کے پاس لائے موید بیگ نے سیف خاں کو حضور میں جنت آشیانی فردوس مکانی حضرت ہمایوں پادشاہ کے بھیجا جب ظل سبحانی اس کے احوال سے مطلع ہوئے بہت سی آفرین وتحسین کر فرمایا کہ سپاہی کو یہی چاہیے کہ اپنے آقا کے واسطے اپنی جان کو نثار کرے' تجھے میں نے رخصت دی جہاں چاہے وہاں جا۔ اس نے عرض کیا کہ میرے اہل وعیال شیر خاں کے پاس ہیں میں اس کے پاس جاؤں گا۔ فرمایا جب ہم نے تیری جان بخشی کی اختیار تیرے ہاتھ ہے۔ پھر وہ شیر خاں کے پاس آیا۔

جس وقت شیر خاں منگیر کے شہر میں آیا وہاں ہیبت خاں نیازی تھا اس نے اس سے کہا کہ پادشاہ آتا ہے تو سیف خاں سروانی کے اہل وعیال کو لے کر اپنے ساتھ گڈھور کے قلعہ میں جا اور آپ لوارے پر سوار ہو کر گوڑ کے شہر کو روانہ ہوا جب اس شہر میں پہنچا اپنے بیٹے جلال خاں وغیرہ اور امیروں کو تعین کیا کہ راہ گڑھی کی گھیرو اور جب تلک پادشاہ کو ادھر کے آنے سے باز رکھو کہ میں اپنا سروسامان درست کروں اور جو خزانہ میرے ہاتھ آیا ہے اسے رہتاس میں پہنچاؤں جب جلال خاں گڑھی میں آیا ور فوج پادشاہ کی پیشتر آتی تھی جب وہ نزدیک گڑھی کے آئی جلال خاں نے

اپنے امیروں سے کہا کہ میں اس فوج سے لڑوں گا۔ سرداروں نے کہا لڑنا مناسب نہیں ہے شیر خاں نے تجھے لڑائی کے واسطے نہیں بھیجا اور لازم یہ ہے کہ اس گڑھی کی احتیاط کرو جلال خاں نے ان کا کہنا نہ مانا ہزار سوار کو گڑھی میں چھوڑ چھ ہزار سوار اپنے ساتھ لے پادشاہ کی فوج پر گیا بڑی لڑائی ہوئی' پر پادشاہ کی فوج نے شکست پائی۔ مبارک فرملی اور ابوالفتح لنگاہ وغیرہ بہت سے مغل مارے پڑے اور جلال خاں پھر کر گڑھی میں آیا اور گڑھی کی راہ کو مضبوط کیا۔

ہمایوں کا گوڑ پر قبضہ 1538ء

بعد ازاں لڑائی کے اس رات کو اوائل برسات ایسا پانی برسا کہ اس کی بہتات کے سبب رستا بند ہوا' اس مقام میں ایک مہینہ پادشاہ نے توقف فرمایا اس عرصے میں شیر خاں نے فرصت پائی اور جتنا خزانہ اس کے ہاتھ آیا تھا اسے لے کر جھاڑ کھنڈ (33) کی راہ سے رہتاس کی طرف کو چلا۔ جب شیر خاں رہتاس میں آیا جلال خاں کو کہلا بھیجا کہ گڑھی کو چھوڑ کر رہتاس میں آ۔ جب پادشاہ نے یہ سنا کہ جلال خاں گڑھی کو چھوڑ گیا اور برسات کی شدت کے باعث اردوی معلائے نصرت قریں کو مرزا ہندال کے ساتھ کر آگرے کی طرف رخصت فرمایا' اور آپ گوڑ کی طرف جو دارالسلطنت بنگالا ہے توجہ فرما ہوئے اور گوڑ (34) میں جا کر تین مہینے تک محل میں رہے اور کوئی باریاب مجرے کا نہ ہوا اور شیر خاں نے بنارس میں آ کر حاکم بنارس کو محاصرہ کیا۔ (35) اور وہاں سے خواص خاں کو منگیر میں بھیجا کہ جہاں کا خانخانان یوسف خیل حاکم تھا۔ یکا یک رات کے وقت خواص نے شہر میں آ کر خانخاناں کو باندھ کر بنارس میں لایا بعد اس کے قلعہ بنارس کا فتح ہوا بیشتر مغل جو اس شہر میں تھے قتل ہوئے۔ (36) اور بعد اس کے ہیبت خاں نیازی اور جلال جلوا (37) اور سرمست خاں سربنی وغیرہ اور امیروں کو بھی بہرائچ کا تعینات کیا انہوں نے مغلوں کو جو اس اطراف میں تھے مار مار کر نکال دیا سنبھل کے قلعے تلک تصرف کیا اور وہاں کے لوگوں کو پکڑا اور لوٹا اور لشکر جو جونپور کی طرف بھیجا تھا ان کے ہاتھوں سے لڑائی میں جونپور کا حاکم مارا گیا اور وہی فوج جو جونپور کی طرف گئی تھی کڑے کی سمت آئی' اور فوج جو مغلوں کی کڑے کے شہرے میں تھی لڑی اور اس نے بھی شکست پائی۔ قنوج سے سنبھل تلک پٹھانوں کے قبضے میں آیا اور خواص خاں کو مہارت

زمیندار کے پاس بھیجا تا جنگل وہاں کا کٹے اور اسے اپنے قابو میں لا کر فصل خریف اور کچھ ربیع کی شیرا خاں کے لوگوں نے تحصیل کی۔

ہمایوں کی بنگالہ سے واپسی

جب ظل سبحانی کو اطلاع ہوئی کہ ہندال میرزا نے شیخ پھول (38) کو مارا اور آگرے کے ملک میں ہنگامہ برپا کیا۔(39) جب آفتاب ثور میں آیا بنگالے سے آگرے کی سمت توجہ فرمائی اور شیر خاں نے اپنے لشکر کو جو بہار اور جونپور میں تھا سوائے خواص خاں کے جو مہارت زمیندار پر تعینات تھا ان کو بلا کر رہتاس کی اطراف میں جمع کیا۔ جس وقت عالم پناہ شیر خاں کے مقابلہ سے اور رہتاس کے پہاڑوں سے آگے بڑھے شیر خاں نے اپنے امیروں سے پوچھا کہ لشکر پادشاہ کا بہت تباہ ہے اور آگرے کے ملک میں بھی ہنگامہ ہو رہا ہے اس واسطے مجھے چھوڑے جاتا ہے اگر سب عزیزوں کی صلاح ہو تو بخت آزمائی کروں کہ اب میں بھی معہ لشکر سروسامان درست رکھتا ہوں۔ اس سے آگے جو پادشاہ بنگالے کی طرف جاتے تھے میں نے بہت سی منت وزاری کی تھی اور ہر سال کا زر دینا بھی قبول کرتا تھا کہ پادشاہ مجھے بنگالہ مرحمت فرما دیں اس واسطے کہ ایسا نہ ہو نوکر ہو کر اپنے ولی نعمت کے ساتھ مخالفت کرے اور پادشاہ نے بھی بنگالہ دینا قبول کیا تھا۔ جس وقت وکیل سلطان محمود پادشاہ بنگالے کا حضور میں آیا قبلہ عالم اپنے قول وقرار سے پھر گئے بعد اس کے مجھے لازم ہوا کہ میں پادشاہ سے مخالفت ظاہر کروں اور اس کی فوجیں جو بہار اور جونپور میں تھیں میں نے ان کو برباد کیا اور ان ملکوں کو تصرف میں لایا اور اب کوئی طور صلح کا باقی نہ رہا۔ اعظم ہمایوں سروانی جو بڑے امیروں سے سلطان سکندر اور ابراہیم کے تھا اس نے عرض کی کہ مشورہ مغلوں کی لڑائی کا سلطان بہلول اور سلطان سکندر کے امیرزادوں سے نہ پوچھا چاہیے جس تدبیر کو کہ ہم نے سوچا کہ طالع کے باعث بن نہ آئی اور جب مغلوں سے لڑے تب آپس کی مختلفت کے باعث شکست پائی اور تیرے اقبال نے یاوری کی ہے اور سب پٹھان دل وجان سے تیرے ساتھ متفق ہیں اور مغلوں کی لڑائی پر بھی من چلے ہیں اور دانائے روزگار مجھ سے کہتے تھے کہ پٹھان تلوار کی لڑائی میں مغلوں سے کم نہیں ہیں لیکن آپس کی مخالفت کے سبب سے بھاگتے ہیں اور روہیلے

اس وقت مغلوں کو ہند سے نکالیں گے کہ سرداران کا ایک ہوگا اور سب گروہ افغانوں کے اس کے متفق ہوں گے اور وہ صاحب اقبال تو ہی ہے اپنے نئے نئے امیروں سے پوچھا جو کچھ وہ کہیں اس پر عمل کرتا فتح تیری مددگار ہو۔

شیر خاں لڑائی کی تیاری کرتا ہے

جب شیر خاں نے اعظم ہمایوں سروانی سے یہ باتیں سنی اپنے امراء سے پوچھا اور شیر خاں کے نئے نئے امیروں سے قطب خاں نائب اور ہیبت خاں نیازی اور جلال خاں بیٹا جلو کا اور شجاعت خاں اور سرمست خاں سربنی وغیرہ جو تھے سبھوں نے بالاتفاق عرض کیا کہ البتہ لڑا چاہیے کہ پھر ایسا وقت ہاتھ نہ آوے گا جب شیر خاں نے معلوم کیا کہ سب پٹھان میرے ساتھ متفق اور مغلوں کی لڑائی پر دلیر ہیں' رہتاس کے پہاڑوں سے نکل کر ہمایوں پادشاہ کے لشکر کی طرف روانہ ہوا اور ہر منزل میں سنگر باندھتا اور ٹھہر ٹھہر کے تھوڑا تھوڑا کوچ کرتا۔ جب ظل سبحانی نے سنا کہ شیر خاں آتا ہے' پادشاہ نے بھی مراجعت فرمائی اور رخ شیر خاں کے لشکر کی طرف کیا۔ جب شیر خاں نے سنا کہ بادشاہ نے مراجعت فرمائی اس نے عرضی لکھی کہ اگر حضور سے بنگالے کا ملک بندہ کو مرحمت ہو تو سکہ اور خطبہ پادشاہ کے نام کا رائج ہو' بندہ بھی ایک حضور کے ملازموں سے ہے اور نمک پروردہ اس بارگاہ کا ہے اور آپ بھی کوچ بکوچ گاؤں بگاؤں اور فضا کی جگہ اترتا ہوا آتا تھا۔ جب مقابل ہوا دریا کو درمیان دے کر اترا اور اس دریا کا پاٹ پچیس گز کا تھا اور خواص خاں جو مہابت زمیندار پر تعینات تھا اسے بھی کہلا بھیجا کہ جلدی لے آ۔ بعد اس کے اس کی عرضی ملاحظہ کر کے فرمایا کہ اپنی حد سے آگے بڑھ کر دریا کو درمیان دے۔ روبرو اترا ہی چاہیے کہ آداب حضور کے مدنظر رکھ کر پیچھے کو کوچ کر جائے اور راہ دریا کی چھوڑ دے کہ مابدولت دریا سے گزریں اور دو دو تین تین منزل کے فاصلہ سے شیر خاں کا پیچھا کیے جائیں اور پھر پھریں۔ شیر خاں نے حضور کا فرمانا قبول کیا اور پانی کی راہ چھوڑ پیچھے کو کوچ کر لیا ظل سبحانی نے دریا پر پل بندھوا اردوئے معلا کو چھوڑ کر اپنے اہل وعیال کو اپنے ساتھ لے دریا سے عبور کر حکم کیا' خیمہ ایستادہ ہو۔ شیخ خلیل جو بیٹا قطب عالم اور پوتا شیخ فرید شکر گنج تھا اسے پادشاہ نے ایلچی کر' شیر خاں کی طرف بھیجا کہ اسے جا کر کہہ کہ

کوچ بکوچ رہتاس کی طرف جاوے اور کسی جگہ توقف نہ کرے اور کئی ایک منزل پادشاہ بھی تعاقب کر کے پھریں گے۔ بعد اس کے موافق وعدے کے بنگالے کی جاگیر کا فرمان شیر خاں کے وکیلوں کو عنایت فرماویں گے۔ جب شیخ خلیل شیر خاں کے پاس آیا جو کچھ پادشاہ نے فرمایا تھا شیر خاں سے کہا اس نے ظاہر میں حکم حضور کا قبول کیا اور تعظیم و تکریم اور مہمان داری کا کوئی درجہ جو بزرگوں کی خدمت گاری کا ہے نہ چھوڑا۔ دوسرے روز جو لوگ حضور کے اس کے ساتھ آئے تھے ان کے روبرو شیخ خلیل نے صلح کے واسطے بہت سمجھایا۔ شعر

جو تو فیل زور آور ہے شیر جنگ
تو کر صلح لڑنے کی مدت کر امنگ

اور درمیان باتوں کے شیخ خلیل کے منہ سے نکلا' اگر صلح قبول نہیں کرتا تو اٹھ لڑھ اور مار۔ اسنے کہا یہی قول حضرت تفول نیک میرے واسطے بس ہے' انشاء اللہ تعالیٰ ماروں گا بہت زر نقد اور مالدہ اور بنگالے کے تحائف شیخ خلیل کو دیئے اور تمام نیک دل کو اپنے احسان کے دام میں شکار کیا۔ بعد اس کے شیخ خلیل کو تنہا خلوت میں بلایا اور خصوصیت پٹھانوں کی جو قطب عالم شیخ فرید شکر گنج کے خاندان سے تھی ظاہر کی اور شرم ہموطنی کی اور خاطر خواہ وعدے اس سے کیے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں لڑائی اور صلح کے مقدمے جو میرے اور ظل سبحانی کے درمیان ہیں ان کے مشورے آپ سے کروں کہ حکیموں نے کہا ہے مشورہ صاحب عقل اور دانا اور دور اندیش لوگوں سے اور پیران جہاں دیدہ سے کیجئے اور حضرت تمام صفتوں سے مصوف (40) ہیں جو کچھ آپ کی ضمیر منیر میں میری بہبود کے واسطے آوے جونکا تو فرماویں کہ پادشاہ سے صلح کرنا مناسب ہے یا لڑنا' بعد اس کے بہت سا تامل کر کے شیخ نے کہا۔ تیرے مشوروں کے پوچھنے میں دو باتیں مجھے مشکل پیش آئیں ہیں ایک یہ کہ پادشاہ نے ایلچی کر' تیرے پاس بھیجا ہے یہ مجھے لائق نہیں ہے کہ سوا اس کی دولتخواہی کے کچھ اور کہوں اور دوسری یہ کہ تو نے بطور مشوروں کے مجھ سے کچھ پوچھا اور بزرگوں نے کہا ہے اگر دشمن بھی مشوروں سے پوچھے تو چاہیے کہ جو واقعی ہو سو کہے اور پٹھان اپنے باب میں اعتقاد اس خاندان سے رکھتے ہیں اگر خلاف مشورے کے کہوں تو اس میں خیانت کی جائے۔ حضرت رسالت

پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زبان معجز بیان سے فرمایا ہے مشورہ اس سے کیجئے جو معتمد ہو واسطے ضرورت کے جو واقعی ہو سو کہتا ہوں تجھے پادشاہ سے لڑنا بہتر ہے صلح سے' اس واسطے کہ ان کے لشکر میں یہاں تلک بے سامانی ہے کہ اسپ ویراق نہیں رہا اور ظل سبحانی کے بھائیوں نے بھی دشمنی ظاہر کی ہے لاچار تیرے ساتھ صلح کرتے ہیں آخرالامر اس صلح پر نہ رہیں گے وقت کو غنیمت جان کر ہاتھ سے نہ دے کہ پھر ایسا وقت ہاتھ نہ آوے گا۔ شیر خاں صلح کے تردد میں تھا جب شیخ خلیل نے تحریص لڑائی کی (41) شیر خاں نے ارادہ صلح کا فسق کیا اور لڑائی کی تدبیر میں ہوا۔ خواص خاں جو چروے کے زمیندار مہارت پر تعینات تھا' اسے بلایا' جب خواص خاں اردو کے نزدیک آیا حکم کیا کہ تمام لشکر مسلح ہو کر سوار ہو اور مہارت سے لڑنے کو چلو کہ وہ لڑنے آتا ہے جب تین چار کوس لشکر اس کی منزل گاہ سے دور گیا' حکم کیا کہ پھر دہر کارے میرے خبر لائے ہیں کہ ابھی وہ دور ہے دوسرے روز بھی مکمل تیار ہو سوار ہوا اور کئی کوس جا کر پھر پھرا' اور فرمایا کہ آج بھی نہیں آیا۔ جب آدھی رات رہی اپنے سارے امیروں کو بلا کر کہا کہ میں نے ظل سبحانی سے صلح کا اقرار کیا تھا۔ جس وقت اپنی اگلی خدمتوں کو خیال میں لایا تو کچھ ثمرہ نیک نہ دیکھا پہلے دولت خواہی حضور کی مجھ سے وقوع میں یہ آئی تھی کہ میں سلطان محمود کی شکست کا باعث ہوا تھا اور جب اپنے لشکر سے خاطر جمع کی' مجھ سے چنار کا قلعہ طلب کیا جب میں نے نہ دیا تب فوج تعین کی' جب ان کی فوج سے کچھ نہ ہو سکا آپ متوجہ ہوئے تھے کہ قلعہ چنار کا مجھ سے بزور لیں کہ خبر پہنچی کہ مرزا محمد زماں نے ہند سے نکل آگرے کے ملک میں ہنگامہ برپا کیا ہے' اور سلطان بہادر جو پادشاہ گجرات کا ہے وہ دھیلکا ملک لینے کو آتا ہے تب ظل سبحانی کو ضرور ہوا کہ پھریں' میں نے اپنے بیٹے قطب خاں کو ان کی خدمت میں دیا کہ وہ گجرات تلک ان کے ساتھ تھا اور مجھے اتنی دست قدرت تھی کہ اکثر ملک جونپور وغیرہ کے اپنے قبضے میں لاتا' لیکن پاس ادب سے خلاف حضور کا نہ کیا۔ اس واسطے کہ بڑا پادشاہ ہے جو مجھ سے باوجود اس دست رس کے سوائے حضور کی دولت خواہی کے کچھ وقوع میں نہ آئی تو مجھے خدمتگار خاص اپنا جانے گا اور میرے آزار کے درپے نہ ہوگا اور جس وقت گجرات سے آئے اپنے لشکر کا سامان درست کر میری دولت خواہی کو کچھ خاطر میں نہ لائے اور نکالنے کی سعی کی لیکن

میرا اقبال جو قوی تھا جو چاہتا تھا سو نہ کیا۔ بہتیرا میں نے عجز وانکسار کیا اور خدمتیں اپنی ظاہر کیں فائدہ نہ کیا۔ جب ظل سبحانی بنگالے کو گئے ہیں ان کے تفصلات سے ناامید ہوا اور ان کی بدی(42) سے اندیشہ تھا' ضرورتاً میں نے اظہار مخالفت کا کیا اور ان کے امیروں کو مارا اور ملک ان کا سنبھل تلک تاراج کیا اور کسو مغل کو اس ملک میں نہ چھوڑا اور اب کس توقع پر ان کے ساتھ صلح کروں اور ظل سبحانی ضرورتاً کہ ان کے لشکر میں اسپ یراق اور کچھ سامان نہیں رہا اور ان کے بھائیوں نے بھی مخالفت ظاہر کی ہے اس واسطے صلح کرتے ہیں اور مجھے ہاڑی دیتے ہیں آخر کار اس صلح پر نہ رہیں گے۔ جس وقت آگرے میں جائیں گے بھائیوں سے دشمنی رفع کر کے بعد اس کے سامان لشکر کا درست کر میری اکھاڑ میں قصور نہ کریں گے۔ پیش از وقوع واقعہ تدبیر اس کی کیا چاہیے جیسے کہ قول پیغمبر خدا علیہ السلام کا ہے کہ مومن بچھو کا ڈنک ایک سوراخ سے دو باری نہیں کھاتا۔ میں نے بارہا آزمایا ہے کہ لشکر پٹھانوں کا مغلوں کے لشکر پر دلیر ومردانا ہے پٹھانوں کے نفاق سے مغلوں نے ملک لیا تھا اگر مصلحت عزیزوں کی ہو تو صلح کو موقوف کر بخت آزمائی کروں۔ روہیلوں نے عرض کیا حضرت اعلیٰ کے یمن قدم کے سبب پٹھانوں کی قوم سے نفاق دور ہوا اور ہم سب خاک سے اٹھائے ہوئے حضرت اعلیٰ کے ہیں جاں نثاری اور مردانگی میں اپنے مقدور پھر قصور نہ کریں گے اور جو صلح کے موقوف کرنے کی خاطر اشراف میں آئی ہے وہی بہتر ہے شیر خاں نے کہا میں نے صلح موقوف کر تکیہ پروردگار کے فضل پر کیا میں پادشاہ کے ساتھ لڑوں گا جیسے کہ خواجہ نظامی فرماتے ہیں۔ بیت

زمانہ جو عاجز نوازی کرے
تو اژدر سے چونٹی بھی بازی کرے

وقت رخصت کے پٹھانوں سے کہا کہ لڑائی کے سامان سے سوار ہو مہارت کے سبب سے اپنے دل میں اندیشہ رکھتا ہوں جب پہر رات باقی رہی مسلح ہو کر سوار ہوا۔ جب دو ایک کوس مہارت کی طرف گیا' بعد اس کے پٹھانوں کو بلا کر کہا کہ دو روز میں سوار ہو کر پھر آیا غرض میری یہ تھی کہ حضرت ہمایوں پادشاہ کو غافل کروں تا وے جانے کہ لشکر ہماری طرف نہیں آتا ہے اب پھر واور

پادشاہ کے لشکر کی طرف چلو، ننگ و ناموس افغانی ہاتھ سے نہ دو اور غنیم کے مارنے میں قصور نہ کرو یہی وقت ملک ہند کے لینے کا ہے روہیلوں نے عرض کی حضرت اعلیٰ کچھ خطرہ خاطر اشرف میں نہ لاویں کہ یہ وقت یمن دولت روز افزا اور طالع ہمایوں حضرت اعلیٰ کا ہے پٹھانوں کے لشکر میں غبار نفاق کا باہم دیگر نہیں ہے اور مغلوں کی تلوار سے کچھ خطرہ دل میں نہیں لاتے۔

چوسہ کی لڑائی جون 1539ء

فاتحہ پڑھ فوجوں کو آراستہ کر نہایت جلدی سے پادشاہ کے لشکر کی طرف روانہ ہوئے۔ جب روہیلے نزدیک اردو کے پہنچے تب پادشاہ خبردار ہوئے کہ شیر خاں تیار ہو سارے لشکر سمیت لڑائی کے ارادے آیا ہے ظل سبحانی نے اپنے لشکر کو حکم کیا کہ نکلو اور پٹھانوں سے لڑو کہ میں بھی وضو کر کے آتا ہوں حضرت ہمایوں پادشاہ ایک شیر جری تھا کہ نہایت مردانگی اور دبدبے کے باعث میدان شجاعت کے شہسواروں سے گوئے دولت لے جایا تھا اور باگ تسخیر کی توسن پر چنک ملک کے ڈالی تھی۔ کمند اختیار کی زمانے کی گردن میں اور تمام ملک ہند کا اپنے تصرف میں لایا تھا۔ غرور جوانی و تکبر اور بہتایت سے فوج کی اور حشم کی زیادتی سے کہ شجاعت و بہادری میں اپنے مانند نہ رکھتا تھا اور ہاتھی اس کے نیزہ و تیر کی دہشت سے نہ ہل سکتا اور مغلوں کی آتش بازی کے ڈر سے دشمنوں کا زہرہ آب ہوتا تھا، شیر خاں کے لشکر کی جمعیت کہ روہیلوں سے تھی نظر میں نہ لایا اور جو کچھ لوازمہ لڑائی کا چاہتے خاطر میں نہ آیا اور بے سامانی کہ بنگالے کی آب ہوا سے لشکر ظفر اثر میں ہوئی تھی ملاحظہ نہ فرما کر اس خیال میں کہ ہر چند بلونی ہوتی نہو پر گھی بلوتی ہے اور کلنگ اگرچہ ڈیل میں بڑا ہو، باز کے چنگل میں پھنستا ہے، اور شیر خاں کے طرح طرح کے حیلہ و مکر و فریب کہ لڑائی میں منع نہیں جانتا تھا اور نشیب فراز لڑائی کے معلوم تھے اور سرد و گرم زمانے کا آزمایا تھا، ابھی مغل اردو معلیٰ کے باہر نہ نکلے تھے کہ پٹھان نخاس کے پاس پہنچے۔ جب انہوں نے مغلوں کی فوجیں نہ دیکھیں درانے لشکر میں گھسے، پل مارتے ہی مغلوں کی فوجوں کو شکست دی۔ ابھی پادشاہ نے وضو سے فراغت نہ کی تھی کہ خبر سنی، رہیلوں نے مغلوں کی فوج میں ایسا تفرقہ ڈالا ہے کہ جمع ہونا ممکن نہیں اور حریف جو لشکر میں آیا اتنی فرصت نہ ہوئی کہ اہل و عیال کو اپنے ساتھ لے جائیں پھر آگرے کی طرف مراجعت

فرمائی کہ وہاں جا سامان لشکر کا درست کر دشمن سے سمجھوں گا ار میں عباس احمد سروانی جو مولف تحفہ اکبر شاہی کا ہوں زبانی خاں اعظم مظفر خاں کہ نواسہ مسند عالی ہیبت خاں اور کوانسہ مسند عالی عمر خاں کا کہو رکا تھا سنا میں نے' کہ کہتا تھا کہ میں شیر خاں کے پاس کھڑا تھا کہ بیگم اور جمیع حرم محترم ہمایوں پادشاہ کی بہت سی رنڈیوں کے ہمراہ لائے جس وقت شیر خاں نے ان کو دیکھ گھوڑے سے اتر کر بہت سی تعظیم وحرمت کی اور دوبارہ وضو کر' دوگانہ شکرانے کا حق سبحانہ تعالیٰ کی جناب میں ادا کیا اور ہاتھ مناجات کے واسطے اٹھا کر نہایت عجز وزاری سے کہا یا الہ العالمین بزرگی اور دست قدرت تجھے سزاوار ہے کہ اس میں زوال ونقصان کو راہ نہیں کہ ادنی بندہ فرید کو سرفراز کیا اور ہزیمت ہمایوں پادشاہ کے لشکر میں کہ وہم وخیال میں نہ آتی تھی اور اس کے اہل وعیال کو میرا اسیر کیا بعد اس کے نقیبوں کو حکم کیا کہ لشکر میں پکار دو کہ کوئی آدمی مغلوں کے زن وفرزند کو اسیر نہ کرے' رات کی رات اپنے اپنے ڈیرے میں رکھیں اور تڑکے ہی سب کو بیگم کے سراچوں پاس لاویں اور اس کے حکم کا دبدبہ پٹھانوں کے لشکر میں ایسا خوب تھا کہ کسو کو مقدور نہ تھا کہ اس کا خلاف کرے بلکہ رات ہی کو مغلوں کے اہل وعیال بیگم کے سراچوں کے پاس لائے اور بقدر ہر ایک کے خوراک مقرر کی۔ بعد کتنے ایک روزوں کے بیگم کو رہتاس کی طرف حسین خاں سرک کے ساتھ روانہ کیا شیر خاں کے اہل وعیال کوز اد راحلہ دے۔ آگرے کی طرف رخصت کیا شیر خاں نے کہ خطاب اپنا حضرت اعلیٰ مقرر کیا تھا جب فتح کے ستارے نے اس کے افق سعادت سے طلوع کیا' منشی کو فرمایا پروانے فتح نامے کے ملکوں کی طرف جوان کے تصرف میں تھے لکھو۔ مسند عالی عیسیٰ خاں بیٹا مسند عالی عمر خاں کا کہ خطاب اس کا خان اعظم خاں تھا۔ سلطان بہلول کی عہد میں بعد وصال ہونے تاتار خاں یوسف کے لاہور اس کی جاگیر میں تھا۔ عرض کیا کہ فتح نامے بطور فرمان کے لکھے جاویں شیر خاں نے فرمایا کہ تم کتنے ایک امراء زادے سلطان بہلول اور سلطان سکندر کے ہو باعث ننگ وناموس افغانی کے تم نے سرفراز کر میرا ساتھ قبول کیا مجھے مناسب نہیں ہے کہ تمہیں فرمان لکھوں اور تخت پر بیٹھوں اور تم کھڑے رہو اور مالک ملک کا جیتا گیا ہے۔ ابھی اکثر ملک اس کے تصرف میں ہے۔ مسند عالی عیسیٰ خاں سمجھا کہ شیر خان ارادہ تخت پر بیٹھنے کا رکھتا ہے' عرض کیا کہ سلطان بہلول اور

سلطان سکندر اور ان کی اولاد قومیت کی رعایت کے باعث تخت پر نہ بیٹھے۔ خلاف قاعدے پادشاہوں کے تھا۔ ہر چند جس کسی کو حق سبحانہ تعالیٰ پادشاہت دیتا ہے ساری خلقت سے ممتاز و سرفراز کرتا ہے اسے چاہیے کہ اگلے پادشاہوں کے قاعدوں کے آدب مدنظر رکھے اور کسو شخص کو لائق نہیں ہے کہ اس کی تعلیم و توقیر میں کمی کرے۔ کیومرث کے زمانے سے آج کے دن تلک یہی مقرر ہے کہ ملک میراث کسو کی نہیں بہترین نعمت اور خوتبرین بخشش گو وہ انسان کے واسطے بہتر سلطنت سے نہیں ہے اور آثار سلطنت کے حضرت کی ذات خجستہ صفات میں کہ مجموعہ بزرگی و اخلاق ستودہ کے ہے روشن وظاہر ہیں بازوئے قوی کی مدد اور طالع خجستہ کی یاوری سے تو نے پادشاہ وقت کو ہزیمت دی اور دشمن کے جیتے جانے سے تجھے کیا غم ہے کہ رایات نصرت آیات تیرے جس طرف کو متوجہ ہوتے ہیں، فتح و فیروزی دو اسپہ استقبال حضور عالی کا کرتی ہے اور دوسرے امراء قوم کے جو پٹھان ہیں ان سے کچھ ملاحظہ خاطر شریف میں نہ لائے۔ بعد سلطان ابراہیم کے حوادث زمانہ کے باعث جس شہر میں جاتے تھے اس ملک کے حاکم کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے اور جس راہ جاتے تھے اس شہر کے بازاری کہتے تھے کہ نامرد اپنی ولایت کو باعث مخالفت کے چھوڑ، ہماری ولایت میں آئے ہیں۔ (43) تیرے یمن قدم کی برکت سے جو متفرق ہوئے تھے جمع ہوئے اور آپس میں جو مخالفت رکھتے تھے موافق ہوئے۔ تیرے آگے کھڑا ہونا اپنا شرف جانیں گے، جو فرقہ کہ اپنے قوم سے پادشاہ نہیں رکھتا، پتلا ہے کہ جان نہیں رکھتا۔ بعد اس کے اعظم ہمایوں سروانی نے عرض کیا کہ پشتین سے پادشاہ ہیں اور روزگار نے جامہ کشورستانی اور ملک گیری کا ان کے قد و بالا پر قطعہ کیا ہے اور ہر ایک طرح سے تیراندازی اور نیزہ بازی کے ماہر ہیں۔ آمد و رفت لڑائی کی ہر ایک نوع کا مکر و حیلہ کہ لڑائی میں مکروہ نہیں ہے، جانتے ہیں اور پٹھانوں کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور لڑائی کے دن کچھ چیز نہ جانتے تھے۔ تیری حسن تدبیر اور دولت جہانگیری کے باعث مغل برباد ہوئے اور جس مقام میں ان سے لڑے انہیں شکست ہوئی۔ بعد اس کے مغل لاف سپہ گری کا۔ پٹھانوں پر نہ کریں گے اور سب لوگ کہتے ہیں کہ مغل و پٹھان آپس میں حریف ہیں اور ملک حق تعالیٰ کی داد ہے جسے چاہے اسے دے اور اس نعمت کے شکر میں اگر تخت تیرا امرا

روہیلوں کے سر پر اٹھا دیں تو بھی شکر اس بخشش الٰہی کا ہزار سے ایک ادا نہ کر سکیں۔ میاں ببن لودھی اور سب پٹھانوں کے سرداروں نے ایکدل و زبان عرض کیا۔ مسند عالی عیسیٰ خاں لکھو رسروانی اور اعظم ہمایوں سروانی کی برابر روہیلوں کے لشکر میں کوئی نہیں ہے۔ جو کچھ انہوں نے عرض کیا عین صواب ہے اور اس میں ڈھیل کرنی مناسب نہیں۔

شیر شاہ کا بادشاہ ہونا

شیر خاں نے خوش ہو کر کہا نام پادشاہت کا بڑا امر ہے اور مشکلات سے خالی نہیں جو سب عزیزوں کی رائے یہ ٹھہری ہے کہ میں پادشاہ ہوں تو میں نے قبول کیا اور منجموں کو حکم کیا، تخت پر بیٹھنے کے واسطے اچھی ساعت دیکھیں۔ تقویم کو جو دیکھا اچھی ساعت نکلی عرض کیا کہ دولت ازلی کے باعث یہ وقت ہاتھ آیا ہے اگر اس ساعت تخت پر جلوس فرماؤ تو ہرگز کسر و شکستگی لشکر ظفر اثر میں نہ ہووے گی۔ ستارے فخر کریں ہوں جو ایسے طالع نیک اور اچھی گھڑی ہوا یسی کہ تقویم کو ہو جس سے شرف تب تخت پر جلوس فرمایا اور چتر سر پر پھروایا اور نام اپنا شیر شاہ رکھا۔ سکہ و خطبہ اپنے نام کا مقرر کیا اور لقب اپنا شاہ عالم کیا۔ مسند عالی عیسیٰ خاں لکھو رسروانی کو فرمایا کہ تو حضرت شیخ ملہی قتال (44) کی اولاد میں ہے اور سبب سکہ و خطبہ کا تو ہوا ہوا ہے فرمان فتح نامے کا ایک تو اپنے ہاتھ سے لکھ اور باقی فرمان منشی لکھے گا۔ پھر ایک فرمان دستخط خاص سے مسند عالی عیسیٰ خاں نے لکھا اور باقی منشی نے سات روز تلک نقارے خوشی و شادمانی کے باجا کیے اور فوج روہیلوں کی ہر ایک خیل سے آتی تھی اور جیسے رسم پٹھانوں کی ہے ناچتے تھے اور گانے والوں کو انعام دیتے تھے اور خدمتگار شیر خاں کے زعفران و مشک گلاب میں پسا ہوا اور جوانان رقاص کے سر پر ڈالتے تھے اور کھانے لذیذ کہ بہشت بریں کے سے تھے اور شربت خوشگوار کہ حلاوت اس کی شراب طہور کے برابر تھی دیتے تھے۔

ہمایوں کا تعاقب۔ شیر شاہ مغلیہ سلطنت کے علاقوں پر قبضہ کرتا ہے

جس مکان میں کہ فتح نامہ اس کا پہنچتا تھا بطور تذکرہ کے یہ بھی ذکر کرتے تھے اور آپ

تعاقب حضرت ہمایوں پادشاہ کا کہ قنوج سے لے کر کالپی تلک ملک اپنے تصرف میں لایا اور خواص خاں کو مہارت زمیندار پر جو چروے کا تھا تعین کیا' تا اسے برباد کر لے اور جہانگیر قلی بیگ کو چھ ہزار سوار کے ساتھ بنگالے میں قتل کیا اور بڑے بڑے سردار ہندوستان کے جو ہمایوں پادشاہ کے لشکر کے ساتھ تھے انہیں رخصت کیا اور شیخ خلیل کو رکھا اور اسے بھی اپنے خاص مصاحبوں اور مشیروں سے کیا اور مسند عالی عیسیٰ خاں لکھو رسروانی کو مندو اور گجرات کی طرف بھیجا۔ اس نواح کے حاکموں کو لکھا کہ میں اپنے ایک فرزند کو اس طرف کو بھیجوں گا جس وقت ہمایون پادشاہ قنوج کی طرف متوجہ ہووے میرے فرزند کے ساتھ ہو کر دہلی اور آگرے کے ملک کو لوٹو اور مارو اور ان دنوں میں مند اور اجین اور سارنگ پور کے ملک میں ملوخاں کے نام اپنا قادر شاہ رکھا تھا اور دعویٰ سلطنت کا کرتا تھا اور رائے سین چندیری میں اور پورن مل کہ اپنے بھتیجے راجہ پرتاب جو بیٹا بھوپت شاہ اور پوتا صلاح الدین کا تھا اس کی طرف سے نیابتاً حکومت کرتا تھا اور راجہ لڑکا تھا ستوانیس میں سکندر خاں میانا اور مہیرا اور بجاگڑھ میں راجہ بھوپال تھا اور ملک مندو کے حاکموں نے جواب میں لکھا کہ جب فرزند حضرت اعلیٰ کا اس طرف کو آوے گا اس کی حمایت اور خدمتگاری میں قصور نہ کریں گے۔ لیکن ملوں خاں نے اپنے خط کے سرنامے پر مہر کی۔ جب خط اس کا شیر خاں کے پاس پہنچا' مہر سرنامے سے پھاڑ کر اپنی پگڑی میں رکھی۔ جب مسند عالی عیسیٰ خاں گجرات میں گیا ان دنوں میں سلطان محمود لڑکا تھا' اور دریا خاں وزیر نے اپنی عرضی میں لکھا کہ پادشاہ ہمارا لڑکا ہے اور امراء باہم دیگر مخالفت رکھتے ہیں اور جو لشکر گجرات اور مندو میں تھا سب کو اپنے ساتھ لایا۔ مسند عالی عیسیٰ خاں نے عرض کیا کہ جو جس جگہ حادثے روہیلوں کو مغلوں سے پہنچے اس کا باعث یہ تھا۔ حضرت ہمایوں پادشاہ جو گجرات سے آئے یہی باعث ہو کر اس طرف کو لایا اور اگر حضرت ہمایوں پادشاہ اس کے کہنے پر عمل کرتے تو تیری بیخ بنیاد ملک سے اکھاڑ ڈالتے۔ لیکن اقبال تیرا قوی تھا کہ پادشاہ نے موافق اس کی رائے کے کام نہ کیا اور اسے ضرور قتل کیا چاہیے کہ اس کا رکھنا خوب نہیں۔ شیر خاں نے کہا میں جس پٹھان سے پوچھتا تھا وہ یہی کہتا تھا کہ پٹھانوں میں بڑا سردار ہے نہ مارا چاہیے اور رائے یہی تھی کہ جو مسند عالی عیسیٰ خاں نے کہا اور بموجب حکم کے خانخانان یوسف خیل کو جو قید میں تھا اور

روز ینہ اس کا آ و سیر جو تھے اسے مارا۔ جب شیر خاں نے سنا کہ حضرت ہمایوں پادشاہ نے قنوج کی طرف کوچ فرمایا اپنے بیٹے قطب خاں کو مندو کے ملک میں رخصت کیا کہ ملک مندو کے حاکم کو اپنے ساتھ لے کر آگرے اور دہلی کے گرد و نواح ہنگامہ برپا کریں اور ملک کو لوٹیں اور ویران کریں۔

ہمایوں اور شیر شاہ کی دوسری جنگ 1540ء

حضرت ہمایوں پادشاہ نے سنا کہ شیر خاں نے اپنے بیٹے کو چندیری کی طرف بھیجا اور ارادہ یہ رکھتا ہے کہ دلی اور آگرے میں فساد برپا کرے تب اپنے دو بھائی میرزا عسکری اور مرزا ہندال کو چندیری کی طرف رخصت فرمایا۔ جب ملک مالوہ کے حاکموں نے سنا کہ مرزا عسکری اور مرزا ہندال اس طرف کو آتے ہیں قطب خاں کی کمک نکی اور قطب چندیری سے چھنہرے کے شہر کی طرف آیا اور چھنہرے کے شہر میں مغلوں کی فوجوں سے لڑائی ہوئی اور قطب خاں مارا پڑا' اور مرزا عسکری و مرزا ہندال فتح کر' حضور میں پادشاہ کے آئے جب شیر خاں نے سنا کہ مندو کے حاکموں نے میرے بیٹے کے ساتھ موافقت نہ کی اور مارا گیا۔ غم و غصے سے بہت سا اندوہ گیں ہوا اور ظاہر میں کچھ اپنے حال کو تغیر نہ کیا لیکن ہندو کے حاکموں سے اپنے دل میں مخفی کینہ رکھا اور اس فتح سے مغل مغرور ہوئے جس وقت ظل سبحانی جنت آشیانی قنوج میں آئے شیر خاں بھی گنگا کو حائل کر مقابل اترا' اس عرصہ میں خبر آئی کہ خواص خاں نے مہارت زمیندار کو قتل کیا اور روہیلوں کے لشکر میں خوشی ہوئی اور شیر خاں نے خواص خاں کو لکھا کہ اپنے تئیں مجھ تلک جلد پہنچا کہ ہندوستان اور خراسان کے پادشاہ نے تیرے آنے پر لڑائی موقوف رکھی ہے اور تیری راہ دیکھتے ہیں جب شیر خاں نے معلوم کیا کہ خواص خاں نزدیک پہنچا اپنے وکیل کو ہمایوں پادشاہ کے پاس بھیجا اور عرض کیا کہ کب تلک روبرو پڑا رہوں' اختیار پادشاہ کے ہاتھ ہے' اگر گنگا کا گزارا پادشاہ چھوڑ دیں تو میں گنگا کے پار ہو اس طرف آ کر لڑوں یا میں گزارا گنگا کا چھوڑوں' حضرت اس طرف آ کر لڑیں۔ ظل سبحانی کی نظر میں شیر خاں نہ ٹھہرتا تھا اس کے وکیل کو کہا کہ اسے کہہ کہ گزارا چھوڑ دے' میں پار ہو کر لڑوں گا جب شیر خاں کے وکیل نے جو کچھ پادشاہ نے فرمایا تھا' وہ شیر خاں سے کہا تب شیر خاں کئی

کوس پیچھے کو ہٹ گیا۔ پھر موافق حکم قبلہ عالم کے پل تیار ہوا اور لوگ اترنے لگے جس وقت آدھا لشکر پادشاہ کا اترا، حمید خاں گاگڑ کہ مشیروں سے شیر خاں کے تھا اس نے عرض کیا کہ ابھی سارا لشکر مغل کا نہیں اترا مارا چاہیے شیر خاں نے کہا اس سے آگے میرے تئیں دست قدرت نہ تھی اور ہر ایک طرح کا مکر و حیلہ لڑائی میں کرتا تھا اور ان دنوں میں برکت سے لطف قادر قیوم کی لشکر میرا پادشاہ کے لشکر سے کم نہیں ہے آپ کی مخالفت اور کم طالعی کے باعث روہیلے مغلوب تھے اور میرے اقبال دولت کے سبب پٹھان جس مکان پر مغلوں سے لڑکے غالب آئے۔ اس قدرت پر میں عہد شکنی نہ کروں گا۔ جس وقت کہ ٹھیک دوپہر ہوگی صفیں آراستہ کر، بے مکر و حیلے کے لڑوں گا اور جو ارادہ حق تعالیٰ کا ہوگا وہ ظہور میں آئے گا۔ شیر خاں کو معلوم ہوا کہ سارا لشکر ہمایوں پادشاہ کا گنگا سے اترا شیر خاں پھر کر آیا اور روبرو ہمایوں پادشاہ کے موافق اپنے قاعدے کے سنگر باندھتا ہوا نزدیک پہنچا بعد کئی ایک دنوں کے خواص خاں بھی آیا اور جس روز لشکر میں شیر خاں کے داخل ہوا اسی روز سوار ہو رسد جو ہمایوں پادشاہ کے لشکر میں آتی تھی اسے گھیر کر تین سو خچر اور اونٹ اور بہت سے ہاتھی شیر خاں کے لشکر میں لایا۔ دسویں تاریخ محرم الحرام کی نوسوسیں (45) تالیس سن میں دونوں لشکروں کی طرف سے فوجیں نکل نکل آراستہ ہوئیں۔ پر شیر خاں نے اپنی فوجیں اس طرح آراستہ کیں کہ قلب گاہ میں آپ اور ہیبت خاں نیازی کہ جسے سن نوسو پچاس میں خطاب اعظم خاں ہمایوں کا ہوا تھا اور مسند عالی اعظم ہمایوں سروانی اور مسند عالی عیسیٰ خاں سروانی لکھو را اور قطب خاں لودھی اور حاجی خاں اور بلند خاں اور سرمست خاں اور سیف خاں سروانی اور بجلی خاں سروانی وغیرہ تھے اور میمنے میں جلال خاں بیٹا شیر خاں کا کہ بعد اس کے وہ شیر خاں کا قائم مقام ہوا اور نام اپنا اسلام شاہ رکھا اور جلال خاں بیٹا جلو کا اور سوائے اس کے اور میرے میں عادل خاں بیٹا شیر خاں کا اور قطب خاں بنت اور رائے حسین جلوانی وغیرہ جب شیر خاں اپنی فوجوں کو آراستہ کر چکا تب پٹھانوں سے کہا میں نے بڑی تلاش سے تمہیں اکٹھا کیا ہے اور اپنے مقدور بھر تمہاری ترتیب میں قصور نہیں کیا اور آج کے دن کے واسطے تمہیں رکھا تھا آج ہی کا دن امتحان کا ہے تم سے جو کوئی آج میدان میں جوانمردی اور شجاعت سے غالب آوے مرتبہ اس کا اپنے نزدیکیوں سے زیادہ

کروں گا۔ابیات

زرہ، خود، گھوڑا میں دونگا اسے
کروں مرتبے میں فلک سے پرے
کیا حکم بذل و کرم اس قدر
ہوئے سیر اہل طمع سر بسر

اور کوشش کرو کہ کارزار کا وقت ہے۔سب روہیلے ایک دل و ایک زبان رہیں۔اتفاق سپاہ کا آغاز کے کام میں باعث فتح و فیروزی کا ہے اور یقین ہے کہ اگر پٹھان کی قوم میں نزاع و خصوصیت نہ ہو تو کوئی شخص برابر افغان کی شمشیر زنی میں نہ ہو لیکن عزیزوں سے التماس یہ رکھتا ہوں کہ حسد و خصومت اور اختلاف آپ کا موقوف کریں سلطان بہلول کے عصر میں روہیلے جو آپس میں اخلاص و اتفاق رکھتے تھے سب سے مغلوب تھے، غالب ہوئے اور سلطان ابراہیم کے زمانے میں باعث حسد و بغض اور اختلاف کے غالب تھے مغلوب ہوئے تم نے دیکھ جو کچھ پیش آیا۔بیت

سپہ کو جو فیروز مندی ہوئی
تو یک جہتی سے سر بلندی ہوئی

پس ملک کے طالب کو چاہیے کہ نوک تیز اس کے نیزے کی مانند چور کے جوہر جاں کے واسطے دشمن کے خزانہ سینے میں سرنگ کرے اور شمشیر زہر آلودہ اس کی مثل سرانیگان عیار پیشہ کے گوہر روح کے ارادے سے سر درج بدن سے دشمن کے اتارے اور پادشاہ کو سپاہ بیدل سے دولت عالم گیری میسر نہیں ہوتی۔معلوم عزیزوں کو ہووے کہ میں عزم بالجزم رکھتا ہوں کہ اس میدان سے لڑائی کے اس وقت جیتا نکلوں کہ شکل فتح کی فیروزی کے کنارے سے نکلنے والا نہ سر میرا دشمن کے گھوڑے کے سم کے نیچے تڑپے۔بیت

یا فلک پر رکھوں میں اپنے قدم
یا گروں خاک پر میں ہوں بیدم

اس باعث سے کہ برکت لطف حق تعالیٰ کے سے پادشاہ ہندوستان وخراسان کو میں نے ہزیمت دی اور اگر میدان سے جیتا آیا میں تو پھر اس طرح کا وقت ہاتھ نہ آوے گا۔قطعہ

نخشی وقت کو غنیمت جان
گوہر وقت پھر نہ ہاتھ لگے
ہاتھ سے جو کسی کے جاوے وقت
ہاتھ پر آوے یا نہیں آوے

اور یقین سب کسو کو ہے کہ ایک باری شربت مرگ چھکنا ہے اور بوجھ وصال وفنا کا اٹھانا ہے اگر ایک امر عظیم میں تلف ہوں تو خوب ہے نہ چھوٹے کام میں ضائع ہوں۔ابیات

مروں نیکنامی سے تو ہے بھلا
مجھے نام منظور ہے تن فنا
حصول جہاں نام نیک ہے بھلا
رہے نامور اس سے بہتر ہے کیا

غرض میرے کہنے کی یہ ہے تا سب عزیز نہ ڈریں اور رنج وتعب کے اٹھانے قائم رہیں اور اپنے دلوں میں ایسا کچھ ٹھہراویں کہ مغل کے لشکر پر غالب آویں یا مارے جائیں اور شکست کو اپنے نزدیک راہ نہ دیں۔شعر

عدو کے مقابل یوں ہیجا میں رہ
کہ یا سردے یا لے تو تخت و کلہ

اور ملازموں کو اس سے زیادہ باعث خجالت بدنامی کا نہیں ہے کہ آقا مارا جاوے سپاہ اور نوکر جا کر جیتے آویں غرض میری ورغلانے سے یہ ہے کہ لڑائی میں ثابت قدم رہیں کہ ملک ہند کے

ہاتھ آنے کا وقت یہی ہے اور مغل کے ہاتھ سے اپنے اہل و عیال کو محفوظ رکھنا اور میں بوڑھا ہوا ہوں اور ہزار تردد سے ایک مدت بعید میں لشکر روہیلوں کا میں نے جمع کیا ہے۔ عیاذاً باللہ اگر لشکر میں پٹھانوں کے شکست ہوئی تو پھر جمع ہونا مشکل ہے۔ ابیات

جو لشکر پراگندہ ہو جنگ سے
تو مشکل سے پھر جمع وہ ہو سکے
گرے ہی ہوا سے شگوفہ اگر
دبادا نہ ہو جمع پھر شاخ پر

روہیلوں نے عرض کیا حضرت اعلیٰ نے نہایت درجہ تربیت و شفقت ہمارے حال پر فرمائی اب وقت ہماری خدمت و جاں نثاری کا ہے۔ شیر خاں نے اپنے امیروں کو رخصت کیا کہ اپنی فوجوں میں کھڑے رہیں میں آپ آ کر جو ترتیب کہ ٹھہراؤں گا اس طرح سے روانہ ہونا۔ جب امرا شیر خاں کے اپنی فوجوں میں جا کر کھڑے ہوئے تب آپ آ کر فوجوں کو آراستہ کیا۔ ابیات

سپہ ہند کی ایسی تیار کی
کہ چشم آز کی سبز جس سے ہوئی
رواں یوں ہوا وہ سوئے رزمگاہ
کہ اس طرح سے کوئی آیا نہ شاہ

ہمایوں پادشاہ کے ہراول کو خواص خاں نے شکست دی اور شیر خاں کے میمنہ میں جو اس کا بیٹا جلال خاں تھا اس کی شکست ہوئی۔ مگر تین شخص نے میدان نہ چھوڑا۔ جلال خاں بیٹا شیر خاں کا اور میاں ایوب ککھور سروانی اور غازی محلی۔ جب شیر خاں نے دیکھا کہ میرے دست راست کو شکست ہوئی چاہا کہ آپ ان کی مدد کو جاوے قطب خاں شاہو خیل لوئی نے عرض کیا کہ حضرت اعلیٰ اس طرف کو نہ جاویں نہیں تو لوگ جانیں گے کہ شکست ہوئی بہتر یہ ہے کہ تم درمیان ہو کر چلو۔ جب شیر خاں درمیان ہو کر چلا مغل کی فوج نے جو دست راست میں شکست دی تھی انہوں نے شیر

خاں کی طرف اگر شکست پائی اور حضرت ہمایوں پادشاہ کے لشکر میں آئے اور شیر خاں کی باتیں طرف عادل خاں جو اس کا بیٹا اور قطب خاں بنیت تھا' فوج جو مغل کی اس کے روبرو تھی وہ بھی شکست پاکر حضرت ہمایوں کے لشکر میں داخل ہوئی اور شیر خاں کی داہنی طرف کے لوگ جو شکست پاکر پھرے تھے ان پٹھانوں نے حضرت ہمایوں پادشاہ کو گھیر لیا شیر خاں کے بیٹوں اور پٹھانوں کے امیروں نے مردانگی کی خصوصاً ہیبت خاں نیازی اور خواص خاں نے تیغ آبدار اور سنان جاں ستاں سے لڑائی مغلوں کی اٹھالی اور نڈر ان کی فوج میں گھس آئے اور ان کے لشکر کو پراگندہ کر دیا۔

بیت

جو اشخاص ہاتھی سے کرتے تھے زور
پڑے پیلہ ساں ہیں تہ پائے مور

لیکن پادشاہ نے اپنی ذات سے لڑائی کی جگہ پاؤں استقامت ووقار کا کوہ کی مانند استوار کیا تھا اور اس قدر دلاوری وجوانمردی ظہور میں آئی کہ حد امکان بشر سے باہر تھی۔ جناب باری نے جو روز ازل میں چاہا تھا کہ اس پادشاہ کے سایہ دولت میں خلایق اس کی خوشحال وخرم رہے گی اور اس سے ایسے فرزندار جمند ہوں گے کہ ہر ایک عالم گیر و بے نظیر زیادہ فریدوں وسکندر سے ملک داری اور تدبیر میں ہوں گے اور عالم کو عدالت وسخاوت اور بخشش واکرام سے آباد رکھیں گے اور بعد کتنے برسوں کے پادشاہت ہندوستان کے ملک کی پھر اسے ہو گی اور اس کی حفظ جان کے لیے یعنے حضرت پادشاہ کی چشم جہاں میں سے پردہ اٹھا دیا تا وے اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ مردان غیب کہ ان کے سپاہیوں کو جو رستم واسفندیار سے لڑائی کے وقت میں تھے مارتے تھے ان کے گھوڑوں کے پھرتے تھے اس مشاہدے کے بعد اطاعت حکم الٰہی کی مردان غیب سے لڑائی موقوف کی پھر باگ ارادے کی آگرے کے قلعے کی طرف پھری اور کچھ آسیب اس کی ذات خجستہ صفات کو نہ پہنچا صحت وسلامتی کے ساتھ اس ورطہ خوں خوار سے نکل' دار الخلافہ آگرے میں رونق افزا ہوئے بھائیوں کی دشمنی اور نزاع کا سبب تھا کہ یہ حادثہ پیش آیا و الا نہ شیر خاں کی کیا مجال تھی کہ اس شیر دلیر سے برابری کر سکتا۔ ابیات

گر نہ دو دن طور پر میرے ہوا گردوں کا دور
ایک وتیرے پر نہیں ہے کاردوراں غم نہ کھا
گر بہار عمر ہے تو پھر چمن کے تخت پر
تاج گل رکھے گا سر پر مرغ خوشخواں غم نہ کھا

جب شیر خاں کے ظفر کا آفتاب سعادت کے مطلع سے نکلا تب یہ بیت پڑھی۔

شکر خدا کہ شام امید زمانے کی
مطلع سے عزوقدر کے صبح طرب ہوئی

دیگر فتوحات

جب مغل کی لڑائی سے خاطر جمع ہوئی شجاعت خان کی طرف کہ جسے ملک بہار اور رہتاس کا فوجدار کیا تھا لکھا کہ اگر گوالیر کے قلعے کو محاصرہ کر اور خط کے لے جانے والے کو فرمایا کہ بیٹا شجاعت خاں کا محمد خاں جس کا نام تھا مارا پڑا ہے۔ رہتاس کے پہنچنے سے تو آگے خبر نہ کچھ شاید وہ اپنے بیٹے کے مرنے کی خبر سن کر پہنچنے میں ڈھیل اور سستی کرے، جس وقت فرمان عالی شان شیر خاں کا پہنچا، شجاعت خاں نے بے درنگ و بلا توقف آ کر قلعہ گوالیر کو محاصرہ کیا۔ شیر خاں نے قنوج سے میر فرید کور کو بہت سی جمعیت سے رخصت کیا کہ آگے جاوے لیکن پادشاہ سے لڑائی نہ کرے اور نصیر خاں کو سرکار سنبھل کی طرف تعین کیا اور تھوڑے دنوں میں بندوبست اس ملک کا کر آگرے کو متوجہ ہوا۔

ہمایوں کا تعاقب

جب ظل سبحانی آگرے میں آئے میر سید رفیع الدین سے فرمایا (46) کہ میرے لشکر کو پٹھانوں نے شکست نہیں دی بلکہ میں دیکھتا تھا کہ مردان غیب ہارتے تھے اور منہ ہمارے لشکر کے گھوڑوں کے پھرتے تھے جس وقت سرہند میں آئے مجد الدین سرہندی سے بھی اسی طرح فرمایا

جب شیر خاں آگرے کے پاس پہنچا پادشاہ آگرے میں نہ رہ سکے اور لاہور کو متوجہ ہوئے شیر خاں کو یہ بات خوش نہ آئی بر مزید کور کو بہت سی ملامت کی۔ جب شیر خاں آگرے میں پہنچا کتنے روزوں وہاں رہا۔ خواص خاں اور فرید کور اور پٹھانوں سے بہت سے لوگ پادشاہ کے تعاقب کو طرف لاہور کے روانہ کیے جس وقت دلی میں آیا سنبھل کے سردار و رعیت نے آ کر فریاد کی کہ نصیر خاں ہر ایک طرح کا ظلم و تعدی کرتا ہے۔ شیر خاں نے قطب خاں نیت سے فرمایا کہ ایک ایسا شخص بہم پہنچا کہ صاحب شجاعت و عدالت ہو میں اسے ملک سنبھل کا دوں۔ سرکار سنبھل میں حرام خور اور سرکش بہت سے ہیں وہ ان کا بندوبست کرے۔ قطب خاں نے عرض کیا کہ ان دمفوں سے مسند عالی عیسیٰ خاں لکھور کے سوا تمہارے لشکر میں کوئی پٹھانوں میں نہیں۔ شیر خاں نے کہا سچ کہتا ہے ''تو'' آپ جا کر مسند عالی عیسیٰ خاں سے کہہ اگر وہ قبول کرے تو اسے مقرر کروں۔ قطب خاں نے آ کر مسند عالی سے عرض کیا کہ تمہارے اعتماد پر شیر خاں سے ایک بات کہہ کر آیا ہوں' اگر تم قبول کرو تو میری بات رہے۔ اس نے قطب خاں سے کہا' فرماؤ' وہ کیا ہے' اس نے کہا بعد قبول کرنے کے التماس کروں گا جو نزاع کچھ ایسی آپس میں نہ تھی مسند عالی عیسیٰ خاں نے بات قطب خاں کی مانی۔ بعد اس کے اس نے عرض کیا کہ حکومت سرکار سنبھل کی قبول کیا چاہیے کہ میں دولتخواہ تمہارا ہوں اور شیر خاں کا باپ اور میرا باپ تمہارے دادا کا جو مسند عالی عمر خاں تھا نوکر تھے تو اس واسطے تمہارا حق نمک ادا کرتا ہوں۔ مسند عالی عیسیٰ خاں لکھور نے حکومت سرکار سنبھل کی اختیار کیا اور شیر خاں نے پرگنہ کانت کا اور کولہ اس کے اہل و عیال کے واسطے دیا اور فرمایا کہ پانچ ہزار سوار رکھو اور نصیر خاں بھی تمہاری خدمت میں رہے جس وقت شیر خاں نے مسند عالی عیسیٰ خاں لکھور کو سرکار سنبھل کی طرف رخصت کر' فرمایا کہ دہلی سے لکھنؤ تلک میری خاطر جمع ہوئی۔

بیرم خان کی گرفتاری اور رہائی

جب مسند عالی سنبھل میں آیا بیرم بیگ مہر برادر حضرت ہمایوں پادشاہ کا کہ عصر میں دولت جلال الدین محمد اکبر پادشاہ کے خانخانان ہوا' نصیر خان نے اسے پکڑا تھا اور اس شہر میں بیرم بیگ کے آنے کا سبب یہ ہوا کہ جس وقت لشکر ہمایوں پادشاہ کا متفرق ہوا' بیرم بیگ' میاں عبدالوہاب جو

بیٹا میاں عزیز اللہ کا اور وہاں کے عقلا اور اکابروں سے تھا یہ اس سے ربط محبت خصوصیت کا رکھتا تھا اس سبب سے سنبھل میں آیا۔ میاں عبدالوہاب' نصیر خاں کے ڈر کے مارے بیرم بیگ کو شہر سنبھل میں نہ رکھ سکا۔ لکھنؤ کا راجہ جو مترسین نام تھا اسے سونپ کر کہا کہ کتنے روزوں تمہارے شہر سے کہ جنگل نزدیک ہے' اسے رکھو' جو میاں عبدالوہاب اکابر شہر سنبھل سے تھا۔ راجہ مذکور نے بیرم بیگ کو اپنے گھر میں رکھا تھا۔ نصیر خاں کو خبر ہوئی کہ بیرم بیگ' مترسین کے گھر میں ہے نصیر خاں نے راجہ مزبور سے کہا کہ بیرم بیگ کو لایا چاہیے۔ اس نے شیر خاں کے ڈر سے حوالے کیا۔ نصیر خاں نے اس کے قتل کا ارادہ کیا۔ میاں عبدالوہاب کہ قدیم آشنا سلطان سکندر کے عہد سے مسند عالی عیسیٰ خاں کا تھا اس سے آ کر عرض کیا کہ بیرم بیگ کو نصیر خاں ظالم کے ہاتھ سے کہ ارادہ اس کے مارنے کا رکھتا ہے چھڑاؤ۔ مسند عالی عیسیٰ خاں نے بیرم بیگ کو نصیر خاں سے چھڑا اپنے گھر میں لا کر کتنے روزوں رکھا اور خوراک مقرر کی پھر راجہ مترسین کو ضامن لیا کہ جس وقت میں شیر خاں کی خدمت میں جاؤں گا اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا جب مسند عالی عیسیٰ خاں ککھوڑ مندو اور اجین کی مہم میں شیر خاں کے پاس گیا۔ بیرم بیگ کو اپنے ساتھ لے گیا اور اجین کے شہر میں بیرم بیگ کو شیر خاں کے حضور لے گیا۔ شیر خاں نے بطور غصے کے پوچھا کہ اتنی مدت تلک کہاں تھا۔ پٹھانوں کی قوم میں یہ بات مقرر ہوئی ہے کہ جو گنہگار شیخ ملہی کے خاندان کی پناہ لے' گناہ اس کا بخشیں۔ میں نے بھی بیرم بیگ کو بخشا۔ اٹھنے کے وقت جب شیر خاں پاس پہنچا مسند عالی نے عرض کیا کہ جان اس کی ملہی قتال کے واسطے بخشی میں اس کو اپنے ساتھ لایا ہوں میری خاطر سے گھوڑا اور خلعت دے اور حکم کر' محمد قاسم جو گوالیر سے اتر کر آیا ہے اس کے پاس ڈیرہ کر لے۔ شیر خاں نے حکم کیا کہ محمد قاسم کے ڈیرے کے پاس اترواؤ اور جب شیر خاں نے اجین سے کوچ کیا' بیرم بیگ اور محمد قاسم دونوں گجرات کی طرف بھاگے۔ محمد قاسم راہ میں مارا پڑا (47) اور بیرم خاں گجرات میں پہنچا۔ شیخ گدائی جو گجرات میں تھا اس نے بہت سی خدمت کی اور وہ گجرات سے ہمایوں پادشاہ کی ملازمت میں حاضر ہوا۔ بعد وصل جنت آشیانی ہمایوں پادشاہ کے جب بیرم بیگ کو خانخانان کا خطاب ہوا' شیخ گدائی اور میاں عبدالوہاب اور راجہ مترسین کے ساتھ ایسا سلوک واحسان کیا کہ زیادہ اس قیاس میں نہیں آتا۔

حواشی

13- مترجم نے یہاں ترجمہ کی عبارت مبہم کردی ہے' اس کا سبب یہ ہے کہ پادشاہ کے ذکر والے واقعہ کو غلط رنگ دے دیا ہے' شیر خان نے جو پیغام' جنید برلاس کو بھیجا تھا اس میں بادشاہ کی ملازمت کا ذکر نہیں تھا' بلکہ خود جنید برلاس کو بھیجا تھا اس میں آمادگی ظاہر کی تھی۔ چنانچہ اس نے جنید ہی کی ملازمت اختیار کی' اسی کو پیش کش دی اور اسی کی فوج کی مدد سے' محمد خاں اور سلیمان کو شکست دے کر اپنی جاگیر پر دوبارہ قابض ہوا۔ دیکھو ایلیٹ کا انگریزی ترجمہ جلد چہارم۔ ص 328۔

تاریخ خان جہانی۔ ص 273۔ تاریخ داودی از عبداللہ (علیگڑھ 1954ء) ص 114۔

14- چندیری' مالوہ اور بندیلکھنڈ کے حدود پر واقع ہے' اس کے راجہ کا نام میدنی راؤ تھا۔ بابر نے جنوری 1528ء میں اس پر قبضہ کیا۔

15- شیر خان کے اصول سیاست' موجودہ دور کی ڈپلومیسی سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے ان اصولوں پر اس نے اکثر عمل کیا' اس موقعہ پر بھی مغلیہ حکومت سے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لیے واقعات کو ایک خاص طریقہ پر بیان کر کے جنید کی ہمدردی اپنے ساتھ قائم رکھی۔

16- قطب خان کو خان جہانی میں ''از امراء کبار'' بتلایا گیا ہے۔

17- جلال خان' لوحانی قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس قبیلہ کے نام پر اختلاف ہے۔ بعض مستند مورخین نے اس کو لوحانی لکھا ہے اور بعض نے نوحانی۔ مثلاً کیمبرج ہسٹری میں نوحانی ملتا ہے۔ صحیح لفظ نوحانی ہی ہے۔ کیونکہ اس قبیلہ کا نام ان کے جداعلیٰ نوحان ابن اسماعیل پر تھا' لیکن جیسا کہ مولف حیات افغانی نے ذکر کیا ہے' پٹھان لوگ روزمرہ میں اس کو لوحانی بھی کہتے تھے۔ زیر نظر نسخہ میں نوحانی ہے جو صحیح ہے۔ اس لیے ہم نے یہ ہی املا اختیار کیا ہے۔

18- تاریخ خان جہانی میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ جب نوحانیوں نے دیکھا کہ وہ شیر خاں

کے مقابلہ سے عاجز ہیں تو انہوں نے جلال خاں کو جو خود بھی نوحانی تھا۔ راضی کیا کہ وہ شیر خاں کو چھوڑ کر بنگالہ کی طرف جائے اور وہاں کے بادشاہ کی مدد سے بہار پر حملہ کرے۔ (دیکھو تاریخ خاں جہانی ص278)

19- جوہر آفتابچی کے بیان کے مطابق ہمایوں نے قلعہ چنار کا چار مہینہ تک محاصرہ کیا۔ شیر خان جب ناامید ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹے کو بھیج کر اطاعت قبول کر لی۔ دیکھو تذکرۃ الواقعات جوہر آفتابچی (اردو ترجمہ از ڈاکٹر سید معین الحق۔ کراچی 55ء) ص10۔

20- یعنی سورت۔

21- یعنی سلیمان۔

22- ایک ہزار ستانوے غلط ہے ممکن ہے نو سو ستانوے ہو۔

23- تاریخ خان جہانی کا بیان ہے کہ ایک روز شب کے وقت شیر خان پٹنہ کے بازار میں گھوم رہا تھا کہ ایک مجذوب نے اس کو دیکھا اور کہا۔ دیکھتے ہو دہلی کا بادشاہ پیادہ آ رہا ہے۔ اسی وقت سے شیر خان کے دل میں یہ خیال پختہ ہو گیا کہ اس کو بادشاہ ہونا ہے۔ دیکھو ص390۔

24- اصولاً ہمایوں کو چاہیے تھا کہ فوراً بنگالہ پر حملہ کرے۔ لیکن اس نے ایک سال آگرہ میں رہ کر قیمتی وقت ضائع کیا۔

25- ایلیٹ کے پیش نظر جو مخطوطے تھے' ان میں اس نام کو سلطان بلاقی اور سلطان برولی ہے' دیکھو ایلیٹ۔ جلد چہارم ص357۔

26- بھرکنڈہ کو بعض نے جہرکنڈ الکھا ہے۔ غالباً یہی صحیح ہے' راقم الحروف کے قلمی نسخہ اکبرنامہ میں جہرکنڈ الکھا ہے' اس کے علاوہ دیکھو طبقات اکبری۔ ص200 'فرشتہ جلد اول۔ ص504 ' کیمبرج ہسٹری جلد 4 'ص30۔

27- یہ حیرت انگیز بات ہے کہ جدید مغربی مورخین نے اس افواہ کو صحیح اور مستند مان کر شیر شاہ کے کردار پر سخت تنقید کی ہے' سروانی کی شہادت کے مقابلہ میں دوسرے بیانات کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ مغلوں کے عہد میں جو تاریخیں مرتب ہوئیں ان میں اس واقعہ کو جس میں

شیر شاہ نے بنارس جونپور اور سنبھل تک علاقے پر قبضہ کر لیا تھا' یہ خبریں بادشاہ کو موصول ہوئیں' ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ مرزا ہندال نے آگرہ میں علم بغاوت بلند کیا اور شیخ پھول کو جن کا ہمایوں بے حد احترام کرتا تھا' اس نے قتل کر دیا ہے' چنانچہ ہمایوں نے طے کیا کہ بنگالہ سے جلد آگرہ کی طرف واپس جائے' وہ چاہتا تھا کہ بنگالہ کا حاکم زاہد بیگ کو مقرر کرے جو اس کی بیوی بیگہ بیگم کا بہنوئی تھا۔ زاہد بیگ نے کہا کہ کیا میری موت کے لیے اور کوئی مقام نہیں' اس پر ہمایوں کو بہت غصہ آیا اور زاہد بیگ کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ لیکن بیگہ بیگم کی سفارش پر اس کو معاف کر دیا۔ زاہد بیگ چھپ کر آگرہ پہنچا اور وہاں ہندال کی حوصلہ افزائی کی اور بغاوت میں اس کو مدد دی۔ جوہر کا خیال ہے کہ ہندال نے شیخ بہول کو زاہد بیگ کے ورغلانے کے بعد قتل کرایا۔ دیکھو ص 30-29۔

40- یعنی متصف۔

41- سروانی کے بیان کے مقابلہ میں جوہر کی عبارت صحیح معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شیر شاہ نے شیخ خلیل سے کہا کہ اگر چنار کا قلعہ اس کو دے دیا جائے تو وہ صلح کر لے گا۔ چنانچہ شیخ خلیل نے یہ پیغام ہمایوں کے پاس بھیج دیا' ہمایوں کے امرا اس پر راضی نہیں ہوئے کہ اتنا اہم قلعہ اس کو دے دیا جائے۔ عباس خان نے صلح ختم ہونے کی ذمہ داری تمام تر شیخ خلیل کے مشورے پر رکھ دی ہے' اگرچہ یہ بات صحیح نہیں کہ شیخ جو صلح کرنے کے لیے آئے تھے' شیر شاہ کو انہوں نے جنگ کا مشورہ دیا ہو۔ دیکھو جوہر' ص 33' 35۔

42- یعنی تباہی و بربادی۔

43- اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مغلوں اور پٹھانوں میں مخالفت کس قدر بڑھ گئی تھی۔

44- شیخ ملہی قتال۔

45- یعنی 17 مئی 1540ء۔

46- ہمایوں' آگرہ میں آ کر سید رفیع الدین ہی کے مکان پر مقیم ہوا تھا۔

47- بیرم خان کی جان اس کے دوست ابوالقاسم نے اپنی جان قربان کر کے اسی موقع پر بچائی

ڈولیوں کا ذکر ہے صحیح مان لیا گیا ہے۔ مثلاً دیکھو تاریخ خان جہانی۔ ص294۔

28- ہمایوں کے سفیر کا نام' جوہر نے حسین ترکمانی لکھا ہے۔ دیکھو ص26۔

29- جوہر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں نے حملہ کرنے کا ارادہ اس لیے کیا کہ اس قاصد نے جس کو شیر شاہ کے پاس بھیجا گیا تھا' آ کر یہ خبر دی کہ شیر شاہ اس کے لیے تیار نہیں کہ ہمایوں سے صلح کرے' بلکہ وہ اپنی تدابیر پر عمل پیرا ہے۔ دیکھو جوہر ص26۔

30- جوہر نے اس مقام کا نام بینہ لکھا ہے۔ ولیم ارسکن نے بھی یہ ہی نام لکھا ہے۔ دیکھو جلد دوم' ص134۔

31- یعنی سات' سات کوس۔

32- جوہر نے اس کو گڈھی لکھا ہے اور یہ ہی صحیح ہے۔ دیکھو ص27۔

33- اس کو پہلے بھر کنڈا لکھا تھا۔ جہاڑ کنڈا صحیح ہے۔

34- گوڑ کا قدیمی نام لکھنوتی تھا۔ ہمایوں کو یہاں کی آب و ہوا بہت پسند تھی' چنانچہ وہ تین ماہ تک یہاں مکمل آرام سے رہا یہ سخت غلطی تھی' اس نے یہ خیال نہیں کیا کہ اس قیمتی مدت کو ضائع نہیں کرنا چاہیے' ورنہ شیر شاہ اپنی قوت میں اضافہ کر لے گا۔ ہمایوں نے گوڑ کا نام جنت آباد رکھا تھا۔

35- ہمایوں جس وقت گوڑ کی طرف پہاڑیوں کے جنوب میں بڑھ رہا تھا' اسی زمانہ میں شیر خاں نے اپنا خزانہ رہتاس کے قلعہ میں محفوظ کر کے' مغربی جانب پہاڑ کے علاقے کی طرف رخ کیا۔ اس طرح ہمایوں بنگال پہنچ گیا اور شیر شاہ بہار میں داخل ہو گیا۔

36- دوسرے مورخوں نے بتلایا ہے کہ اس موقع پر شیر شاہ نے سات سو مغلوں کو قتل کیا۔ دیکھو جوہر' ص28۔

37- یعنی جلوانی۔

38- بعض کتابوں میں ان کا نام شیخ بہلول بتلایا گیا۔

39- ہمایوں کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ اس کے بھائیوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو اس کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتا۔ مرزا ہندال کی بغاوت کے متعلق جوہر نے کچھ تفصیلات بیان کی ہیں۔

آج
ایڈیٹر: اجمل کمال
316 مدینہ سٹی مال۔ عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400

کتابی سلسلہ
دنیازاد
مدیر: ڈاکٹر آصف فرخی
B/115 بلاک نمبر 5 گلشن اقبال، کراچی

ماہنامہ بدلتی دنیا کراچی
ایڈیٹر: ہدایت حسین
جوائنٹ ایڈیٹر: پروفیسر ریاض صدیقی
رابطہ آفس: 513 یونی شاپنگ سینٹر عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی

تھی۔ ابوالقاسم، گوالیار کا حاکم تھا۔ بیرم خان بھاگ کر آیا تو اس سے ملاقات ہوئی دونوں نے گجرات کا راستہ لیا۔ راہ میں شیر شاہ کے ایک سردار نے دونوں کو دیکھا اور ابوالقاسم کو بیرم خان سمجھ کر گرفتار کرنے لگا۔ بیرم خان نے کہا کہ وہ بیرم خان نہیں میں ہوں۔ جب سپاہی اس کو گرفتار کرنے لگے تو ابوالقاسم نے کہا کہ یہ میرا غلام ہے اور میری جان بچانے کے لیے خود کو بیرم خان بتلا رہا ہے۔ ابوالقاسم بہت وجیہہ شخص تھا، چنانچہ اسی کو ان لوگوں نے گرفتار کر لیا اور شیر شاہ کے پاس لے گیا۔ شیر شاہ کے حکم سے ابوالقاسم کو قتل کر دیا گیا۔ خلوص اور جاں نثاری کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

❁ ❁ ❁

ماہنامہ نوائے انسان

مدیر: شیراز راج

2- گارڈن بلاک گارڈن ٹاؤن لاہور

زیراہتمام: ڈیموکریٹک کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ

فون: 5869042-5864926

علمی و ادبی کتابی سلسلہ

تحریر

ترتیب: رفیق احمد نقش

پیشکش: ڈاکٹر محمد یوسف میمن

زیراہتمام: 116-115 جمناداس کالونی میرپور خاص

رابطہ کے لیے: A-87 بلاک این شمالی ناظم آباد کراچی